خالد بن ولیدؓ

المماس ایم اے

عرضِ مصنّف

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے رسولِ مقبول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسلام کے عظیم الشان سپاہی اور سپہ سالار جناب خالد بن ولیدؓ کو خود اپنی زبانِ مبارک سے "سیف اللہ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے باوجود بعض مصنّفین اپنی کتابوں اور مضامین میں جنابِ خالدؓ کی کردارکشی کرتے نظر آتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں کو نیک توفیق عطا فرمائے۔

خالدؓ بن ولید اسلام کے وہ واحد سپہ سالار اور دنیا کے واحد جرنیل ہیں جنہوں نے کسی بھی جنگ میں شکست کا منہ نہیں دیکھا اور اس کا اعتراف دوست و دشمن سبھی کرتے ہیں۔ آپ بھی ان کے حالات پڑھیے اور انصاف کیجیے۔ مجھے بھی مطلع فرمائیے۔

احقر:

الماس ایم۔ اے

۲۶۱۔ خیبر بلاک

اقبال ٹاؤن۔ لاہور



...ی مکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی سازشیں ہو رہی تھیں (خاکم بدہن) اور...
...بنِ مکہ اس میں پیش پیش تھے۔
صفوان بن امیہ مکہ کا ایک بڑا رئیس تھا۔ ابھی غزوۂ بدر کو چند ہی دن گزرے تھے کہ اس نے...
...وہب کو اپنے پاس بلوایا۔
...فوان کو معلوم تھا کہ عمیر کا جوان سال بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں مدینہ میں قید تھا۔ خود صفوان کا باپ...
امیہ بھی اس معرکۂ حق و باطل میں مارا گیا تھا۔ اس طرح صفوان اور عمیر دونوں کے دل ایک ہی غم سے...
...داغدار تھے۔

صفوان نے رازدارانہ انداز میں کہا:
"اے ابنِ وہب! میں جانتا ہوں کہ بیٹے کے غم نے تمہیں نڈھال کر رکھا ہے"۔
عمیر تڑپ اٹھا۔
اس نے اشکبار نظروں سے صفوان کو دیکھا۔
"اے ابنِ امیہ!" وہ زخمی لہجے میں بولا:
"اس زخم کو نہ چھیڑو۔ کاش میرا بیٹا میدانِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے ب...
لڑتا ہوا مارا جاتا"۔
صفوان نے بھی ایک ٹھنڈی سانس لی:

"ایسا نہ کہو ابن وہب!"

اس نے اسے تسلی دی:

"تمہارا بیٹا صرف اسیر ہے۔ کل کو چھوٹ کے بھی آسکتا ہے۔ تمہیں اس کی واپسی کی امید تو ہے مگر میرے بیٹے کو دیکھو۔ میں تو باپ کی موت کے داغ کو سینے میں دبائے بیٹھا ہوں۔"

"تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو ابنِ امیہ!"

عمیر گھٹی گھٹی آواز میں بولا:

"تمہیں باپ کا غم ہے تو مجھے بیٹے کی جدائی کا صدمہ۔ ہم دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں۔"

چند لمحے دونوں طرف خاموشی رہی۔

پھر صفوان بن امیہ بولا:

"تم نے کچھ سوچا ابنِ وہب؟"

"کس بارے میں؟"

ابن وہب نے چونک کر کہا:

"میری تو سوچیں ہی گم ہو گئی ہیں۔"

صفوان نے ادھر ادھر دیکھا پھر آواز دبا کر بولا:

"تم نے یہ بھی سوچا کہ ہمارے اور تمہارے غموں کا اصل ذمہ دار کون ہے؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔"

عمیر کے سینے سے جیسے ایک آہ نکلی:

"یہ فتنہ اور جنگِ بدر سب کچھ اس محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کیا دھرا ہے جو خود کو آسمانی نبی کہتا ہے اور ہمارے لات و منات کو بے جان اور مردہ کہتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ وہی فتنہ گر۔"

صفوان نے بات آگے بڑھائی:

"میں کہتا ہوں اگر اس زمین سے سر نکالتے ہوئے پودے کو اس وقت اکھاڑ کے نہ پھینکا گیا تو کل کو یہ ایک تناور درخت بن کے پورے عرب کو اپنی منحوس سائے سے ڈھانپ دے گا۔"

"مگر اس پر ہمارا زور کیسے چل سکتا ہے۔" عمیر نے بے بسی سے کہا:

"یہ کام تو ابوسفیان کا ہے۔ اس نے قریش مکہ کا سردارِ اعلیٰ ہوتے ہی اعلان کیا تھا کہ وہ سب سے

پہلے مقتولینِ بدر کا انتقام لے گا۔"

صفوان بن امیہ نے زہرخند کیا:

"ابوسفیان کیا انتقام لے گا۔ بدر کے میدان میں جب تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کو ہمارے سات سو اونٹ سوار اور ایک سو گھڑ سوار شکست نہ دے سکے تو اب کیا تیر مار لیں گے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں اے رئیس ابنِ رئیس!"

عمیر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا:

"اب مدینہ والوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ ہم نے انہیں چیونٹیوں سے زیادہ حقیر سمجھا تھا مگر انہوں نے الٹی ہو کر ہمیں میدان سے مار بھگایا۔"

"اے ابنِ وہب!"

صفوان نے بڑی متانت سے کہا:

"تم نے مجھے رئیس ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ میں تمہیں ا[illegible]لت دیتا ہوں مگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مدینہ پہنچ کے میرے باپ کے قاتل محمد (صلی اللہ [illegible] قتل کر کے میرا جلتا ہوا کلیجہ ٹھنڈا کر دو گے۔"

ابن وہب نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

"اے ابنِ امیہ!"

اس نے سلیقے سے جواب دیا:

"کوئی دولت مند اپنی دولت کو اپنے سے جدا نہیں کرتا مگر تم اپنی دولت مجھے دے رہے ہو۔ یقین نہیں آتا!"

"اے عمیر! اگر تم میرے اندر لگی ہوئی آگ کو دیکھ سکتے تو تمہیں یقین آ جاتا۔"

صفوان ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہا تھا:

"مجھے باپ کا غم کھائے جا رہا ہے اور انتقام کی آگ مجھے پھونکے ڈال رہی ہے۔ مجھے عزت، شہرت، دولت سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں دولت دے کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنا چاہتا ہوں۔"

عمیر اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔

پھر وہ بڑے جوش سے بولا:

"اے صفوان! تمہیں مژدہ ہو کہ تمہارے باپ امیہ کے قتل کا بدلہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے میں لوں گا

مگر تمہاری دولت کے صلہ میں نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی گرفتاری کے بدلہ میں۔

میرے سینے میں بھی وہی آگ بھڑک رہی ہے جس سے تمہارا سینہ جل رہا ہے۔ تم صرف اتنا کرنا کہ اگر میں اپنی اس کوشش میں مارا جاؤں تو میرے اہل وعیال کی پرورش کا انتظام کر دینا۔"

ابن ہشام کا بیان ہے کہ صفوان بن امیہ نے عمیر بن وہب سے وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف اس کے اہل وعیال کی پرورش کا ذمہ دار ہے بلکہ اس کا تمام قرض بھی اتار دے گا۔

عمیر اور صفوان نے اس منصوبہ میں بہت زیادہ رازداری برتی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔
عمیر نے اسی دن تمام انتظام کیا۔

صفوان بن امیہ کے مکان پر ہی ایک تلوار زہر میں بجھائی گئی اور یہ تلوار نیام میں ڈال کر اسی شب عمیر اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ منورہ روانہ ہو گیا۔



رات دن سفر کرتا ہوا عمیر بن وہب مدینہ میں داخل ہوا اور سیدھا مسجدِ نبویؐ کے دروازے پر پہنچ کے اپنا اونٹ روکا۔

اب یہ اس کی بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ جس وقت وہ اونٹ سے اتر رہا تھا اس لمحے حضرت عمرؓ مسجدِ نبویؐ سے باہر آ رہے تھے۔

جنابِ عمرؓ کی نظر عمیر پر پڑی تو وہ پہلے ٹھٹکے پھر فوراً آگے بڑھے اور عمیر کو گریبان سے پکڑ لیا۔ عمیر بری طرح گھبرا گیا۔

اب جنابِ عمرؓ کے ایک ہاتھ میں عمیر کا گریبان تھا اور دوسرے ہاتھ سے انہوں نے عمیر کی کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار کو معہ نیام کے کھینچ لیا۔

اسی حالت میں عمیر کو لیے ہوئے وہ مسجدِ نبویؐ میں واپس پہنچے۔

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ مسجدِ نبویؐ میں تشریف فرما تھے۔ جنابِ عمرؓ عمیر بن وہب کو گھسیٹتے ہوئے کچھ اس انداز سے مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوئے کہ حاضرین کو انہیں دیکھ کر تعجب کے ساتھ ہنسی بھی آ گئی۔

حضورؐ کے سامنے پہنچ کے جنابِ عمرؓ نے ادب سے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر صدقے۔ یہ عمیر بن وہب ہے۔ جنگِ بدر میں یہ ہمارے خلاف لڑا تھا اور مشرکینِ مکہ میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نظر اٹھا کے عمیر بن وہب کو ایک بار دیکھا مگر کوئی کلام نہ فرمایا۔ خاموش رہے۔

جنابِ عمرؓ نے اپنی بات جاری رکھی:
"اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اس کی نیت پر شک ہے۔ اس کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔"
حضورؐ نے اس سے دریافت فرمایا:
"اے عمیر! تم مدینہ کیوں آئے ہو؟"
"اے محمدؐ ابن عبداللہ!"
عمیر نے جواب میں کہا:
"میرا بیٹا مدینہ میں اسیر ہے۔ میں اسے آزاد کرانے آیا ہوں۔"
جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:
"بیٹا آزاد کرانے آئے ہو تو یہ تلوار کیسی ہے۔ کیا اس تلوار سے بیٹے کو آزادی دلاؤ گے؟"
عمیر نے فوراً کہا:
"اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! میدانِ بدر میں تلوار نے ہمارا پہلے کونسا کام کیا ہے جو یہ اب کرے گی!"

عمیر کا جواب سن کر جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند فرمالیں۔

اس وقت صحابہ کرامؓ نے دیکھا کہ حضور پاکؐ کا چہرۂ مبارک ہلکا سا متغیر ہوا اور پھر جو آپ بولے ہیں تو لوگ حیران رہ گئے۔
"اے عمیر!"
آپ نے آنکھیں کھول کے گرجدار آواز میں ارشاد فرمایا:
"کیا صفوان نے تیرے قرض اور تیرے اہل وعیال کے خرچ کا ذمہ اٹھا کر تجھے میرے قتل کے لیے نہیں بھیجا؟"

عمیر بن وہب، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔

اس نے کئی بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آپؐ کی طرف دیکھا۔

پھر ایک آہ بھر کر انتہائی مضمحل آواز میں بولا:

"اے محمدؐ ابن عبداللہ! مجھے یقین ہو گیا اور میرا دل مان گیا کہ آپؐ ضرور اللہ کے سچے رسولؐ اور نبی ہیں۔

میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس منصوبے کی سوائے صفوان بن امیہ اور میرے، کسی کو رتی برابر بھی خبر نہ تھی اور میں مکہ سے اسی رات روانہ ہو گیا تھا جس رات ہم نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے عمیر بن وہب، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"اے اللہ کے سچے رسولؐ!"

اس نے سادگی سے کہا:

"مجھے اپنے دین پر لے آیئے اور مجھے معاف کر دیجیے۔"

صحابہ کرامؓ نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متغیر چہرہ پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا ہے اور اب آپؐ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم

آپؐ نے فرمایا:

"اے عمیر! تم ایک اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تمہاری خطا ہی نہیں بلکہ تمہارے پچھلے تمام گناہ بھی معاف ہو گئے ہیں۔ تمہارا بیٹا آزاد ہے، تم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

"اب میں ان قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا میرے رسولؐ!"

عمیر پر رقت طاری ہو گئی:

"میں مدینہ ہی میں رہوں گا اور تمام عمر دین کی خدمت میں گزار دوں گا۔"

عمیر نے کلمہ حق پڑھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ اطہر پر اسلام لے آیا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک صحابیؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا:

"میرے ماں باپ آپؐ پر قربان میرے رسولؐ! کیا اُس دن آپؐ کو عمیر بن وہب کے منصوبہ کی خبر جبرئیلؑ نے دی تھی؟"

آپؐ نے جواب میں فرمایا:

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ کچھ الفاظ میرے کانوں میں گونجے اور وہی الفاظ میرے ہونٹوں پر آ گئے!"

میں نے کسی عالم کی زبان سے سنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن فرمایا:

"میں کوئی کلام نہیں کرتا جب تک کہ وحی نہ ہو اور قدم نہیں اٹھاتا جب تک کہ حکمِ خداوندی نہ ہو۔"

چنانچہ میں نے اس بات کا یہی مطلب نکالا ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار اور گفتار دونوں ہی حکمِ خداوندی کے تابع ہیں اور شاید اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو قرآن کی تفسیر کہا جاتا ہے اور ایک درویش صفت انسان نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

"احد اور احمد میں صرف میم کا پردہ ہے اور یہ پردہ کبھی کبھی اٹھ بھی جاتا ہے۔"



اُدھر مکہ میں صفوان بن امیہ جب ترنگ میں آتا تو گلا پھاڑ کے کہتا:

"اے اہلِ قریش! اے لات و منات اور عزیٰ کے ماننے والو! تم بہت جلد میری زبان سے ایک ایسی خوشخبری سنو گے کہ تم جنگِ بدر کا غم بھول جاؤ گے۔

پھر کوئی بدر کا میدان گرم نہ ہو گا۔

اور اگر کوئی میدان بنا تو وہ مدینہ کے گلی کوچے ہوں گے جن پر ہم برق و باراں کی طرح نازل ہو کر پوری آبادی کو تہس نہس کر دیں گے۔"

قریشِ مکہ کو بدر کا غم اس لیے زیادہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود میدانِ بدر میں بری طرح ہزیمت اٹھائی تھی۔

غزوۂ بدر ——

تاریخِ اسلام کا ایک عظیم الشان باب ہے۔ خدانخواستہ اگر مسلمان بدر میں شکست کھا جاتے تو اسلام کا یہ پودا بار آور ہونے سے پہلے ہی شاید مرجھا کے رہ جاتا۔ مگر —— مٹھی بھر مسلمانوں نے اپنے سپہ سالارِ اعظم محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں ایسی بہادری اور شاندار شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ مشرکینِ مکہ میدان میں اپنے ساتھیوں کی ستر (۷۰) لاشیں چھوڑ کے بھاگ نکلے اور ستر (۷۰) زخمی بھی ساتھ لیتے گئے۔

صفوان بن امیہ کو پوری امید تھی کہ عمیر بن وہب اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گا اور وہ ایک دن اہلِ مکہ کو

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی نوید دے کر ان کے سامنے سرخرو ہو گا۔

مگر ـــــ

ہُوا یہ کہ کچھ ہی دن بعد مکہ واپس آکر عمیرؓ بن وہب نے دستِ رسولؐ پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور مکہ میں تبلیغِ اسلام کا کام شروع کر دیا۔

اس صورتِ حال سے صفوان بن امیہّ اور اہلِ مکہ اور زیادہ مایوس ہو گئے اور ان کے جوشِ انتقام میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

بدر کے میدان میں شکست کھانے کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کے معاشی مفاوات پر بھی شدید زد پڑی تھی شام جانے والے تمام تجارتی قافلے مدینہ کے قریب سے گزر کر ساحلی راستہ اختیار کرتے تھے مگر اب یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ساحلی علاقوں کے بعض قبائل نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے ان کا یہ راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

ادھر سے مایوس ہو کے مشرکینِ مکہ نے اپنے تجارتی قافلوں کے لیے عراق کی راہ اختیار کر لی تھی مگر غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد جب صفوان بن امیہّ کی سالاری میں مشرکینِ مکہ کا ایک قافلہ عراق کے راستے شام جا رہا تھا تو اسے زیدؓ بن حارثہ نے چھاپہ مار کر لوٹ لیا۔

اس طرح مکہ والوں کے تمام تجارتی راستے بند ہو کر رہ گئے!

چنانچہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے مشرکینِ مکہ کے تمام بڑے بڑے سردار سر جوڑ کر بیٹھے۔ یہ پہلے اشارۃً بیان کیا جا چکا ہے کہ بدر میں ابوجہل اور عتبہ کی موت نے مکہ کی قریشِ عامہ کی ریاست کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھ دیا تھا جس سے دولتِ اُموی کا آغاز ہوا تھا۔

قریش دنیائے عرب کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا۔ اس کی دو شاخیں تھیں:

۱۔ بنو ہاشم

۲۔ بنو اُمیہّ

پس قریش مکہ اور مدینہ دونوں جگہ آباد تھے۔ مکہ کے قریش "قریشِ اُموی" اور مدینہ کے قریش "قریشی ہاشمی" کہلاتے تھے۔

پس قریشِ مکہ یا مشرکینِ مکہ ایک طرف تو بدر کے میدان میں اپنے بڑے بڑے سرداروں کے مارے جانے سے مسلمانوں سے خار کھائے بیٹھے تھے۔

دوسری طرف ان کے تجارتی قافلوں کا مدینہ کے قریب سے گزر کر شام جانا بند ہو گیا اور انہیں ایک طویل چکر

کاٹ کر براستہ عراق شام جانا پڑتا تھا۔

اب عراق کے راستے میں بھی خطرات پیدا ہو گئے تھے اور اپنے معاشی مفادات مجروح ہونے سے وہ بے حد گھبراتے تھے۔

اب مکہ والوں کے پاس دو ہی راستے تھے:

ایک تو صلح و آشتی کا راستہ تھا کہ وہ مدینہ کی اسلامی ریاست کو تسلیم کر لیں۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ مدینہ والوں کے ساتھ ایک بار پھر خون کی ہولی کھیلیں۔

یہ دوسری صورت زیادہ خطرناک تھی۔ اس لیے کہ ایک بار وہ اسلام کے جیالوں کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ اور ان کا سب سے بڑا سردار ابوجہل، دو کمسن جوانوں (معاذؓ اور معوذؓ) کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اب دوبارہ ان کو چھیڑنا کوئی عقلمندی نہ تھی مگر مثل مشہور ہے کہ:

گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے!

ـــــ اسی مثل کے مصداق انہوں نے ایک اور جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

مشرکینِ مکہ کے نئے سردار ابوسفیان بن حرب نے یہ فیصلہ شاید اس لیے کیا تھا کہ بدر کے میدان میں مارے جانے والوں کے گھر ماتم کدے بنے ہوئے تھے اور مقتولین کے عزیز و اقارب کے ساتھ ساتھ مکہ کا بچہ بچہ مدینہ والوں کا انتقام لینے کو بے تاب تھا۔

ابوسفیان نے خود بھی انتقام کی قسم کھائی تھی بلکہ اس نے اس بات کا عہد بھی کیا تھا کہ جب تک وہ مقتولین کا انتقام نہ لے گا اس وقت تک نہ تو نہائے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا۔

ابوسفیان نے جنگ کرنے کا فیصلہ اور عہد تو کر لیا مگر اس پر یہ خوف بھی غالب تھا کہ کہیں اس مرتبہ بھی بدر والا حال نہ ہو اس لیے وہ بے حد محتاط تھا اور پورے انتظامات کے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

چنانچہ اس سلسلے میں اس نے مدینہ کے یہودیوں سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ کام خطرناک تھا اور اس کے لیے کسی انتہائی دیانت دار آدمی کی ضرورت تھی۔

پس اس نے طے کیا کہ یہودیوں سے کسی اور کے ذریعے پیام و سلام کے بجائے وہ خود مدینہ پہنچ کے ان سے براہِ راست گفتگو کرے اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرے۔

ابوسفیان نے فوراً ہی اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ اس نے دو سو سواروں کو ساتھ لیا اور خفیہ طور پر مدینہ جا پہنچا۔

اپنے ساتھیوں کو تو اس نے مدینہ کے باہر چھوڑا اور خود رات کی تاریکی میں یہودیوں کے محلے میں جا پہنچا۔ اسے بنی نضیر کے سردار سلام بن مشکم یہودی کے گھر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ ایک یہودی دکاندار اسے سلام بن مشکم کے گھر چھوڑ آیا۔

سلام بن مشکم اس کا پرانا یار اور ہم نوالہ وہم پیالہ تھا۔ اس نے اپنے قدیمی دوست ابوسفیان کی بادہ نوشی کی شاندار دعوت کی۔

دونوں بڑی دیر تک مے نوشی کرتے رہے اور مختلف موضوعات خصوصاً مدینہ میں اسلام پھیلنے پر گفتگو کرتے رہے۔

سلام بن مشکم نے ابوسفیان کو مدینہ کے بہت سے مخفی رازوں سے آگاہ کیا مگر ساتھ ہی اُسے یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا کہ:

"خبردار۔ اس وقت مسلمانوں پر حملہ کا تصور بھی نہ کرنا ورنہ بدر سے زیادہ خوفناک شکست سے دوچار ہوگے۔"

سلام کے اس انتباہ سے ابوسفیان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ تو مکہ سے یہ آس لے کر چلا تھا کہ وہ نہ صرف یہودیوں کی ہمدردیاں حاصل کرے گا بلکہ انہیں اس بات پر بھی راضی کرلے گا کہ مسلمانوں سے آیندہ جنگ میں وہ قریشِ مکہ کا کھل کر ساتھ دیں۔

مگر یہاں تو بات ہی الٹی ہوگئی۔

سلام بن مشکم نے شراب و کباب سے اس کی مدارات تو ضرور کی لیکن ساتھ ہی اُسے یہ تاکید بھی کر دی کہ مدینہ پر حملہ کا خیال بھی نہ کرے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ سے کہیں زیادہ یہودیوں کو مسلمانوں کی صحیح طاقت کا اندازہ تھا۔

ابوسفیان رات کے آخری حصہ میں سلام بن مشکم کی بادہ و ساغر کی محفل سے رخصت ہو کر باہر آیا تو مایوس اور کھسیانا ہوا تھا۔ اس کے تمام منصوبوں، ارادوں پر پانی پھر گیا تھا۔

ممکن ہے ابوسفیان اپنے یہودی دوست کے پاس اس وجہ سے آیا ہو کہ اس کے مشورہ سے وہ اپنے دوسو سواروں کے ساتھ مدینہ کے کسی حصہ پر شب خون مار کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے مگر۔

یہودی سردار نے اسے سوکھا سا جواب دے کے رخصت کر دیا تھا۔

ابوسفیان ابتدائے شب میں مدینہ میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت مدینہ کے کوچہ و بازار میں خاصی چل پہل تھی اس لیے اسے سلام کے گھر تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی مگر اس کی مدینہ سے واپسی کے وقت، رات کا آخری پہر تھا اور مدینۃ النبیؐ میں جگہ جگہ مسلح پہرہ لگا تھا۔

ابوسفیان کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑ رہے تھے۔ بہرحال وہ پہرےداروں سے بچتا بچاتا اپنے ساتھیوں تک پہنچ گیا۔

اس کے ساتھی سوار بہت پریشان ہو رہے تھے۔ ابوسفیان کو دیکھ کے انہیں اطمینان ہوا۔ ابھی کچھ رات باقی تھی۔

ابوسفیان اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے سواروں کے ساتھ فوراً وہاں سے واپس مکہ کی طرف چل پڑا۔

اسے اپنی مہم کی ناکامی کا اور اس بیکار سفر پر بہت افسوس تھا مگر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اس نے مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر عریض نامی ایک چھوٹے سے قصبے پر، جس میں مشکل سے بیس تیس مکان ہوں گے، حملہ کر دیا۔

گاؤں میں آدمی ہی کتنے تھے جو جم کے مقابلہ کرتے۔ سعد بن عمرو ایک انصاری اس گاؤں کا مکھیا تھا۔ گاؤں پر حملہ ہوتے ہی پورا گاؤں جاگ اٹھا تھا اس لیے کہ مشرکینِ مکہ نے گاؤں کے باہر گھاس کے انبار میں آگ لگا دی تھی جس سے ہر طرف روشنی پھیل گئی تھی۔

سعد بن عمرو انصاری اپنے چند آدمیوں کے ساتھ تلواریں سونت کر حملہ آوروں کے مقابلہ پر آیا مگر وہ اور اس کے ساتھی پیدل تھے اور حملہ آور گھوڑوں پر سوار تھے۔ ادھر پندرہ کے قریب دیہاتی تھے جو گہری نیند سے گھبرا کے اٹھے تھے اور اُدھر دوسو سوار، ہر طرح اور ہر ہتھیار سے مسلح۔

مقابلہ کیا ہوتا تھا؟ حملہ آوروں کے ایک گروہ نے پندرہ کی اس ٹکڑی کا رخ کیا اور انہیں مارتے کاٹتے نکل گئے۔

گاؤں کا غریب مکھیا سعد بن عمرو اس میں شہید ہوگیا۔ گھاس کے تمام ڈھیر جل گئے۔ کچھ مکانوں میں بھی آگ لگ گئی۔

ظالموں نے کھجوروں کے پھلدار درختوں میں بھی آگ دکھا دی۔ درختوں کے نیچے جو گھاس پھونس اکٹھا تھا اس نے آگ پکڑ لی اور پھلدار درخت بھی خاکستر ہوگئے۔

ابوسفیان اجالا پھیلنے کے ڈر سے اپنے ساتھیوں کو تیز گھوڑے بھگانے کا حکم دے رہا تھا۔ وہ

صبح ہونے سے پہلے پہلے مدینہ سے اتنی دور پہنچ جانا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے اس کے تعاقب کا خطرہ نہ رہے۔

اس نے مدینہ میں ناکام ہونے کے بعد اس چھوٹے سے گاؤں پر شب خون مار کے اپنے دل کو تسلی دے لی تھی۔

ابوسفیان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس نے گاؤں پر حملہ کر کے اپنی وہ قسم پوری کر دی ہے جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ:

"میں پہلا کام یہ کروں گا کہ مقتولینِ بدر کا انتقام لوں گا۔"

گویا سعد بن عمرو انصاری کو شہید کر کے اس نے بدر کے ستر مقتولین کا بدلہ لے لیا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے اس شب خون کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچ گئی۔ آپؐ اسی وقت سوار ہوئے اور کچھ سواروں کے ساتھ مشرکینِ مکّہ کے تعاقب میں چل پڑے۔ مگر ابوسفیان پر حد درجہ دہشت طاری تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو تیز سے تیز تر بھگا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر مدینہ والے اس تک پہنچ گئے تو اس کا جان بچانا ناممکن ہو جائے گا۔

ابوسفیان نے گھوڑا بھگاتے بھگاتے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا:

"اپنے ساتھ لائے ہوئے رسد کے سامان کی تھیلیاں پھینک دو تاکہ گھوڑوں پر وزن کم ہو جائے اور وہ تیز تر دوڑ سکیں۔"

چنانچہ سواروں نے رسد کی تھیلیاں پھینک دیں۔ ان تھیلیوں میں ستّو بھرے ہوئے تھے۔ ستّو کو عربی میں سویق کہتے ہیں۔ اس لیے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہوا۔

غزوۂ سویق کا دوسرا نام غزوۂ قرقرۃ الکدر بھی ہے کیونکہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابوسفیان کا تعاقب قرقرۃ الکدر کے مقام تک کیا تھا مگر ابوسفیان، آپؐ کے ہاتھ نہ آیا اور جان بچا کے نکل گیا۔

غزوۂ سویق اور آنحضرتؐ پر قاتلانہ حملے کی سازش نے مدینہ والوں کو مشرکینِ مکہ کے ارادوں سے پوری طرح باخبر کر دیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ مستقبل قریب میں مکہ والوں سے کوئی نہ کوئی معرکہ

ضرور ہو گا۔

مشرکینِ مکّہ پہلے ہی خود کو جنگ کے لیے تیار کر چکے تھے۔ وہ جوشِ انتقام سے بوکھلائے ہوئے پھر رہے تھے مگر ان کا کوئی زور نہ چلتا تھا۔

ابوسفیان ان کا سردار تھا۔ جوانانِ مکہ اگرچہ جنگ کے لیے بہت بے چین تھے مگر ابوسفیان انہیں روکے ہوئے تھا اور یہودی قبیلہ بنی نضیر کے سردار سلام بن مشکم کی ہدایت اور مشورہ کے تحت اپنے لشکر کو مضبوط تر بنا رہا تھا۔

جنگی تیاریوں کے سلسلے میں ابوسفیان نے دو اہم اقدام کیے:

پہلا قدم تو اس نے یہ اٹھایا کہ جنگِ بدر سے پہلے ابوسفیان کی قیادت میں جو قافلہ شام سے واپس آیا تھا اسے ۵۰ ہزار دینار کا منافع ہوا تھا۔ یہ مشترکہ منافع جنگِ بدر کی وجہ سے تقسیم نہ ہو سکا تھا اور اب تک محفوظ رکھا تھا۔

پس ابوسفیان نے یہ تحریک کی اس منافع کو تقسیم کرنے کے بجائے پوری کی پوری رقم کو جنگی تیاریوں پر صرف کر دیا جائے۔

ابوسفیان کی اس تحریک کو مکہ کے تاجروں نے عام طور پر پسند کیا۔ خصوصاً ابوجہل کا بیٹا عکرمہ ان میں پیش پیش تھا۔

یہ بات طے ہوتے ہی ۵۰ ہزار دینار فی الفور ابوسفیان کے حوالے کر دیے گئے کہ وہ جس طرح چاہے انہیں جنگی مصارف میں لے آئے۔

دوسرا کام ابوسفیان نے یہ کیا کہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور قبائل عرب میں مسلمانوں کے خلاف جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے دو شعراء کی خدمات حاصل کیں جو عرب کے مشہور ترین شاعروں میں سے تھے۔

ان میں سے ایک عمرو جمحی اور دوسرا شاعر مسافع تھا۔

ان دونوں شاعروں نے عرب کے مختلف قبائل میں جا کے انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا اور جوش پیدا کرنا شروع کر دیا۔

اسی دوران کعب بن اشرف نامی یہودی شاعر مدینہ سے چل کے مکّہ آیا اور اس نے اپنے پُرجوش کلام سے مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں سے انتقام لینے کی غیرت دلائی۔

مشرکین کی اس پروپیگنڈہ مہم میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتینِ مکہ نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ ان

خواتین میں :

ہندہ زوجہ ابوسفیان

ام حکیم زوجہ عکرمہ بن ابوجہل

فاطمہ بنت ولید

ریطہ زوجہ عمرو بن العاص

اور خناس والدہ مصعب بن زبیر

سب سے آگے آگے تھیں۔

ان خواتین نے طعن و تشنیع کے تیر چلا کے مشرکینِ مکہ کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف زہر بھر دیا اور ان کے جوشِ انتقام میں اضافے کا باعث ہوئیں۔

ان کوششوں کے علاوہ قریش (مشرکین) مکہ کے چند سرکردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد عرب قبائل کے پاس بھیجا گیا تاکہ انہیں نہ صرف مسلمانوں کے خلاف ابھارا جائے بلکہ مدینہ پر حملہ میں شرکت کی بھی دعوت دی جائے۔

اس وفد میں درج ذیل خاص افراد شامل تھے :

عمرو بن العاص

مسافع بن عبد مناف

ہبیرہ بن ابی وہب۔

دراصل جنگِ بدر سے پہلے تک تمام قبائلِ عرب، قریشِ مکہ کو مذہبی اور سیاسی لحاظ سے اپنا سردار تصور کرتے تھے مگر بدر کی شکست نے مکہ والوں کو دوسرے قبائل کی نظروں میں حقیر کر دیا تھا اس لیے اب یہ بات ان کے وقار کا سوال بن گئی تھی اور وہ اپنا وقار اور اپنی برتری کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے بدر کا انتقام لینا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔

اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آخر ۳ھ ہجری مطابق مارچ ۶۲۵ء کو ابوسفیان بڑی تیاریوں اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ تین ہزار کا عظیم الشان لشکر لے کر مکہ سے نکلا۔

اس لشکر میں ۲۰۰ گھڑ سوار، تین ہزار اونٹوں پر پیدل فوج اور سامانِ رسد اور سات سو زرہ پوش لشکری شامل تھے۔

اس لشکر میں پندرہ اونٹوں پر عماریوں میں مکہ کے معزز گھرانوں کی خواتین کا ایک دستہ بھی تھا۔ یہ

خواتین اس لیے ساتھ جا رہی تھیں کہ میدانِ جنگ میں وہ رجزیہ اشعار پڑھ پڑھ کے مردوں میں غیرت پیدا کریں اور ان کے قدم جمائے رکھیں۔

ان خواتین میں خاص خاص مندرجہ ذیل تھیں :

ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان

ام حکیم زوجہ عکرمہ بن ابوجہل

فاطمہ بنت ولید یعنی خالد بن ولید کی ہمشیرہ

برزہ دختر مسعود ثقفی رئیس طائف

ریطہ زوجہ عمرو بن العاص

خناس والدہ مصعب بن عمیر

مکہ میں ایک رئیس جبیر بن مطعم کے پاس ایک حبشی نژاد غلام تھا۔ اس کا نام وحشی تھا۔ وحشی اپنی نیزہ بازی کے لیے پورے عرب میں مشہور تھا

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ ہندہ، اس لشکر کے سردار ابوسفیان کی بیوی تھی اور اس کا باپ عتبہ معرکۂ بدر میں حضرت امیر حمزہؓ کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

ہندہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ حضرت امیر حمزہؓ سے لینے کے لیے بہت بے چین تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہندہ نے جبیر بن مطعم سے کہا :

"تم اپنے نیزہ باز غلام وحشی کی خدمات میرے سپرد کر دو تاکہ میں وحشی کو متوقع جنگ میں حضرت حمزہؓ کو نیزہ مار کر ہلاک کرنے پر مامور کروں"۔

جس طرح ہندہ کا باپ عتبہ، حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں میدانِ بدر میں مارا گیا تھا اسی طرح مکی رئیس جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں غزوۂ بدر میں قتل ہوا تھا۔ پس جبیر نے بلا عذر و تکلف اپنے غلام وحشی کو ہندہ کے سپرد کر دیا۔

ہندہ نے وحشی سے گفتگو کی اور وعدہ کیا کہ :

"اگر تم جنگ کے دوران حمزہؓ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا) کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں آزاد کر دیا جائے گا"۔

وحشی آزادی کے نام پر یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا اور ابوسفیان کے لشکر میں شامل ہو کر ان کے ساتھ چل پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے چچا حضرت عباسؓ اگرچہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے مگر ابھی تک مکہ معظمہ ہی میں مقیم تھے۔

جب لشکرِ مشرکین کعبہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوا تو جنابِ عباسؓ نے ایک تیز رفتار قاصد مدینہ بھیج کے آپؐ کو مشرکینِ مکہ کے ارادوں اور تیاریوں سے آگاہ کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اطلاع پاکر ۵ شوال سنہ ۳ ہجری کو اپنے دو خبر رسانوں کو جن کے نام انسؓ اور مونسؓ تھے، دریافتِ حال کے لیے بھیجا۔

ان مخبروں نے واپس آکر حضورؐ کو اطلاع دی:

"اے رسولِ خدا! قریشِ مکہ کا لشکر مدینہ کے قریب عریض تک پہنچ چکا ہے"۔

عریض مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جس پر ابوسفیان نے دوسو سواروں کے ساتھ مدینہ سے واپس جاتے ہوئے شب خون مارا تھا۔ اس شب خون میں گھاس کے ڈھیر، مکانات، پھلدار درخت جل گئے اور سعدؓ بن عمرو نامی ایک انصاری نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔

دوسری صبح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہؓ کرام کو جمع کر کے مشرکینِ مکہ کے لشکر کی عریض تک پہنچنے کی خبر سے مطلع فرمایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔

ایک تجربہ کار مہاجر نے رائے دی:

"اے اللہ کے رسولؐ! میرا خیال ہے کہ خواتین کو شہر سے باہر قلعوں میں بھیج دیا جائے اور دشمن کا مقابلہ شہر میں محصور ہو کر کیا جائے"۔

بعض اور تجربہ کار صحابہؓ نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ ان تائید کرنے والوں میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول بھی تھا۔

لیکن — وہ نوخیز صحابیؓ جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، ان میں سے کسی نے اس رائے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ ہم بہادروں کی طرح شہر سے نکل کر دشمن کے حملے کا جواب دیں گے۔ ہمیں ایسی کوئی مجبوری لاحق نہیں کہ ہم شہر کے اندر محصور رہ کر مشرکین سے دفاعی جنگ کریں"۔

ان نوعمر صحابیؓ کے ساتھ ان کے تمام یار دوست ہو گئے اور سب نے فرداً فرداً حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلے میدان میں جنگ کی درخواست کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی جواب دیے بغیر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو آپؐ کے جسمِ اطہر پہ زرہ موجود تھی۔

اس وقت بعض لوگوں کو ندامت ہوئی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی کے خلاف کیوں مشورہ دیا۔

انہوں نے یک زبان ہو کر کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ۔ آپؐ چاہیں تو ہم شہر کے اندر رہ کر جنگ کرنے پر تیار ہیں"!

حضورؐ نے فرمایا:

"پیغمبر کو زیب نہیں دیتا کہ ہتھیار پہن کر بغیر قتال کے اتارے"۔





مشرکینِ مکّہ بروز بدھ مطابق ۴۔ شوال سنہ ۳ ہجری مدینہ پہنچ کے کوہِ اُحد کے دامن میں خیمہ زن ہو گئے۔

اس کے دو دن بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصر کے وقت اپنے ایک ہزار صحابہ کرامؓ کے ہمراہ مدینہ منورہ سے نکلے اور کوہِ اُحد کی طرف روانہ ہوئے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول تین سو سواروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب تھا مگر ہر سو دو سو قدم چلنے کے بعد گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیتا۔ لوگ اسے حیرانی سے دیکھتے مگر جب وہ سوال کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھتے تو وہ اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیتا۔

اس طرح عبداللہ بن ابی گھوڑا روکتا اور بڑھاتا ہوا لشکرِ رسولؐ کے ساتھ مقامِ شیخین تک پہنچا اور گھوڑے کی راسیں کھینچ کے رک گیا۔

اسلام کا ایک شیدائی گھوڑا بڑھا کے اس کے پاس پہنچا اور پوچھا:

"اے ابنِ ابی۔ تم نے اپنا گھوڑا کیوں روک لیا۔ کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"ہاں!"

ابنِ ابی نے قدرے غصہ سے جواب دیا:

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

"مگر کیوں؟" مسلمان نے دریافت کیا۔

ابنِ ابی نے بڑی رعونت سے جواب دیا:

"اس لیے کہ میری رائے پر عمل نہیں کیا گیا"۔

"تم کون ہوتے ہو اپنی رائے پر عمل کرانے والے"۔

مسلمان نے تلوار کھینچ لی:

"جنگ کے دنوں میں رائے اور حکم صرف سالارِ فوج کا چلتا ہے۔ یوں بھی ہمارے قائد اور ہمارے رہبر خدا کے رسولؐ ہیں۔ وہ ہمیں میدانِ جنگ میں لے جا رہے ہیں"۔

اس نے تحکم سے کہا:

"اے ابنِ ابی۔ تلوار نکالو۔ تم نے اپنے سپہ سالار اور میرے رسولؐ کی حکم عدولی کی ہے۔ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا"۔

ابنِ ابی گھبرا گیا۔

اس نے فوراً اپنی ڈھال سامنے کر دی کہ کہیں اس پہ وار نہ ہو جائے۔

اسی وقت حکمِ رسولؐ پہنچا:

"پڑاؤ کا حکم دیا جاتا ہے۔ گھوڑے روکے جائیں۔ جو واپس جانا چاہتا ہے اسے ہرگز نہ روکا جائے"۔

پس مقامِ شیخین پر پڑاؤ کیا گیا۔

ابنِ ابی اپنے ۳۰۰ سواروں کو لے کر واپس ہو گیا۔ لشکرِ اسلام ایک ہزار سے گھٹ کے صرف سات سو رہ گیا۔

ممکن ہے کہ ایک تہائی لشکر کی واپسی سے کچھ لوگ افسردہ ہوئے ہوں۔ سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو تسلی دی:

"اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو تم سے دور کر دیا۔ وہ تمہیں ان سے بے نیاز رکھے گا"۔

پڑاؤ کے دوران رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکرِ اسلام پر تنقیدی نظر ڈالی۔ آپؐ کو لشکر میں بہت سے کمسن بچے نظر آئے۔

چنانچہ جناب زید بن ثابتؓ، براء بن عازبؓ، ابوسعید حذریؓ، عبداللہ بن عمر خطابؓ اور عرابہ اوسیؓ وغیرہ کو واپس جانے کا حکم ہوا۔

مگر ـــ ذوقِ جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب لشکر کا جائزہ لے

رہے تھے تو اس دوران ایک کمسن بچہ جس کا نام رافعؓ بن خدیج بار بار ایڑیاں اونچی کر کے خود کو بلند کر رہا تھا تاکہ اس کا قد اونچا لگے اور وہ جوانوں میں شمار کیا جائے۔

سپہ سالارِ لشکرِ اسلام نے رافعؓ کے ذوق و شوقِ جہاد کے پیشِ نظر اسے لشکر کے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔

رافعؓ کو اجازت ملنے پر وہاں ایک بڑی دلچسپ اور عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔

رافعؓ بن خدیج کے محلہ ہی کا ایک اور بچہ جس کا نام سمرہؓ بن جندب خزاری تھا، اس نے بھی لشکر میں شریک ہونے کا دعویٰ کر دیا۔

سمرہؓ بن جندب منہ سکوڑے مگر غم و غصہ میں بھرا ہوا جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچا اور بے باکی سے بولا:

"اے خدا کے رسولﷺ! آپؐ میرے ساتھ زیادتی فرما رہے ہیں!"

بچہ کے اس گستاخانہ انداز پر صحابہ کرامؓ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور نرمی سے دریافت فرمایا:

"کیا زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ؟"

سمرہؓ بن جندب نے سینہ پھلا کر کہا:

"اے خدا کے رسولﷺ! میں رافعؓ سے زیادہ طاقتور ہوں۔ میں اسے پچھاڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی لشکر کے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔"

حضورؐ اس کے جذبے سے بہت متاثر ہوئے۔ فرمایا:

"ٹھیک ہے۔ تمہارا مقابلہ کرایا جائے۔"

پس ایک طرف سے رافعؓ بن خدیج اور دوسری طرف سے سمرہؓ بن جندب خم ٹھونکتے ہوئے ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔

تمام صحابہ کرامؓ اس دلچسپ مقابلہ کو دیکھنے کے لیے ان کے گرد جمع ہو گئے۔

رافعؓ اور سمرہؓ ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور شہ زور پہلوانوں کی طرح ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

مقابلہ برابر کا تھا اور بہت دیر تک جاری رہا۔

ایک روایت کے مطابق کشتی لڑنے کے دوران سمرہؓ نے رافعؓ سے سرگوشی میں کہا:

"رافعؓ۔ ہم دونوں طاقت میں برابر معلوم ہوتے ہیں اور شاید ایک دوسرے کو نہ پچھاڑ سکیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میری خاطر شکست کھا جاؤ؟"

رافعؓ نے بھی اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے مجھے پچھاڑنے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں کیوں شکست کھاؤں؟"

"پیارے دوست!"

سمرہؓ بن جندب نے خوشامد کی:

"میں نے زور لگا کے دیکھ لیا۔ میں تمہیں اپنی طاقت سے نہیں پچھاڑ سکتا۔ تمہیں تو اجازت مل گئی ہے۔ اب تم مجھ سے تعاون کرو اور شکست مان لو تاکہ مجھے بھی اجازت مل جائے۔"

اور دوسرے ہی لمحے رافعؓ بن خدیج زمین پر گر پڑا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمرہؓ کو بھی اجازت دے دی مگر آپؐ کے پرنور چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی!

دوسرے دن منہ اندھیرے عریض سے پڑاؤ اٹھا۔ لہو فام کوہِ احد، مدینہ منورہ کے شمال سے جنوب تک سات میل میں پھیلا ہوا ہے۔ درمیانی حصہ ایک نیم دائرے کی شکل میں ہے۔ اس قوس میں گھری ہوئی ایک گھاٹی میں لشکرِ اسلام نے پڑاؤ ڈالا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صف بندی کرتے وقت جبلِ احد کو پشت پر رکھا۔

کوہ احد کے جنوبی حصہ میں وادیِ قنات تھی۔ اس کے کنارے پر جبلِ عینین یا جبلِ رماۃ کا درہ تھا۔ پشت کی طرف سے لشکرِ اسلام تک پہنچنے کا یہ واحد راستہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اس درے پر ۵۰ تیر اندازوں کا ایک مضبوط دستہ متعین کیا۔

اس دستے کی کمان عبداللہ بن جبیرؓ کو سونپی گئی۔

حضورؐ نے انہیں ہدایت دی کہ:

"درہ کی ہر حالت میں حفاظت کرنا اور فتح و شکست کسی بھی حالت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا۔"

پھر حضورِ پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصعب بن عمیرؓ کو لشکر کا علم عنایت کیا اور زبیر بن عوامؓ

رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔

حضرت حمزہؓ کو اس حصۂ فوج کی کمان عطا ہوئی جو زرہ پوش نہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صف بندی کرتے وقت فرمایا:

"اگر تم نے صبر و استقامت کا ثبوت دیا تو فتح تمہاری ہی ہوگی"۔

دوسری طرف مشرکینِ مکہ نے اپنے لشکر کی ترتیب بہت سوچ سمجھ کے کی۔ جنگِ بدر میں وہ بڑی ذلت آمیز شکست اٹھا چکے تھے اور انہیں مسلمانوں کی شمشیرِ خارا شگاف کا تجربہ بھی ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے فوج کے مختلف حصوں پر صرف ایسے سرداروں کو مقرر کیا جو انتہائی تجربہ کار، پُرجوش اور شجاع تھے۔

ابوسفیان نے میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا۔

میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل کو سردار کیا۔ عکرمہ کو میسرہ کی کمان اس لیے دی گئی کہ اس کا باپ ابوجہل بدر میں مارا گیا تھا۔

سواروں کے دستوں کی کمان صفوان بن امیہ کو دی گئی۔ اس کا باپ امیہ بھی غزوۂ بدر میں قتل ہوا تھا اس لیے اسے اہمیت دی گئی۔

تیر اندازوں کا سردار عبداللہ بن[1] ابی ربیعہ کو بنایا گیا۔

لشکر کا مقدمہ ابوعامر عبدعمرو بن صیفی کی زیرِ کمان دیا گیا۔ یہ شخص قبیلہ اوس کا ایک سردار تھا اور ایامِ جاہلیت میں راہب ہوگیا تھا۔ پھر جب جزیرۃ العرب نورِ اسلام سے منور ہوا تو اس پر ایسی نحوست اور بدبختی طاری ہوئی کہ رہبانیت سے منہ موڑ کر اپنے چند دوستوں کے ساتھ مکہ بھاگ گیا اور وہاں جا کر کفارِ مکہ میں شامل ہوگیا۔

مشرکینِ مکہ نے اپنا علمبردار طلحہ کو بنایا۔

ان صف آرائیوں کے بعد جنگ کا آغاز ہوا۔

خواتینِ مکہ جو اپنے رشتہ داروں میں جوش پیدا کرنے اور حوصلہ بڑھانے کے لیے آئی تھیں، انہوں نے ہندہ، زوجہ ابوسفیان کی سرکردگی میں دف بجا بجا کر رزمیہ گیت گانا شروع کیے۔

ہم آسمانی ستاروں کی بیٹیاں ہیں
ہم قالینوں پر خرام کرتی ہیں
اگر تم قدم آگے بڑھاؤ گے
تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی
اگر پیچھے ہٹے
تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی
اس جدائی میں محبت نہیں ہوگی!

جنگ کا آغاز اس طرح ہوا کہ سب سے پہلے مشرکین کی طرف سے ابوعامر ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ صفوں سے آگے آیا۔

اس نے پکار کر کہا:

"اے اہلِ مدینہ۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں"؟

ایک انصاری نے جواب دیا:

"ہاں او بدکار، ہم تجھے خوب جانتے ہیں۔ خدا تیری آرزو پوری نہ کرے"۔

اس کے بعد مشرکینِ مکہ کے علمبردار طلحہ نے چند قدم آگے بڑھ کر طنز کا تیر چلایا:

"کون ہے جو مجھے جہنم میں بھیج دے یا میں اسے جنت میں پہنچا دوں"؟

اس کے اس طنز میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جہاد میں مسلمان موت کو گلے لگائے تو وہ شہید ہو کر جنت میں جاتا ہے اور کافر قتل ہو کر جہنم رسید ہوتا ہے۔

اس کی اس بات پر شیرِ خدا علی مرتضیٰؓ ذوالفقار چمکاتے آگے بڑھے اور پہلے ہی وار میں طلحہ کا کام تمام کر کے اسے جہنم میں پہنچا دیا۔

طلحہ کا بھائی عثمان فوراً بھائی کا بدلہ لینے کے لیے رجز پڑھتا ہوا آگے آیا۔ اس کے سامنے جناب امیر حمزہؓ پہنچے۔

عثمان نے ان پر تلوار کا وار کیا۔ جناب حمزہؓ نے وار خالی دے کر جوابی وار کیا۔ وار ایسا شدید تھا کہ

---

[1] واضح رہے کہ یہ عبداللہ بن ابی ربیعہ، عبداللہ بن ابی بن سلول نہیں جو اپنی منافقت کی وجہ سے رئیس المنافقین مشہور ہوا۔

آپ کی تلوار اس کے شانے سے گزر کر کمر تک اتر گئی اور وہ گرتے ہی ختم ہو گیا۔

حضرت حمزہؓ نے نعرہ لگایا:

"میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں[1]!"

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔

اس جنگ میں جنابِ حمزہؓ، جناب علی مرتضیٰؓ اور ابو دجانہؓ نے ایسی شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ مشرکین کے دانت کھٹے ہو گئے۔ ان کی صفیں الٹ گئیں اور ان میں کمزوری اور شکست کے آثار بڑی تیزی سے نمایاں ہونے لگے۔

اس موقع پر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سپہ سالارِ لشکرِ اسلام نے اپنے دستِ مبارک میں ایک تلوار لے کر بلند کی اور فرمایا:

"مسلمانو، تم میں کون ہے جو اس تلوار کا حق ادا کرے"۔

کئی صحابی لپک کر آپ کے پاس پہنچے اور جاں نثاری کی درخواست کی مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ شرف و فخر حضرت ابو دجانہؓ کو عطا کیا۔

ابو دجانہؓ اس غیر متوقع عزت پر بادۂ شجاعت سے سرشار ہو گئے۔ انہوں نے حضورؐ کے دستِ مبارک سے تلوار لے کر اسے بوسہ دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا جو جنگ کے دوران ان کی شناخت ہوا کرتا تھا۔ پھر اکڑتے اور غرور سے سر بلند کرتے ہوئے دشمن فوج پر برق و باد کی طرح ٹوٹ پڑے۔

حضورؐ پرنور نے اس موقع پر فرمایا:

"اللہ جل شانہٗ اس چال سے ناراض ہوتا ہے لیکن اس موقع پر نہیں"۔

دراصل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ غرور اور اکڑ کو پسند نہیں کرتا بلکہ ناراض ہوتا ہے لیکن ایسے موقع پر جب مسلمان جہاد کر رہے ہوں اور دشمن ان کے مقابلے پر ہوں تو اللہ اپنے بندے کے غرور سے ناراض نہیں ہوتا۔

ابو دجانہؓ نے آپؐ کی عطا کی ہوئی تلوار سے کئی مشرکوں کو قتل کیا۔ اس دوران اچانک ان کی نظر ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) پر پڑی۔ وہ شہیدوں کے اعضا کاٹ رہی تھی۔

ابو دجانہؓ کی تلوار بلند ہوئی اور انہوں نے چاہا کہ ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیں مگر پھر ان کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔

---

[1] جنابِ حمزہؓ: نبی کریمؐ کے چچا اور عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔

طبری کے بیان کے مطابق ابو دجانہؓ نے یہ پسند نہ کیا کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا کردہ تلوار کو ایک عورت کے خون سے آلودہ کریں۔ چنانچہ وہ ہندہ کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

جنابِ حمزہؓ اپنی دو دستی تلوار سے مشرکین کو جہنم رسید کر رہے تھے۔ ان کے سامنے جو آیا مارا گیا۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ہندہ نے جبیر بن مطعم کے حبشی نژاد غلام وحشی کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ وہ امیر حمزہؓ کو قتل کر دے۔ اس کے صلہ میں اسے آزادی دے دی جائے گی۔

چنانچہ وحشی جنابِ حمزہؓ کی تاک میں تھا۔

ایک مرتبہ جنابِ حمزہؓ اس کے نشانے پر آ گئے۔ وحشی نے فوراً تاک کر نیزہ مارا جو اُن کی ناف میں لگا اور آر پار ہو گیا۔

جنابِ حمزہؓ لڑکھڑا کر گرے اور شہید ہو گئے۔

عتبہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بیوی حضرت حمزہؓ کو گرتے دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگی اور اپنے گلے کا ہار اتار کر وحشی کے گلے میں ڈال دیا۔

بلاشبہ مشرکینِ مکہ بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے۔ ان کے علمبردار ایک کے بعد ایک قتل ہو رہے تھے۔ لیکن ان کے قدم جمے ہوئے تھے۔

دراصل میدانِ بدر میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کا خیال ان کے قدم جمائے ہوئے تھا مگر وہ کب تک اسلام کے شیدائیوں کے سامنے ٹھہر سکتے تھے۔ لشکرِ اسلام کے ساتھ شیرِ خدا علی مرتضیٰؓ اور ابو دجانہؓ جیسے شمشیر زن موجود تھے اور آخر ان کے پیہم حملوں نے مشرکینِ مکہ کے جمے ہوئے قدم اکھاڑ دیے اور بدحواس ہو کر وہ میدان سے بھاگ اٹھے۔

اس بدحواسی اور بھگدڑ میں قریشِ مکہ اپنی رجز خواں ماہ پاروں کو بھی بھول گئے جو مکہ سے اپنے حسن و جمال کی گرمی سے اپنے لشکریوں کو گرمانے اور برمانے کے لیے ان کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ ان حسیناؤں کو چھوڑ بھاگے تھے اور اب انہیں مسلمانوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

مسلمانوں کی کم عقلی یہ ہوئی کہ وہ مشرکینِ مکہ کی پسپائی کو ان کی شکست سمجھ بیٹھے اور جنگ سے منہ موڑ کر مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس غلطی کا لشکرِ اسلام کو بڑا خوفناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔

میدان میں لڑنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہی جبلِ عینین کے درے پر مامور تیر انداز دستے نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور دشمن کے کسی ناگہانی حملہ سے بے پرواہ ہو کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شامل

ہونے کے لیے دوڑ پڑے۔

ان کے سردار عبداللہ بن جبیرؓ نے انہیں روکا مگر وہ نہیں رکے۔

پھر عبداللہ بن جبیرؓ نے انہیں آواز دے کر خبردار کیا:

"رک جاؤ بدبختو۔ تمہیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ ہر حالت میں درہ کی حفاظت کرنا اور فتح و شکست کسی حالت میں بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا"۔

اس پر ایک تیر انداز نے پلٹ کر جواب دیا:

"اے سردار۔ ہم جنگ کے دوران آپ کے حکم کے پابند تھے۔ اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ آپ ہمیں حکم نہ دیجیے"۔

یہ کہتا ہوا وہ مالِ غنیمت سمیٹنے چلا گیا۔

تیر انداز دستے کی اس عجلت اور اپنے سردار بلکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم عدولی سے ان کے قدم چومتی نصرت و کامرانی پیچھے ہٹ گئی اور نیک بختی نے منہ پھیر لیا۔

قریشِ مکہ میں سب ہی بزدل نہ تھے اور نہ ہی سب بھاگے تھے۔ جنگ ابھی تک ادھر ادھر ہو رہی تھی۔ مکہ کی فوج میں خالد بن ولید جیسا بہادر اور باشعور جرنیل موجود تھا۔

خالد نے اپنے ساتھیوں کی کمزوری کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اسے یقین تھا کہ مشرکینِ مکہ زیادہ دیر تک مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکیں گے۔ اسی لیے وہ جنگ کے دوران گھوڑا بھگا بھگا کر مسلمانوں کی کوئی ایسی کمزوری تلاش کرتا رہا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے ساتھیوں کے اکھڑتے ہوئے قدم دوبارہ میدان میں جما سکے۔

آخر خالد کی تیز نظروں نے مسلمانوں کی وہ کمزوری تلاش کر لی جو ان کی فتح کو شکست میں تبدیل کر سکتی تھی۔

یہ کمزوری تھی:

"جبلِ عینین کے درے سے تیر اندازوں کا ہٹنا"۔

اس وقت درہ تقریباً خالی تھا۔ صرف عبداللہ بن جبیرؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ درے پر موجود تھے اور اپنے تیر اندازوں کی حماقت اور عجلت پر آنسو بہا رہے تھے۔

خالد بن ولید کو ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔ وہ فوراً صرف ایک سو سواروں کی معیت میں کوہِ احد کے اوپر سے ہو کر پشت کی طرف پہنچا اور درے پر بھرپور حملہ کر دیا۔

تیر اندازوں کے سردار عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھ صرف بارہ آدمی تھے۔ انہوں نے خالد بن ولید کو روکنے کی کوشش کی مگر لمحوں میں سب کے سب شہید ہو گئے۔

پھر خالد کا دستہ ان شہیدوں کو روندتا ہوا ان مسلمانوں پر عقب سے حملہ آور ہوا جو مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔

ایک تو اچانک حملہ اور پھر حملہ بھی خالد بن ولید جیسے جرنیل اور اس کے سواروں کا۔

دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ جنگ کا نقشہ تبدیل ہو گیا۔ اہلِ اسلام ایسے غافل تھے کہ اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکے اور ایسے بدحواس ہوئے کہ اپنے بیگانے کی بھی تمیز نہ رہی اور آپس ہی میں ایک دوسرے پر تلواریں چلانے لگے۔

محمد حسنین ہیکل مصری اپنی کتاب "حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" میں لکھتے ہیں:

"جو مسلمان ذرا دیر پہلے کلمۃ اللہ کی سرفرازی اور عقیدہ کی حفاظت کے لیے صف بندی اور ترتیب کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے، ذرا دیر بعد ان کی صفیں تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئیں۔ وہ موت کی دلدل میں پھنس گئے اور بربادی اور ہلاکت کے چنگل میں پھنس کر دم توڑنے لگے"۔

اسی دوران لشکرِ اسلام کے علمبردار مصعب بن عمیرؓ کو ابنِ قمیہ نامی ایک مشرک نے پشت سے حملہ کر کے شہید کر دیا۔

جنابِ مصعبؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت ہم شکل تھے۔ ابنِ قمیہ کو بھی شبہ ہوا کہ اس نے سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیا ہے۔ اس لیے وہ نعرہ لگاتا ہوا اپنے لشکر کی طرف بھاگا کہ:

"میں نے ابوالقاسمؐ کو قتل کر دیا ہے"۔ (خاکم بدہن)

حالانکہ اس وقت تک رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصار کے گھیرے میں محفوظ تھے مگر ابنِ قمیہ کی یہ آواز عام مسلمانوں پر بجلی بن کر گری۔

ان کے اوسان خطا ہو گئے اور بڑے سے بڑے اولوالعزم صحابہؓ حوصلہ ہار بیٹھے مگر حضرت علی شیرِ خدا کی تلوار اس وقت بھی برقِ اجل بن کر مشرکوں پر گر رہی تھی۔

حضرت عمرؓ نے شکستہ دل ہو کر تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا حاصل!

حضرت انس بن نضر انصاریؓ نے کہا:

"اب زندہ رہ کر کیا کریں گے"۔

اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

عجب اضطراب کا عالم اور ابتلا کا وقت تھا مگر صحابہؓ کو یقین نہ آرہا تھا کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ بہت سے صحابہؓ آپؐ کو ڈھونڈتے اور لڑتے ہوئے مشرکین کے غول میں دور تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک کعبؓ بن مالک کی نظر آپؐ پر پڑی تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے:

"مسلمانو۔ رسولؐ خدا یہاں ہیں"۔

حضور پاکؐ نے کعبؓ کو خاموش رہنے کی تلقین کی مگر آواز بلند ہو چکی تھی اور اس آواز کے ساتھ ہی جاں نثار اس طرف سمٹنا شروع ہو گئے لیکن ساتھ ہی کفار کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہو گئی اور انہوں نے اپنا رُخ ادھر کر لیا۔

ابنِ قمیہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دھوکے میں لشکرِ اسلام کے علمبردار مصعبؓ بن عمیر کو شہید کر کے "ابوالقاسمؐ" کی شہادت کا اعلان کیا تھا، وہ حضورؐ کی حیات کی خبر سن کر تیزی سے آواز کی طرف لپکا۔ دوسرے مشرکین کا ریلہ بھی اس آواز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے سیلاب کو تیزی سے بڑھتے دیکھا تو آپؐ نے بآوازِ بلند پکار کر کہا:

"کون مجھ پر جان قربان کرتا ہے"۔

حضورؐ کی اس آواز پر زیاد بن سکن انصاریؓ اپنے چھ انصار ساتھیوں کو لے کر آگے آئے اور اس ریلے کے سامنے دیوار بن گئے۔

فدا کاری اور وفاداری کا یہ ایک اعلیٰ مظاہرہ تھا۔ زیادؓ اور ان کے ساتھی ایک ایک کر کے نبی کریمؐ پر قربان ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی ابنِ قمیہ صفوں کو چیرتا ہوا حضورؐ تک پہنچ گیا اور چہرہ مبارک پر تلوار سے وار کیا جس سے آپؐ کے خود کی دو کڑیاں ٹوٹ کر چہرہ مبارک میں دھنس گئیں۔

پھر عتبہ بن وقاص نے ایک پتھر کھینچ کر مارا جس سے حضورؐ کا ہونٹ زخمی ہو گیا اور ایک دانت (بعض روایتوں میں دو دانت) شہید ہو گیا۔

یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے حضورؐ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ابودجانہؓ آپؐ پر جھک کر ڈھال بن گئے۔ دشمن کا جو تیر آتا اسے وہ اپنی پیٹھ پر روکتے۔

جنابِ طلحہؓ دشمن کی تلوار کے وار اپنے ہاتھ پر روکتے تھے۔ آپ نے مشرکین پر اس قدر تیر برسائے کہ تین کمانیں ٹوٹ گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی سپر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک ڈھانپ لیا کہ کوئی وار نہ پڑ سکے۔

حضرت امِ عمارہؓ ایک صحابیہ تھیں جو پانی پلانے آئی تھیں۔ وہ بھی حضورؐ کے سامنے سپر بن کر کھڑی ہو گئیں اور زخمی ہوئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ تلواریں چمک رہی تھیں مگر رحمتِ ہر عالم اور محسنِ انسانیت کی زبان مبارک پر وہ الفاظ تھے جو آپؐ کی پیغمبرانہ عظمت کی دلالت کرتے ہیں۔

بخاری: غزوۂ احد۔ جلد دوم، صفحہ ۱۸۱ پر رحمت للعالمینؐ کے وہ الفاظ اس طرح درج ہیں:

"خدایا۔ میری قوم کو بخش دے۔

وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں!"

اسی وقت ایک اور واقعہ پیش آیا۔

ایک مشرک جس کا نام ابی ابنِ خلف تھا، گھوڑا بھگاتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پہنچا۔ یہ مشرک مکہ معظمہ میں قسم کھا کر کہا کرتا تھا:

"میرے پاس ایک گھوڑا ہے۔ میں اسے روز جوار کھلاتا ہوں۔ اس گھوڑے پر سوار ہو کر میں ایک دن محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کروں گا"۔

جواب میں حضورؐ فرمایا کرتے تھے:

"انشاء اللہ میں تمہیں ہلاک کروں گا"۔

اب ابی کو اپنی وہ قسم پوری کرنے کا موقعہ نظر آیا۔ چنانچہ وہ تلوار سونت کر حضورؐ کی طرف بڑھا۔ آپؐ کے جاں نثار درمیان میں آگئے۔

رسولِ خدا نے اپنے وفاداروں سے فرمایا:

"اسے مت روکو۔ آنے دو"۔

پھر حضورؐ نے قریب کھڑے ہوئے ایک صحابی حارث بن صمہ انصاریؓ سے برچھا لیا اور حملے کے لیے آتے ہوئے ابی کی ہنسلی پر تاک کے کھینچ مارا۔

اس سے ابی کو ہلکا سا زخم آیا۔ اس کے خون تو نہ بہا مگر وہ گھوڑے سے گر گیا اور بیل کی طرح ڈکرانے اور

ہانپنے لگا۔

ابی کے ساتھی جو اسے گھوڑے سے گرتا دیکھ کر رک گئے تھے، انہوں نے ابی کو ڈکراتے اور ہانپتے دیکھ کر کہا:

"بیکار دھاڑ رہے ہو۔ تمہیں تو محض ایک خراش آئی ہے"۔

ابی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا:

"تمہیں معلوم نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں ہلاک کروں گا۔ اللہ کی قسم! اگر یہ مجھ پر تھوک بھی دیتے تو میں مر جاتا۔ میری جگہ اگر مضر و ربیعہ بھی ہوتے تو آپؐ ان سب کو ہلاک کر دیتے"۔

روایت ہے کہ ابی ابنِ خلف واپسی کے سفر میں سرف کے مقام پر پہنچ کے منسلی کے اسی زخم کی تاب نہ لا کر مر گیا۔

حضرت علیؓ نے حضورؐ کی شہادت کی خبر سن کر بھی ہمت نہ ہاری اور وہ مشرکوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے۔

جب ان کے کان میں حضورؐ کی سلامتی کی آواز پڑی تو وہ تیزی سے حضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔

حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر تلوار پھینک دی تھی وہ بھی واپس آ گئے۔

اسی طرح جنابِ ابوبکرؓ، جنابِ زبیرؓ اور جنابِ سعدؓ بھی حضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔ حضورؐ کو اپنی حفاظت میں لیا اور ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔

مسلمان ایک بار پھر جوش و خروش سے لڑنے لگے۔ مشرکین بھی دوبارہ مقابلے پہ آ گئے مگر دونوں طرف کے لشکری تھکے تھکے سے تھے۔

ابوسفیان نے حضورؐ کا تعاقب کیا مگر آپؐ کے ساتھیوں نے اس پہ پتھروں کی بارش کر دی اور اسے واپس جانا پڑا۔

اب لڑائی رک گئی۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جس وقت حبشی غلام وحشی نے نیزہ مار کر جنابِ حمزہؓ کو شہید کیا تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ خوشی سے ناچ اٹھی۔ (یہ حضرت امیر معاویہؓ کی والدہ ہوئیں)۔

ہندہ نے اس خوشی میں اپنے گلے سے قیمتی ہار اتار کر قاتلِ حمزہؓ، وحشی کے گلے میں ڈال دیا مگر اسی وقت جنگ میں تیزی آ گئی اور ہندہ اپنی خوشی کا پوری طرح اظہار نہ کر سکی۔

پھر جب کسی نے بلند آواز سے پکارا کہ:

"میں نے ابوالقاسم محمدؐ بن عبداللہ کو قتل کر دیا ہے"۔

تو مشرکینِ مکہ کی عورتوں کی بن آئی۔

وہ خوشی کے مارے شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر بربریت پہ اتر آئیں۔ مسلمان شہداء کی لاشوں پر گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

شہداء کے پیٹ چاک کیے۔ ان کے ناک، کان کاٹ کے ہاروں میں پرو دیے اور ان کے کلیجے نکال کر چبانے لگیں۔

ہندہ بنت عتبہ نے حضرت حمزہؓ کی لاش کی سخت بے حرمتی کی۔ آپ کے اعضا کاٹ کر گلے کا ہار بنایا اور ڈائن کی طرح آپ کا کلیجہ نکال کر چباتی رہی۔ پھر شراب اور بربریت کے نشے میں سرمست ہو کر یہ شعر گنگنائے:

میں نے اُحد میں حمزہؓ سے اپنا دل خوب ٹھنڈا کر لیا۔
پیٹ چاک کر کے اس کا کلیجہ تک نکال لیا۔
اب میرے اس جان لیوا رنج و غم کی سخت ٹیسیں ختم ہو گئیں،
جو میں اپنے سینے میں محسوس کیا کرتی تھی۔

دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکی تھیں۔

خالد بن ولید نے پشتِ اُحد سے حملہ کر کے مسلمانوں کی فوج کو سخت نقصان پہنچایا تھا مگر اس کا زور اب ختم ہو گیا تھا۔ تاہم مسلمانوں کی طاقت بھی اب جواب دے چکی تھی۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی پہاڑی پر چڑھ چکے تھے جہاں ابوسفیان کے لوگ نہیں پہنچ سکتے تھے۔

آخر ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھا اور اس نے وہاں سے آواز دی:

"کیا محمدؐ ہیں؟"

حضورؐ نے اشارہ کیا کہ جواب نہ دیا جائے۔

جواب نہ پا کر ابوسفیان نے چیخ کر پوچھا:

"کیا علیؑ ہیں؟"

اس کا بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

اب ابوسفیان نے جنابِ ابوبکرؓ اور جنابِ عمرؓ کے نام پکارے۔ اس کا جواب بھی مسلمانوں کی طرف سے کچھ نہ دیا گیا۔

ابوسفیان نے اطمینان کا سانس لیا اور بڑی انبساط سے بولا:

"تو اچھا ہوا۔ سب کے سب مارے گئے!"

اس وقت حضرت عمرؓ سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے چیخ کر ابوسفیان کو جواب دیا:

"او دشمنِ خدا! تیرے پہلو کے خار سالم ہیں اور ہم سب زندہ ہیں۔"

اس جواب پر ابوسفیان کا مسرت و انبساط سے چمکتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔ وہ چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اپنی شرمندگی اور خجالت کو چھپانے کے لیے اپنے بتوں کے نام لے لے کر ان کے جے کارے (نعرے) لگانے لگا۔

اس نے گلا پھاڑ کے نعرہ لگایا:

"اعلیٰ ہبل۔"

(اے ہبل تو سر بلند رہے)۔

اب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دینے سے روک رکھا تھا لیکن ابوسفیان کے اس نعرے پر آپؐ نے جواب دینے کا حکم دیا اور ایک صحابیؓ نے جواب میں کہا:

"اللہ اعلیٰ و اجل"

(اللہ ہی کی ذات بلند و برتر ہے)۔

ابوسفیان نے پھر ڈینگ ماری:

"لنا العزّیٰ و عزّیٰ لکم۔"

(ہماری تائید میں عزیٰ ہے اور تمہارے ساتھ کوئی عزیٰ نہیں)۔

حضورؐ کے حکم سے صحابیؓ نے فوراً جواب دیا:

"اللہ مولانا و لا مولیٰ لکم۔"

(ہمارا مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں)۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جنگ کے وقت عرب رجز پڑھتے تھے۔ رجز، نثر کے وہ جملے یا نظم کے وہ اشعار ہوتے ہیں جو عرب اپنی اور اپنے خاندان کی برتری کے لیے کہتے تھے۔ اس میں اپنے خاندان کے علاوہ کفار اپنے بتوں اور مسلمان خدا کی عظمت کا ذکر کرتے تھے۔

ان رجز کا انداز، لہجہ اور الفاظ پُر غرور ہوتے تھے مگر اس زمانہ میں اس کا رواج تھا اور اسے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

اس جگہ ایک سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ جب حضورِ پاکؐ نے صحابہ کرامؓ کو جواب دینے سے منع کر دیا تھا تو حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو جواب کیوں دیا؟

کیا یہ حضرت عمرؓ کی غلطی نہیں تھی؟؟

اور کیا انہوں نے اپنے سالار کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی؟؟؟

اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ نسیان اور بھول کا شکار تو ابوالبشر حضرت آدمؑ بھی ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ بھی تو انسان تھے۔

دوسرا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کے اس اقدام کو خود ہی درگزر فرما دیا تھا اور فوراً ہی جواب دینے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے ہمیں یہ اعتراض زیب نہیں دیتا۔

تاہم، حضرت عمرؓ کا یہ اقدام کہ انہوں نے یہ افواہ سن کر کہ حضورؐ شہید کر دیے گئے ہیں (خاکم بدہن) اپنی تلوار پھینک دی اور حضورؐ (جو زندہ و سلامت تھے) کی حفاظت کی طرف سے غافل ہو جانا ایک ایسا اقدام تھا جس کی بندوں ہی نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی گرفت کی تھی۔

اس کا ذکر آگے آئے گا۔

حضور سرکارِ دو عالم کی شہادت کی افواہ مدینہ منورہ تک پہنچ گئی تھی اور آپؐ کی دخترِ نیک اختر خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ حواس باختہ ہو کر بھاگتی ہوئی میدانِ احد میں پہنچ گئی تھیں۔

اس وقت تک حضورؐ کے زخموں سے خون بہنا بند نہ ہوا تھا۔ جناب علی المرتضیٰؓ اپنی سپر میں پانی بھر بھر کے لاتے اور سیدہ زہراؓ آپؐ کے زخموں کو دھوتیں مگر خون پھر بھی بند نہ ہوا۔

اس وقت آپ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر زخموں میں بھرا اور پٹی باندھ دی جس سے خون بہنا بند ہو گیا۔

واضح رہے کہ غزوۂ بدر کے بعد جناب فاطمۃ الزہراؓ اور جنابِ علیؓ کی شادی ہو گئی تھی۔

صحابہ کرامؓ کی طرف سے ابوسفیان کے جملوں کے جوابات اس قدر دنداں شکن تھے کہ ابوسفیان نے اندازہ لگا لیا کہ اس وقت مسلمانوں سے مزید جنگ کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا اس لیے جس حد تک فتح حاصل

ہوئی ہے اسے غنیمت جان کر مکہ کو واپس ہو جائے۔

چنانچہ وہ حوصلہ ہار کر واپس ہو گیا۔

ابوسفیان نے واپس جاتے ہوئے اپنے دل کو خوش کرنے اور اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے چیخ کر مسلمانوں کو مخاطب کیا:

"ہم نے بدر کے مقتولین کا انتقام لے لیا۔ آیندہ سال پھر بدر میں جنگ ہوگی"۔

آنحضرتؐ نے فوراً ایک صحابیؓ کے ذریعے اسے جواب دیا:

"ہاں۔ یہ ہمارے اور تمہارے درمیان انشاء اللہ پختہ عہد ہے"۔

میدانِ اُحد میں بظاہر مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی اور انہیں نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن جب مشرکین مکہ کو یہ معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ زندہ و سلامت ہیں تو ان کی مدینہ پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ میدانِ اُحد ہی سے واپس چلے گئے۔

مسلمانوں کو یہ شکست ان کی ایک لغزش سے ہوئی تھی۔ درّے پر مامور تیر اندازوں نے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکید کے، اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت لوٹنا شروع کر دیا تھا جس سے خالد بن ولید جیسے ذہین سردار نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ پھر بھی مسلمان شکست خوردہ نہیں ہوئے تھے اور نہ ان کی قوت بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضورؐ نے ستر آدمیوں کا ایک دستہ مشرکین مکہ کے تعاقب میں روانہ کیا۔

دستہ کی روانگی کے بعد حضورؐ خود بھی پوری فوج کے ساتھ مدینہ سے آٹھ میل تک مشرکین کے تعاقب میں گئے اور مقام حمراء الاسد تک پہنچ گئے۔

ادھر ابوسفیان مکہ کی طرف واپس جاتے ہوئے روحا کے مقام پر ٹھہرا اور مشورہ کرنے لگا کہ پلٹ کر مدینہ پر حملہ کر دیا جائے۔

مگر شبلی نعمانی کی "سیرۃ النبیؐ" کی روایت کے مطابق قبیلہ خزاعہ جو ابھی اسلام نہ لایا تھا لیکن در پردہ اسلام کا طرفدار تھا، اس کے سردار معبد خزاعی نے ابوسفیان کو سمجھایا:

"سردار۔ آپ نے میدانِ اُحد میں جو فتح حاصل کی ہے اسے ہاتھ سے کھونے کی کوشش نہ کیجیے۔ آپ مدینہ پر حملہ کرنے کی بابت سوچ رہے ہیں اور مجھے اطلاع ملی ہے کہ محمدؐ اس قدر ساز و سامان سے آپ کے تعاقب میں آ رہے ہیں کہ ان سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں"۔

ابوسفیان یہ سن کر بدحواس ہو گیا اور اس نے مکہ کی طرف تیز رفتاری سے سفر کا حکم دے دیا۔

غزوۂ احد تاریخِ اسلام کا دوسرا غزوہ تھا۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے مشرکین مکہ کے ستر آدمیوں کو ہلاک کیا تھا۔ غزوہ اُحد میں اپنی ایک غلطی کی وجہ سے ستر مسلمان شہید کرا لیے۔ چنانچہ بظاہر مشرکین کا یہ کہنا درست تھا کہ انہوں نے جنگِ بدر کا بدلہ لے لیا ہے۔ اس غزوہ میں مشرکین کے مرنے والوں کی تعداد تیس اور بعض روایتوں کے مطابق چوبیس بتائی گئی ہے۔

شہداء میں چار مہاجر اور باقی ۶۶ انصار تھے۔ ان کے علاوہ چالیس مسلمان زخمی بھی ہوئے۔ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ، پھوپھا کے بیٹے عبداللہؓ بن جحش اور صحابہ کرامؓ میں سے مصعبؓ بن عمیر، حنظلہؓ بن ابی عامر، رافع بن مالکؓ، عبداللہؓ بن عمرو خزرجی اور متعدد بدری صحابہؓ شہید ہوئے۔

قریش مکہ کی مشرک خواتین کو اس غزوہ میں مسلمانوں کی لاشیں خراب کرنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شہداء کے ناک کان کاٹ کر اپنے جوشِ انتقام کو سرد کیا۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے مسلم شہداء کے اعضا کاٹ کر انہیں پھولوں کی طرح پرو کر ہار گوندھا اور گلے میں پہنا۔ پھر جنابِ حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔

ہندہ کا باپ عتبہ غزوۂ بدر میں جنابِ حمزہؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اس کا انتقام اس نے حبشی غلام وحشی کے ہاتھوں جنابِ حمزہؓ کو شہید کرا کے لیا تھا۔

حبشی غلام وحشی کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے حضرت حمزہؓ کو نیزہ مار کر شہید نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پاس وحشیوں کا لوہے کا ایک گول چکر تھا جس کے چاروں طرف دندانے بنے ہوئے تھے۔ اس پہیے کو گھما کر نشانے پر مارا جاتا تھا۔ یہ پہیہ گھومتا ہوا نشانے پر لگتا اور مضروب مقام کو آری کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔

وحشی نے اسی پہیے سے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔

ہندہ نے جب حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا تو وہ اس کے گلے سے نہ اتر سکا اور اس نے اسے اگل دیا۔

تاریخوں میں اسی وجہ سے اس کا نام "جگر خور ہندہ" لکھا جاتا ہے۔

اس غزوہ میں مسلمان خواتین نے بڑی جانفروشی اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا۔ حضرت امّ سلیمؓ اور

حضرت عائشہؓ مشکوں میں پانی بھر بھر کے لاتی تھیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں۔

جس وقت مشرکین نے عام حملہ کیا اور حضورؐ کے گرد صرف چند جاں نثار باقی رہ گئے تو حضرت ام عما
جو مشکیزہ لیے پانی پلاتی پھر رہی تھیں، انہوں نے مشکیزہ ایک طرف پھینکا اور تلوار سونت کر حضورؐ کے پا
پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں۔

ابن قیمہ نے جب حضورؐ پر تلوار کا وار کیا تو ام عمارہؓ نے آگے بڑھ کر اس کے وار کو روکا جس:
ان کا شانہ زخمی ہو گیا۔

ام عمارہؓ نے پلٹ کر اس پر جوابی حملہ کیا مگر ابن قیمہ دُہری زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا اس لیے اس
تلوار کے وار کا کوئی اثر نہ ہوا۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی یعنی حضرت حمزہؓ کی ہمشیرہ حضرت صفیہؓ کو مسلمانوں کی شکست
کا حال معلوم ہوا تو وہ مدینہ سے نکل کر میدانِ اُحد میں پہنچیں۔

مشرکینِ مکہ اور خاص طور پر ہندہ نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو بگاڑ دیا تھا۔ حضورؐ کو حضرت صفیہؓ کی آمد کا
خبر ملی تو حضرت صفیہؓ کے بیٹے زبیر بن عوامؓ کو بلا کر حکم دیا:

"صفیہؓ، حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں"۔

جناب زبیرؓ نے والدہؓ کے پاس پہنچ کے آپؐ کا حکم سنایا:

"اے مادرِ مہربان! جنابِ رسولؐ کا حکم ہے کہ آپ ماموں حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں"۔

جنابِ صفیہؓ نے جواب دیا:

"بیٹے۔ میں بھائی کا حال سُن چکی ہوں۔ خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں ہے"۔

اس کے بعد آپ، جنابِ رسولِ خدا کے پاس تشریف لے گئیں اور انؐ سے درخواست کی:

"اے خدا کے رسولؐ! مجھے معلوم ہے کہ مشرکین نے میرے بھائی کی لاش بگاڑ دی ہے۔ حمزہؓ نے اللہ کی
راہ میں جو قربانی دی ہے وہ کوئی بڑی قربانی نہیں ہے۔ آپؐ مجھے بھائیؓ کی لاش دیکھنے کی اجازت دیجیے۔ میں
کوئی ایسی بات نہیں کروں گی جس سے مسلمان عورتوں کا سر نیچا ہو"۔

حضرت صفیہؓ کی بات سن کر آپؐ نے ان کو لاش دیکھنے کی اجازت دیدی۔ حضرت صفیہؓ کو امیر حمزہؓ
کی لاش کے پاس پہنچا دیا گیا۔

جنابِ حمزہؓ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔ ہندہ نے ان کے ناک اور کان کاٹ کر ہار بنایا تھا
اور اسے گلے میں ڈال کر خوش ہوتی تھی۔ پھر اس نے جنابِ حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر اسے چبانے کی کوشش بھی کی تھی
ور اسے نگل نہ سکی تھی۔

جنابِ صفیہؓ نے بھائی کی لاش کو دیکھ کر کہا:

"انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

اور بڑے استقلال کے ساتھ خاموش ہو گئیں۔

اس غزوہ میں حضرت صفیہؓ کے علاوہ ایک اور انصاری خاتون کا کردار بھی نہایت قابلِ قدر اور صبر و تحمل کا
ادر نمونہ رہا تھا۔

ان خاتون کا باپ، بھائی اور شوہر تینوں غزوۂ احد میں شریک تھے۔

پہلے انہیں باپ کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ صرف انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

پھر انہیں سگے بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو انہوں نے کہا:

"انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

پھر خبر لانے والے سے دریافت کیا:

"یہ تو بتاؤ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"اللہ کا شکر ہے کہ وہ بخیریت ہیں"۔

خاتون نے کہا:

"الحمد للہ"۔ اور خاموش ہو گئیں۔

پھر اس کے بعد انہیں اپنے شوہر کی شہادت کی اطلاع پہنچائی گئی تو انہوں نے کہا:

"انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

پھر خبر لانے والے سے پوچھا:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر سناؤ۔ وہ تو خیریت سے ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"رسولِ خدا بالکل خیریت سے ہیں"۔

انصاری خاتون نے کہا:

"الحمد للہ"۔

اور حضورؐ کو تلاش کرتی ہوئی آپؐ کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے بالکل قریب جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے چہرۂ مبارک کو غور سے دیکھا اور بولیں:

کلّ مصیبۃٍ بعدکَ جلل

(تیرےؐ ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں)۔

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہِؐ دیں! تیرےؐ ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم





غزوۂ اُحد میں درۂ عینین کے تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ کے حکمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو نافرمانی کی تھی اور جس کے نتیجے میں قریشِ مکہ کے سردار خالد بن ولید نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا، اس پہ خداوند تعالیٰ نے سخت گرفت کی اور اس پر سورۂ آلعمران کی دو آیات نازل ہوئیں جن میں صاف طور پہ کہا گیا ہے:

"محمدؐ خدا نہیں ہیں، ایک رسولؐ ہیں اور جیسے پہلے رسولؑ وفات پا گئے انؐ کو بھی تم سے ایک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے۔ پھر یہ کیسے درست ہوگا کہ تم انؐ کے اٹھ جانے پہ تحریکِ حق کی ساری بساط پیٹ کے رکھ دو اور ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ رہو"۔

آل عمران کی دوسری آیت میں کہا گیا ہے:

"تمہیں ان خدا پرستوں کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیے جنہوں نے سابق تاریخ میں انبیا کے ساتھ ہو کر اپنی جانیں دیں اور باطل کے سامنے سرنگوں ہونے پر تیار نہ ہوئے۔ اللہ ایسے ہی صبر کیش لوگوں کو پسند کرتا ہے"۔

جنگ کے اختتام پہ جب اس پہ غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر درہ کو رسولِؐ خدا کے حکم کے مطابق خالی نہ چھوڑا جاتا تو مسلمان فاتح ہوتے۔

دوسری بات جو سامنے آئی وہ خالد بن ولید کی اعلیٰ فنی مہارت اور دور اندیشی تھی جس نے مسلمانوں کو

ستر جانوں سے محروم کر دیا۔ چنانچہ یہ بات طے پائی کہ آئندہ جنگوں میں خالد بن ولید پہ خاص طور پر نظر رکھی جائے۔

جنگِ اُحد فیصلہ کن نہ تھی۔

اگرچہ مسلمانوں کا اس میں جانی نقصان کافی ہوا تھا مگر مشرکین کا مدینہ پہ حملہ نہ کرنا اور عجلت میں میدان سے ہٹ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین کو اپنی فتح کا یقین نہ تھا۔

دوسری طرف لشکرِ اسلام کا نقصان اٹھانے کے باوجود ابوسفیان کا تعاقب کرنا اور ابوسفیان کا مسلمانوں کی آمد کی خبر پا کر سر پہ پیر رکھ کے مکہ کو بھاگنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ غزوۂ احد فیصلہ کن نہ تھا۔ ابوسفیان نے چلتے وقت خود ہی اعلان کیا تھا کہ:

"اگلے سال بدر میں پھر جنگ ہو گی"۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں اس جنگ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"اللہ نے تائید اور نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا ابتدا میں اس کے حکم سے تم ان کو قتل کر رہے تھے لیکن جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا تو جونہی وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تو تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔

تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے اور حق تو یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف کر ہی دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے"۔

جنگِ اُحد کے بعد قریشِ مکہ کا باشعور اور شجاع سردار خالد بن ولید ہمیں پھر جنگِ خندق میں سرگرم نظر آتا ہے۔

جنگِ خندق کا دوسرا نام "غزوۂ احزاب" بھی ہے۔ جنگِ اُحد سے ناکام واپس جاتے ہوئے مشرکینِ مکہ کے سردارِ اعلیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ:

"آئندہ سال میدانِ ما میں پھر جنگ ہو گی"۔

چنانچہ اس جنگ کے لیے دونوں طرف سے زور و شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔

اس درمیانی عرصہ میں چھوٹی موٹی جھڑپیں اور مسلمانوں کے ساتھ مختلف قسم کی ایذا رسانیاں ہوتی رہیں۔ کچھ مسلمانوں کو تبلیغ کے بہانے مشرکین نے بلوایا اور پھر انہیں بیدردی سے قتل کر دیا۔ مسلمان تکالیف برداشت کرتے رہے مگر اپنی تیاریوں سے غافل نہ ہوئے۔

جب غزوۂ اُحد کو تقریباً ایک سال گزر گیا تو مکہ سے ایک شخص مدینہ آیا اور اس نے گھر گھر جا کر لوگوں کو بتایا کہ:

"اس دفعہ ابوسفیان اتنا بڑا لشکر اور اتنا زیادہ ساز و سامان لے کر مدینہ پر حملہ کے لیے آ رہا ہے کہ (خدانخواستہ) مدینہ منورہ کھنڈرات میں تبدیل ہو جائے گا"۔

یہ خبر مسلمانوں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مشورے کے بعد پندرہ سو پیادوں اور صرف دس سواروں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دیا۔ پھر عبداللہؓ بن رواحہ یا عبداللہ بن ابی بن سلول کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور اس بے سروسامان لشکر کے ساتھ میدانِ بدر میں پہنچ کے خیمہ زن ہوئے۔

اُدھر ابوسفیان دو ہزار سواروں کے ساتھ مدینہ پر حملہ کے لیے روانہ ہوا۔

مدینہ میں جو شخص ابوسفیان کی تیاریوں کی خبر لے کر آیا تھا وہ دراصل ابوسفیان ہی کا بھیجا ہوا ایک جاسوس تھا۔

اس سے ابوسفیان کا مقصد یہ تھا کہ اس خبر سے مدینہ والے گھبرا جائیں اور ان پر جنگ سے پہلے ہی مشرکینِ مکہ کا رعب، خوف اور دہشت طاری ہو جائے۔

مگر اس کی یہ جنگی حکمتِ عملی ناکام ہو گئی۔

مدینہ والے خوف زدہ ہونے کے بجائے اپنی تیاری مکمل کر کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرکردگی میں میدانِ بدر میں پہلے ہی پہنچ گئے۔ اور اس کی اطلاع ابوسفیان کو اس وقت ملی جب وہ مکہ سے دو روز کی مسافت طے کر چکا تھا اور مقام ظہران یا عسفان میں قیام پذیر تھا۔

مسلمانوں کے میدانِ بدر میں خیمہ زن ہونے کی خبر نے ابوسفیان کو اس قدر بدحواس کیا کہ اس نے میدانِ بدر جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا اور قحط سالی کا بہانہ کر کے مکہ واپس لوٹ گیا۔ یہ اس کی ذہنی شکست کا ثبوت بھی تھا اور آغاز بھی!

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لشکر کے ساتھ میدانِ بدر میں آٹھ روز تک خیمہ زن رہے اور دشمن کا انتظار کرتے رہے۔

پھر جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ ابوسفیان ظہران سے واپس ہو گیا ہے تو آپؐ بھی لشکر لے کر مدینہ منورہ واپس آ گئے۔

یہ ایک طرح سے مسلمانوں کی فتح تھی اور اس سے پچھلے سال اُحد میں ان کو جو نقصان اٹھانا پڑا تھا اس کی ایک گونہ تلافی ہو گئی۔

دوسری طرف جب ابوسفیان ناکام اور نامراد مکہ واپس پہنچا تو اسے پورے قریش میں سخت ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ واقعہ رجب ۴ھ ہجری کا ہے اور یہ غزوۂ بدر ثانی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس کے بعد ۵ھ ہجری میں غزوۂ ذات الرقاع، غزوۂ دومۃ الجندل، غزوۂ مریسیع یا غزوہ بنو مصطلق پیش آئے مگر یہ سب چھوٹی چھوٹی جھڑپیں یا صرف واقعات تھے جن میں مشرکین بغیر مقابلے کے میدان چھوڑ بھاگ گئے تھے۔

غزوۂ مریسیع سے واپسی کے دوران ہی واقعہ افک پیش آیا تھا۔ اس کا محرک رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔

اس واقعہ میں حضرت عائشہ رضؓ پر الزام لگایا گیا تھا جس کی تردید وحی الٰہی کے ذریعہ کی گئی:

"اور کیوں نہ تم نے اسے سنتے ہی کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ! یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے"۔

(سورۂ النور)

پھر اسی سال (ہجری ۵ھ میں) غزوۂ خندق (احزاب) پیش آیا۔

اس مرتبہ ابوسفیان کی سرداری میں دس ہزار کا ٹڈی دل مدینہ میں اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے قصد سے مکہ سے روانہ ہوا۔

مشرکین مکہ کے ساتھ یہود بھی شامل ہو گئے جن کی کوشش سے بنو غطفان، بنو اسد، بنو سعد اور بنو سلیم جیسے قبائل بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

اس اتحادی لشکر کو مدینہ میں یہودیوں کے قبائل بنو قریظہ اور گروہِ منافقین کے تعاون اور مدد کا بھی یقین تھا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب مشرکین مکہ کی ان تیاریوں کی اطلاع ملی تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ اس مجلسِ مشورت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص صحابی حضرت سلمان فارسیؓ بھی شامل تھے۔

خبر یہ تھی کہ ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ غنیم، مدینہ پر حملے کو آ رہا ہے۔ اس لیے باہمی طور پر طے پایا کہ بجائے میدانِ بدر یا کسی کھلی جگہ جنگ کرنے کے، بہتر یہ ہوگا کہ شہر بند ہو کر مدافعتی جنگ کا انداز اختیار کیا جائے۔

اس پر جناب سلمان فارسیؓ نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! ہم ایرانی ایسے موقعوں پر شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرتے ہیں حضورؐ اس طریقۂ جنگ کو بھی پیشِ نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کریں تو شاید کوئی اور بہتر صورت پیدا ہو سکے"۔

حضورِ اکرمؐ جو رسولِ خدا اور پیغمبرِ اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم جنرل بھی تھے آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر غور کیا تو آپؐ کو یہ بات پسند آئی۔ اور آپؐ نے فوراً اسے عملی شکل دینے کے انتظامات شروع کر دیے۔

اس وقت مدینہ کے تین اطراف میں دشوار گزار پہاڑ، کھجور کے باغات اور مکانات تھے جو ایک قدرتی فصیل کا کام دیتے تھے۔ صرف ایک یعنی شامی سمت خالی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود گھوڑے پر سوار ہو کر خندق کی حدود متعین کرنے کے لیے نکلے اور موقعہ کا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ شیخین سے مغربی گوشہ یعنی جبلِ سلع تک دوسرے لفظوں میں مدینہ کے شمال مشرق سے شمال مغرب تک نیم دائرہ شکل میں خندق کھودی جائے۔

آپؐ نے دس دس صحابہؓ کے گروہ دس دس گز زمین کی کھدائی کے لیے مقرر کیے اور تین ہزار فدایانِ اسلام نے بیس دن کے اندر خندق کھود لی۔

ایک اور روایت کے مطابق خندق صرف چھ دن میں تیار ہو گئی تھی۔

یہ خندق پندرہ فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ گہری تھی۔ اس کی مجموعی لمبائی ساڑھے تین میل تھی۔ بعد میں مختلف قبائل نے بطورِ خود اپنے محلوں کی حفاظت کے لیے اسے اور آگے بڑھایا اور جنوب میں عیدگاہ (مسجد غمامہ) کے مغرب سے گزارتے ہوئے قبا کے رخ پر کافی دور بڑھا لے گئے۔ درمیان میں کئی پہاڑیاں بھی آ گئیں جن سے فوجی چوکیوں کا کام لیا گیا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مدینہ کی سنگلاخ زمین کو پانچ گز چوڑائی میں اور پانچ ہی گز گہرائی تک کھودنا کس قدر دشوار تھا۔ جاڑے کی شدت اور فاقہ کشی کی صعوبت اس پہ مستزاد تھی۔ مگر کیا مجال جو کسی کے چہرے پہ ہلکی سی شکن بھی آئی ہو۔

صحابہ کرامؓ دن رات بھوک و پیاس سے بے نیاز ہو کر خندق کھودنے میں معروف تھے اور حضور پاک، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عام مزدور کی طرح صحابہؓ کے ساتھ کھدائی میں شریک تھے۔

خندق کھودتے کھودتے گہرائی میں ایک سخت چٹان راہ میں آگئی۔ چٹان ایسی سخت تھی کہ اس پہ کسی ضرب کا اثر نہ ہوتا تھا۔

صحابہ کرامؓ نے پریشان ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی۔

آپؐ تشریف لائے۔

اس عالم میں کہ تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پہ پتھر بندھا تھا مگر حضورؐ کے دستِ مبارک نے معجزے کا کام کیا۔

آپؐ نے چٹان پر اپنا پھاوڑا مارا اور چٹان حکمِ خداوندی سے تودۂ خاک بن کر بکھر گئی۔

آپؐ نے اسی موقع پر فرمایا:

"مسلمانو! مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں یمن، ایران اور رومی علاقوں کی فتح کی نوید دیتا ہے۔"

صحابہ کرامؓ کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے مگر منافقین کے چہرے لٹک گئے۔ ایک منافق نے دوسرے سے کہا:

"اس وعدے پہ یقین نہ کرنا۔ یہ محض فریب ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے خواتین اور بچوں کو محفوظ مکانوں میں پہنچا دیا گیا اور ان پہ ان کی حمیت اور عصمت کا پہرہ ہی کافی سمجھا گیا۔ اور صرف ایک مرد یعنی حسانؓ بن ثابت (جنہیں جنگ سے معاف رکھا گیا تھا) کو ان خواتین کی نگہداشت پہ مقرر کیا گیا۔

خندق مکمل ہوئی ہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابوسفیان کے میدانِ اُحد میں پہنچنے کی اطلاع ملی۔

اس کے ساتھ شہروں، صحراؤں اور جنگلوں کے وحشی اور درندہ صفت قبائل اور یہود اور بت پرستوں پہ مشتمل

دس ہزار کا لشکر تھا۔

اس نے مسلمانوں کو میدانِ اُحد میں نہ پایا تو بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح مدینہ کی طرف بڑھا لیکن جب اس نے مدینہ کے سامنے گہری خندق دیکھی تو دل مسوس کے رہ گیا۔

شہر میں داخلہ کی کوئی سبیل نہ تھی۔

اس نے بنو غطفان کو اُحد کی طرف پھیلایا اور خود مجمع السیال کے پاس خیمہ زن ہو کر مدینہ پہ حملہ کی تدبیریں سوچنے لگا۔

خالد بن ولید، جنگِ خندق کے موقع پہ بھی پیش پیش تھا۔ وہ سارا دن خندق کے کنارے کنارے گشت کرتا رہتا تاکہ اگر خندق کا کوئی حصہ کمزور نظر آئے یا مسلمان غفلت کی حالت میں دکھائی دیں تو خندق پار کر کے ان پر حملہ کیا جائے۔

لیکن مسلمان باوجود مشکلات کے کفار کے ارادوں سے بے خبر اور غافل نہ تھے۔ خالد بن ولید پر تو ان کی ہر وقت نظر رہتی تھی۔

جب بھی انہیں احساس ہوتا کہ خالد اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق پار کرنا چاہتا ہے وہ تیروں کی بارش کر کے ان سب کو پیچھے دھکیل دیتے۔

اگر خالد کو خندق پار کرنے کا موقع مل جاتا تو مسلمانوں کے لیے بے حد مشکل اور نازک صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔

مسلمان اسی لیے بے حد چوکنّے تھے۔ رات دن باری باری دستے پہرہ دیتے اور خالد بن ولید یا کسی اور کافر سردار کو حملہ کا کوئی موقع نہ دے رہے تھے۔

محاصرہ جس قدر طول کھینچ رہا تھا مشرکینِ مکہ کی پریشانی اسی قدر بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کفار نے تنگ آ کر ایک نئی حکمتِ عملی اختیار کی۔

انہوں نے عرب کے بڑے بڑے جرنیلوں کے لیے ایک ایک دن مقرر کر دیا۔ ہر جرنیل اپنی باری پہ پوری فوج کو لڑاتا تھا مگر خندق عبور نہ کی جا سکی۔

آخر مشرکینِ مکہ نے عام حملہ کا قصد کر لیا۔ اس دن ان کی تمام فوج ایک ساتھ حرکت میں آ گئی اور مدینہ پہ چڑھ دوڑی۔

اتفاق سے ایک جگہ خندق کچھ کم چوڑی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرب کا نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدود معہ اپنے گھوڑے کے خندق پار کر گیا۔ اس کے ساتھ ہی ضرار، جبیرہ اور نوفل وغیرہ چند اور

سوار بھی خندق پار کر گئے۔

عمرو بن عبدود قریش کا وہ پہلوان اور نامور بہادر تھا جو تنہا ایک ہزار سواروں پر بھاری مانا جاتا تھا۔ وہ جنگِ بدر میں زخمی ہو گیا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لے لوں گا اپنے سر میں تیل نہ ڈالوں گا۔

اس نے عرب کے دستور کے مطابق مبارزت کے لیے اپنا مقابل طلب کیا۔

جناب علی المرتضٰے کرم اللہ وجہہ نے اس کی للکار کا جواب دیا۔ دستِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنابِ علیؓ کو مسلح کر کے مقابلے کو بھیجا۔

مقابلہ بڑا ہی سخت تھا۔ دونوں میں دیر تک کشمکش ہوئی۔ حضرت علیؓ کی پیشانی پہ ہلکا سا زخم آیا۔ شیرِ خدا نے جوابی حملہ میں ذوالفقار شمشیرِ آبدار کا ایسا ہاتھ مارا کہ عمرو بن عبدود کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور جنابِ علیؓ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

عمرو بن عبدود کے دوسرے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

عمرو کا ایک ساتھی نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی تھا۔ وہ خندق پار نہ کر سکا اور گھوڑے سمیت اس میں گر پڑا۔ مسلمانوں نے اس پہ تیر برسانا شروع کر دیے۔

نوفل نے آواز لگائی:

"مسلمانو۔ مجھے یوں ہلاک نہ کرو۔ میں شریفانہ موت چاہتا ہوں!"

جنابِ علیؓ نے اشارے سے تیر اندازوں کو روکا۔ پھر وہ خود خندق کے اندر اترے اور نوفل کو مقابلہ کی دعوت دی۔

نوفل نے تلوار کھینچ کر جنابِ علیؓ پر حملہ کیا مگر وہ ان کا جوابی حملہ نہ روک سکا اور قتل ہو گیا۔

یہی وہ دن تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار نمازیں قضا ہوئیں۔

محاصرہ کی طوالت مشرکین کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ عمرو بن عبدود کے مارے جانے سے ان میں بددلی پیدا ہو رہی تھی۔

مسلمان بھی پریشان تھے مگر ان کے حوصلے بلند تھے۔

آخر مشرکین نے طے کیا کہ یہودیوں کا قبیلہ بنو قریظہ جو مدینہ میں موجود ہے اس سے رابطہ قائم کر کے اسے مسلمانوں پر پشت سے حملہ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس صورت میں مسلمان دو طرفہ حملے سے پریشان ہو کر شکست کھا جائیں گے۔

مشرکین کی یہ ترکیب کسی حد تک کامیاب ہوئی اور بنو قریظہ نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا پہلے سے اندازہ تھا۔ پس انہوں نے یہ اطلاع ملتے ہی دو سو سپاہیوں کا ایک دستہ بنو قریظہ کے متوقع حملے کے لیے الگ کر لیا اور اسے بنو قریظہ جانے والے راستوں پر مامور کر دیا۔

اس حکمتِ عملی سے بنو قریظہ کے یہودی اندرونی طور پر حملہ کرنے میں ناکام رہے۔ پھر بھی یہ بدذات اپنی شرارت سے باز نہ آئے۔

یہودیوں کو معلوم تھا کہ مسلمانوں نے عورتوں اور بچوں کو قلعہ نما ایک حویلی میں رکھا ہے۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ ان عورتوں اور بچوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں حتمی قدم اٹھانے سے پہلے انہوں نے اپنا ایک آدمی حویلی کی طرف جاسوسی کے لیے بھیجا۔ حویلی کی خواتین کی حفاظت پہ چونکہ صرف ایک آدمی مقرر تھا اس لیے مسلمان خواتین اپنی حفاظت کے لیے ہر وقت خود کمربستہ رہتی تھیں۔

بنو قریظہ کا جاسوس جب حال احوال معلوم کرنے کے لیے حویلی کے قریب پہنچا تو اسے جنابِ رسولِ اکرمؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے دیکھ لیا اور سب خواتین کو خبردار کر دیا اور خود خیمہ کی ایک طناب اکھاڑ کر ہاتھ میں لیے دروازے کے قریب کھڑی ہو گئیں۔

جب جاسوس قریب آیا تو آپ طناب لیکر باہر نکلیں اور فرمایا:

"دروازہ اندر سے بند کر لو اور کسی صورت میں نہ کھولنا"۔

دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ آپ یہودی جاسوس کی طرف بڑھیں۔

یہ حضرت صفیہؓ کی جاں نثاری، وفاداری اور بہادری کی ایک نمایاں مثال تھی۔ آپ کے بھائی حضرت حمزہؓ غزوۂ احد میں شہید ہو چکے تھے اور وہ خود اس وقت محض ایک خیمہ کی طناب لے کر ایک مسلح یہودی کے مقابلہ پہ آ گئی تھیں۔

یہی نہیں بلکہ واپسی کا راستہ بھی بند کرا دیا تھا کہ اگر خدانخواستہ زخمی ہو کر واپس آنا چاہیں تو بھی اندر نہ آ سکیں۔ ظاہر تھا کہ اگر وہ یہودی یا یہودیوں کے ساتھ لڑتی ہوئی حویلی میں واپس آتیں تو ان کے ساتھ دشمن

سپاہی بھی حویلی میں داخل ہو کر عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے اس لیے انہوں نے اپنی واپسی کا دروازہ بند کرادیا تھا۔

حضرت صفیہؓ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی یہودی جاسوس کے سر پر پہنچ گئیں۔ ایک تنہا عورت کو دیکھ کر یہودی کچھ پریشان ہو گیا۔

وہ ابھی کسی نتیجہ پر نہ پہنچا تھا کہ اس کے سر پر طناب کی چوٹیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے تلوار کھینچی مگر حضرت صفیہؓ نے اسے تلوار چلانے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ اس قدر تواتر کے ساتھ اس کے سر پر ضربیں لگا رہی تھیں کہ جیسے بارش ہو رہی ہو۔

یہودی سر پہ چوٹیں برداشت نہ کر سکا اور زخمی ہو کر گر پڑا مگر حضرت صفیہؓ کا ہاتھ بدستور گردش میں تھا اور طناب، ہتھوڑے کی طرح یہودی کے سر کو توڑ رہی تھی۔

حضرت صفیہؓ کا ہاتھ اس وقت رکا جب یہودی کی کھوپڑی چکنا چور ہو گئی۔ حضرت صفیہؓ نے اس کی لاش کھینچ کے سڑک پر ڈال دی تاکہ اس کے ساتھیوں کو فوراً نظر آ جائے!



☆

مدینہ کے تین اطراف میں دشوار گزار پہاڑیاں، کھجور کے گھنے باغات اور آبادی کے مکانات تھے جو فصیلِ شہر کا کام دیتے تھے۔

صرف ایک سمت یعنی شہر کا شمالی حصہ کھلا تھا اور اس طویل حصہ کو ایک گہری اور چوڑی خندق سے گھیر لیا گیا تھا۔

اس طرف سے شہر میں داخلہ اپنی موت کو دعوت دینا تھا مگر عرب کے مشہور پہلوان اعظم عمرو بن عبد ود نے خندق پار کر کے دعوتِ مبارزت دی تھی اور جنابِ علی مرتضیٰؓ نے مقابلے پر نکل کے اسے ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا تھا۔

قریشِ مکہ کے لشکر میں دوسرا بڑا بہادر اور شہسوار خالد بن ولید تھا۔

مگر — وہ بے پناہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ذہین اور فنونِ جنگ سے پوری طرح واقف تھا۔

جس وقت عمرو بن عبد ود نے لشکرِ قریش میں اعلان کیا کہ:

"میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق عبور کروں گا۔"

تو خالد بن ولید نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔

خالد نے کہا:

"ابنِ عبد ود، خندق پار کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسے تو ہر وقت پار کیا جا سکتا ہے مگر محض

خندق پار کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ خندق پار مسلمانوں کے تیر اندازوں سے بچنا اور لشکر سے مقابلہ بھی کرنا ہے"۔

عمرو بن عبد ود کو اپنی طاقت پر بڑا غرور تھا۔ اس نے جواب دیا:

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ ہم چوڑیاں پہن کے بیٹھے رہیں اور بغیر جنگ کے واپس چلے جائیں"۔

خالد نے کہا:

"یہ میں نے کب کہا!"

عمرو بن عبد ود بولا:

"تو پھر؟"

خالد نے کہا:

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ صرف چند آدمیوں کے ساتھ خندق پار کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ اس سے فائدہ کے بجائے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے"۔

عمرو بن عبد ود کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کا ایک ساتھی ضرار جبیدہ بول پڑا:

"خالد۔ ہم صرف چند آدمی تھوڑی خندق پار کریں گے۔ ہمارے ساتھ تو ہزار سے زیادہ آدمی ہیں"۔

خالد نے ان سب کو حیرانی سے دیکھا:

"تم صرف بارہ سوار ہو اور ہزاروں کی بات کر رہے ہو"۔

خالد نے کہا:

"تمہارے یہ سوار خندق پار کر بھی لیں تو کیا کر لیں گے"۔

اب عمرو بن عبد ود کے دوسرے ساتھی نوفل نے ہنستے ہوئے ضرار جبیدہ سے کہا:

"خالد تمہاری بات نہیں سمجھ سکے ضرار۔ کہو تو میں انہیں سمجھا دوں"۔

"ہاں ہاں ضرور"۔

ضرار جبیدہ بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا:

"خالد کو بتاؤ کہ ہم بارہ سوار نہیں بلکہ ایک ہزار بارہ سوار ہیں"۔

"کچھ سمجھے خالد"۔

نوفل کا انداز طنزیہ تھا:

"ہم واقعی ایک ہزار بارہ سوار ہیں۔ ضرار نے ٹھیک کہا ہے!"

خالد بن ولید خاموش رہا۔

آخر نوفل نے خود ہی وضاحت کر دی:

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں خالد۔ دیکھنے میں ہم واقعی بارہ سوار ہیں مگر عمرو بن عبد ود کی طاقت کو تم جانتے ہو۔ پورا عرب تسلیم کرتا ہے کہ عمرو بن عبد ود ایک ہزار سواروں پہ بھاری ہے اور ہزار سوار مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے"۔

نوفل نے جو بات کہی وہ روایت کے اعتبار سے درست تھی۔ مشہور یہی تھا کہ عمرو بن عبد ود ہزار سواروں پہ بھی بھاری ہے۔

خالد بن ولید نے ان لوگوں سے بحث مناسب نہ سمجھی اور صرف یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی کہ:

"ابن عبد ود کی طاقت اور زور کا میں قائل ہوں مگر یہ خیال رکھنا کہ مسلمانوں کے پاس بھی ایک ابن عبد ود موجود ہے اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا داماد علیؓ ابن ابی طالب ہے"۔

پھر ابن عبد ود کا حضرت علی مرتضیٰؓ کے ہاتھوں جو حشر ہوا وہ آپ سابقہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں!

خندق پار کر کے مدینہ میں داخل ہونا ممکن نہ تھا مگر باقی تینوں اطراف سے مشرکین مکہ اور مسلمانان مدینہ کے اکا دکا آدمی ایک دوسرے کے خیموں تک پہنچ رہے تھے۔

اطراف کی پہاڑیاں، کھجور کے باغات اور آبادی کے مکانات اگرچہ فصیل کا کام دیتے تھے مگر یہ ناقابل عبور نہیں تھے۔

پھر یہ کہ دونوں اطراف کے لشکروں میں سینکڑوں آدمی ایسے تھے جن کے دوست واحباب اور بعض کے قریبی رشتہ دار بھی مخالف لشکر میں موجود تھے۔ چنانچہ ان کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا تھا۔

بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب، مدینہ کے بنو قریظہ کے سردار سے ملنے آ چکا تھا۔ بنو قریظہ یہودی تھے اور ان کا مسلمانوں سے دوستی کا معاہدہ تھا بلکہ یہ بھی طے تھا کہ مدینہ پر حملہ کے وقت بنو قریظہ مسلمانوں کی مدد کریں گے لیکن انہوں نے کیا یہ کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے قلعہ میں بند ہو کر غیر جانبدار بن کر بیٹھ گئے۔

چنانچہ بنو نضیر کے سردار نے مدینہ پہنچ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کو اس بات پہ آمادہ کر لیا کہ وہ مسلمانوں

پر پشت سے حملہ کر دیں۔

بنو قریظہ اس بات پر آمادہ تو ہو گئے مگر وہ مسلمانوں کی طاقت سے گھبراتے بھی تھے اور تذبذب کا شکار تھے۔

بنو نضیر اور بنو قریظہ میں زبانی معاہدہ بھی ہو گیا مگر مدینہ کے یہودی مسلمانوں کے خلاف کھل کر کوئی کاروائی نہ کر سکے۔

انہوں نے یہ ضرور کیا کہ اس قلعہ پر حملہ کرنے کا قصد کر لیا جہاں مسلمانوں نے اپنی خواتین اور بچوں کو محفوظ کر رکھا تھا۔

فوج کی مدد حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ قلعہ بالکل غیر محفوظ تھا۔ اسی وجہ سے ایک یہودی دریافتِ حال کے لیے اس قلعہ کے پاس پہنچا اور حضرت صفیہؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس واقعے کے بعد یہودی محتاط ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ قلعہ میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ مسلمان فوجی بھی موجود ہیں۔

پھر انہوں نے قلعہ کا رخ نہ کیا۔

مدینہ کے محاصرہ کو ایک ماہ ہو رہا تھا مگر مشرکینِ مکہ کو کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی بلکہ روزانہ ان کے دس بیس آدمی خندق پار کرنے کی کوشش میں زخمی ہو رہے تھے۔ رسد کی کمی الگ ہو رہی تھی موسم بھی سخت ہو گیا تھا اور شدید سردی پڑ رہی تھی۔

مدینہ پر یہ حملہ ابوسفیان کے لیے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کے رہ گیا تھا کہ وہ نہ تو مدینہ پر حملہ کر پا رہا تھا اور نہ جگ ہنسائی کے ڈر سے محاصرہ اٹھا کر واپس جا سکتا تھا۔

ابوسفیان کو اگر کچھ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی تو اس کی یہی صورت تھی کہ مدینہ کا یہودی قبیلہ بنو قریظہ اندر سے گڑبڑ کرے اور ابوسفیان باہر سے حملہ کرے تاکہ دوطرفہ حملہ سے پریشان ہو کر مسلمانوں میں کھلبلی پڑے اور مشرکین حملۂ عام سے ان کو شکست دے دیں۔

مگر — اسے کیا معلوم تھا کہ بنو قریظہ کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ جب سے ان کا ایک آدمی قتل ہوا تھا وہ سخت پریشان تھے اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مسلمان خود ان کے قلعوں (حویلیوں) پر جلد ہی حملہ کرنے والے ہیں!

اب مدینہ کے اندر بنو قریظہ خوف زدہ تھے اور مدینہ کے باہر ابوسفیان غذائی صورت حال اور موسم کی شدت سے پریشان تھا۔

اسی دوران بنو غطفان کا سردار نعیم بن مسعود اشجعی (نخعی) ابوسفیان کے خیمے میں آیا۔ نعیم بن مسعود سردار ہونے کے علاوہ مکہ کا ایک بڑا رئیس اور سرآوردہ شخص تھا۔ چنانچہ ابوسفیان نے اٹھ کر اسے اپنے گلے لگایا۔

کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں جن میں موسم کی شدت خاص طور پر زیرِ بحث رہی۔ پھر نعیم بن مسعود نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

اس نے کہا:

"سردار- آپ مجھ سے زیادہ عقلمند ہیں اور جنگی معاملات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی آپ کا حلیف ہونے کی حیثیت سے میرا بھی فرض ہے کہ اگر کوئی بہتر صورت میرے ذہن میں آئے تو میں آپ سے بیان کروں— بشرطیکہ آپ کو ناگوار نہ گزرے!"

"نہیں نہیں سردار نعیم۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو"۔

ابوسفیان جلدی سے بولا:

"جنگ میں اور جنگ کے باہر بھی ہم ایک دوسرے کے حلیف ہیں اور پھر ایک ایسے وقت میں جبکہ ہم کچھ مشکلات سے بھی دوچار ہیں۔ ہم تمہارے مشورہ کی ضرور قدر کریں گے۔ تم پوری آزادی کے ساتھ کہو کیا کہنا چاہتے ہو"۔

"سردار"۔

نعیم بن مسعود نے سنبھل کر کہا:

"خندق پار کرنے کی ہماری تمام کوششیں رائیگاں ہو چکی ہیں اور ہم نے اس کوشش میں ناکامی کے علاوہ بہت نقصان بھی اٹھایا ہے"۔

ابوسفیان سر ہلا کر رہ گیا۔

نعیم بن مسعود نے مزید کہا:

"اس صورتِ حال میں میرا خیال ہے کہ ہمیں بنو قریظہ سے ایک بار پھر رابطہ قائم کرنا چاہیے کیونکہ جب تک مسلمانوں پر اندر اور باہر دونوں طرف سے دباؤ نہیں پڑے گا وہ شکست سے دوچار نہیں ہوں گے یہ بات تو طے ہے"۔

"تمہارا خیال درست ہے نعیم"۔

ابوسفیان نے اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا:

"ہم نے حیی بن اخطب کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا تھا اور بنو قریظہ نے یقین دلایا تھا کہ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔ اب وہ اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"سردار ابوسفیان!"

نعیم نے زور دے کر کہا:

"ہم عالم جنگ میں ہیں اور ہمارا مقابلہ ایک زبردست دشمن سے ہے اس لیے ہمیں پسپا ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ غرض ہماری ہے۔ ضرورت ہمیں ہے۔ اگر بنو قریظہ اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں تو ہمیں ان کو ان کا وعدہ یاد دلانا چاہیے خواہ اس کے لیے ہمیں ہر روز اور بار بار مدینہ کا چکر لگانا پڑے"۔

"ہوں۔ یہ بات تو ہے"۔

ابوسفیان نے سر ہلایا:

"مگر اب بنو قریظہ کے پاس کس کو بھیجا جائے"۔

"اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں"۔

نعیم بن مسعود نے جواب دیا:

"بنو قریظہ سے میرے بھی دیرینہ تعلقات ہیں"۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے"۔

ابوسفیان فوراً بولا:

"تم آج ہی چلے جاؤ۔ چاہو تو ایک رہبر ساتھ لے جا سکتے ہو"۔

"میں اپنے بھتیجے ابنِ حاتم کو ساتھ لے جاؤں گا"۔

نعیم نے جواب دیا:

"وہ کئی سال یہاں رہ چکا ہے"۔

سپہ سالار ابوسفیان سے اجازت لینے کے بعد نعیم بن مسعود اپنے خیمہ پر واپس آیا۔ وہ جاتے وقت ابنِ حاتم سے کہہ گیا تھا کہ اگر ابوسفیان نے اسے اجازت دے دی تو وہ آج ہی مدینہ جائے گا۔

"ابنِ حاتم۔ میں مدینہ جا رہا ہوں"۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے چچا جان"۔

ابنِ حاتم نے قریب آ کر کہا:

"کاش میں ___"

نعیم نے اس کی بات کاٹ دی:

"اور تم میرے ساتھ مدینہ چلو گے"۔

"سچ چچا جان"۔

ابنِ حاتم خوشی سے اچھل پڑا۔

"سچ اور بالکل سچ"۔

نعیم بن مسعود نے مسکرا کر کہا:

"میں نے ابوسفیان سے کہہ دیا ہے کہ میرا بھتیجا ابنِ حاتم میرے ساتھ جائے گا۔ وہ اُحد کے پہاڑی راستوں اور مدینہ کی گلیوں سے خوب واقف ہے"۔

ابنِ حاتم، نعیم بن مسعود اشجعی کے سب سے بڑے بھائی حاتم کا بیٹا تھا۔ قبیلہ بنو غطفان کا حاتم اپنے بال بچوں کے ساتھ مدینہ آ کے آباد ہو گیا تھا۔

حاتم کے مدینہ آنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شروع ہی سے مذہبی دل و دماغ کا آدمی تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیسے ہی اسلام کا اعلان کیا تو وہ دل سے مسلمان ہو گیا مگر اس نے یہ بات ظاہر نہیں کی۔

پھر جب حضورؐ مدینہ ہجرت فرما گئے تو دو سال بعد ہی یہ بھی مع اہل و عیال مدینہ پہنچ گیا مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی اور ایک ہی سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

وہ ۳ سنہ ہجری کا پُر آشوب زمانہ تھا۔

جنگِ اُحد کو ختم ہوئے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ نعیم بن مسعود کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر ملی۔ اس وقت مدینہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ بنو غطفان نے تو کھل کر مشرکینِ مکہ کا ساتھ دیا تھا اس لیے وہ تو مدینہ جانے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

مگر ___

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ نعیم بن مسعود اشجعی بہت بااثر سردار تھا اور یہ بات مدینہ والے بھی جانتے تھے۔ اس لیے نہ مکہ والوں نے نعیم کو مدینہ جانے سے روکا اور نہ مدینہ والوں نے نعیم بن مسعود کو مدینہ میں داخل

ہونے سے روکا۔

اس طرح نعیم بن مسعود اپنی بھاوج اور واحد بھتیجے ابنِ حاتم کو مدینہ سے مکہ للنے میں بآسانی کامیاب ہو گیا۔

پس!

پچھلے دو سال سے ابنِ حاتم اور اس کی ماں نعیم بن مسعود کے زیرِ سایہ زندگی گزار رہے تھے۔ نعیم نے بھاوج کو مدینہ سے مکہ لانے کے بعد دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی مگر وہ دوسری شادی کرنے کے بجائے اللہ اللہ کرنے میں لگ گئیں۔

یہ کتنی عجیب بات تھی کہ نعیم بن مسعود نے اب تک اسلام قبول نہ کیا تھا مگر وہ اپنی بھاوج کو اسلامی ارکان کی ادائیگی سے بالکل نہ روکتا تھا۔

اس طرح جس گھر میں ایک مسلمان ماں بیٹے کا قیام تھا اسی مکان میں مشرکین بھی رہتے تھے اور ان میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔

نعیم بن مسعود نے ابنِ حاتم کو اس قدر محبت دی تھی کہ وہ باپ کا غم بھول گیا تھا اور نعیم ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا ابنِ حاتم اپنے چچا سے بہت چھوٹا تھا لیکن چچا اس سے بے تکلف تھا اور جب دونوں میں گفتگو ہوتی تو یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ چچا بھتیجے ہیں یا گہرے دوست!

نعیم بن مسعود سے ابنِ حاتم اس قدر بے تکلف ہو گیا تھا کہ اس نے چچا کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ مدینہ میں اس کی منگیتر نوحا رہتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ابنِ حاتم کو یہ معلوم ہوا کہ نعیم بن مسعود مدینہ جا رہا ہے تو وہ خوش ہو گیا۔ پھر جب اسے یہ علم ہوا کہ چچا اسے بھی اپنے ساتھ مدینہ لے جائے گا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اسے صبح سے شام کرنا مشکل ہو گیا۔

پھر جب رات گئے چچا بھتیجا اُحد کی پہاڑیاں پار کر کے پشت کی طرف سے مدینہ میں داخل ہوئے تو ابنِ حاتم کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔

مدینہ کی گلیوں پر میدانِ جنگ کا منظر طاری تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور دور تک کوئی فرد نظر نہ آتا تھا۔

نعیم بن مسعود نے چلتے چلتے رک کر پوچھا:

"ابنِ حاتم! تمہاری منگیتر کا گھر کس جگہ ہے؟"

ابنِ حاتم چچا کے اس اچانک سوال پر سٹپٹا گیا۔

نعیم نے اسے تسلی دی:

"گھبراؤ نہیں ابنِ حاتم! میں دراصل بنو قریظہ کی طرف جا رہا ہوں اور کسی وجہ سے میں تمہیں وہاں نہیں لے جانا چاہتا۔"

نعیم نے ذرا رک کر پھر کہا:

"کیا یہ ممکن ہے کہ میری واپسی تک تم اپنی منگیتر کے گھر ٹھہرے رہو؟"

ابنِ حاتم خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

"نعیم چچا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں"۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا:

"میں تو زندگی بھر وہاں ٹھہر سکتا ہوں"۔

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا"۔

نعیم نے سرگوشی کی:

"مگر امید رکھو کہ ایسا وقت بہت جلد آنے والا ہے جب ہمارے لیے مدینہ کا راستہ ہمیشہ کو کھل جائے گا اور ہمیں یوں رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح نہ آنا پڑے گا"۔

"خدا کرے جلد ایسا ہو"۔

ابنِ حاتم نے بھی سرگوشی میں جواب دیا اور چچا کو لے کر ایک گلی میں گھوم گیا۔

تھوڑی دور چل کر ابنِ حاتم نے ایک دروازے پر دستک دی۔

چند لمحوں بعد اندر سے کسی خاتون کی آواز ابھری:

"کون؟"

"خالہ۔ میں ہوں ابنِ حاتم"۔ اس نے کراری آواز میں جواب دیا۔

"ارے تم ہو"۔

اور دروازہ کھل گیا۔ ایک خاتون تیزی سے باہر آ گئیں۔

"تم ہو ابنِ حاتم۔ میرے بیٹے!"

یہ کہہ کر خاتون نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"خالہ جان!"

ابنِ حاتم نے وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا:

"اندر چلیے۔ باہر کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔"

خالہ کو بھی احساس ہو گیا۔ وہ جلدی سے الگ ہو گئی۔ قریب ہی نعیم بن مسعود کھڑا تھا۔ ابنِ حاتم نے فوراً کہا:

"یہ میرے چچا نعیم ہیں۔ تفصیل اندر چل کر بتاؤں گا۔"

پھر اس نے چچا سے کہا:

"چچا جان۔ یہ ہیں نوحنا کی والدہ۔"

"سلام خاتون!"

نعیم نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر ابنِ حاتم کی طرف جھک کر سرگوشی کی:

"تفصیل بتانے میں احتیاط کرنا۔"

اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نعیم واپس ہو گیا۔

ابنِ حاتم کی خالہ نے شکوہ کیا:

"بیٹے۔ تمہارے یہ کیسے چچا ہیں۔ ہمیں دو گھڑی مہمان نوازی کا موقع ہی نہیں دیا۔ بھلا ایسی بھی کیا جلدی۔ نوحنا سنے گی تو مجھ پہ ناراض ہو گی کہ میں نے تمہارے چچا کو باہر ہی باہر سے کیوں رخصت کر دیا۔"

ابنِ حاتم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مسکرایا اور خالہ کا ہاتھ پکڑ کے گھر کے اندر چلا گیا۔



نعیم بن مسعود گلی سے باہر نکلا تو اسے مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ آتا دکھائی دیا جس میں بمشکل دس سپاہی تھے۔ یہ افراد تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ ان کے گشت کا وقت تھا!

جنگِ خندق (غزوۂ احزاب) کے وقت مسلمانوں کے لشکر کی تعداد صرف تین ہزار تھی اور حملہ آور مشرکین کی تعداد دس سے چالیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔

سالارِ لشکرِ اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے سردار کے مابین ایک جنگی معاہدہ ہوا تھا جس میں یہ شق موجود تھی کہ:

"اگر مدینہ پہ کوئی بیرونی طاقت حملہ کرے گی تو بنو قریظہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔"

یہودی ہمیشہ سے جھوٹے، بد دیانت اور مکار رہے ہیں۔

جب مدینہ پر ابو سفیان نے حملہ کیا اور بنو قریظہ کو معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کی تعداد تیس ہزار سے بھی اوپر ہے تو وہ فوراً مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدے سے منکر ہو گئے۔ اور بجائے ان کے ساتھ مل کے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے، الٹا قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔

یہی نہیں۔ بلکہ انہوں نے مدینہ میں گڑ بڑ پھیلانے کے لیے مسلمان خواتین اور بچوں کے لیے محفوظ قلعہ پہ حملہ کی بھی کوشش کی جس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

مسلمانوں کے پاس اتنا لشکر نہ تھا کہ یہودیوں کی بد دیانتی کے خلاف ایک اندرونی محاذ بھی کھول سکتے۔ پھر انہوں نے اس خیال سے کہ کہیں بنو قریظہ خود ان پہ حملہ نہ کر دیں، دو سو فوجیوں پر مشتمل ایک فوج الگ کر دی جسے دس دس پندرہ پندرہ کے دستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

ان دستوں کا کام یہ تھا کہ وہ رات بھر مدینہ کی گلیوں اور بنو قریظہ کے محلوں کے ارد گرد چکر لگاتے اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے رہیں تاکہ یہودیوں کو یہ معلوم ہو کہ مدینہ کے اندر بھی فوج موجود ہے۔

نعیم بن مسعود اشجعی کی ایک ایسے ہی گشتی دستہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے سردارِ دستہ سے درخواست کی کہ:

"مجھے فوراً رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور لے چلو۔ میں قریش کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔"

(یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نعیمؓ بن مسعود اشجعی مسلمان ہو گئے تھے اور اس کی اطلاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ گئی تھی۔ نعیم نے مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا مگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مصلحتاً مکہ میں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا تھا تاکہ مکہ میں موجود مسلمانوں کی

ڈھارس بندھا رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعیمؓ کو اس بات کا بھی حکم دیا تھا کہ وہ مکہ والوں کے سامنے اپنے اسلام لانے کا ابھی اظہار نہ کریں اور حضور پاکؐ کے حکم کا انتظار کریں۔

یہی وجہ تھی کہ نعیمؓ بن مسعود اپنے قبیلہ کے ساتھ لشکرِ مکہ میں شامل ہو کے مدینہ آئے تھے)۔

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ کے دوران رات میں قطعی نہ سوتے تھے۔ چنانچہ جب آپؐ کو اطلاع دی گئی کہ مشرکینِ مکہ کے لشکر سے نعیمؓ بن مسعود آئے ہیں اور قدم بوسی کے لیے اذنِ نبویؐ کے منتظر ہیں تو آپؐ نے ان کو فوراً اپنے حضور طلب فرمایا۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نعیمؓ بن مسعود میں صرف چند منٹ گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد نعیمؓ باہر آئے اور ایک رہبر کے ساتھ بنو قریظہ کے محلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگِ خندق جاری تھی اس لیے بنو قریظہ کے یہودی بھی محتاط رہتے تھے۔ رات بھر ان کے پہرے دار چوکس رہتے تھے اور محلوں میں ان کا گشت جاری رہتا تھا۔

وہاں پہنچ کے نعیمؓ بن مسعود نے ایک یہودی پہرے دار کے ذریعے بنو قریظہ کے سردار کے پاس پیغام بھجوایا کہ:

"قریشِ مکہ کا سردار نعیمؓ بن مسعود اشجعی اس کی ملاقات کو آیا ہے اور فوراً ملنا چاہتا ہے"۔

نعیمؓ کا یہ پیغام بنو قریظہ کے سردار کو جگا کر پہنچایا گیا۔ قریشِ مکہ کے ایک سردار کا اتنی رات گئے مدینہ میں آنا بھی ایک اہم خبر تھی۔

یہودی سردار بدحواس ہو کر قلعہ کے صدر دروازے کی طرف بھاگا۔ اس کے آدمیوں نے نعیمؓ بن مسعود کو مہمان خانے میں پہنچا دیا تھا جو صدر دروازے کے قریب ہی واقع تھا۔

بنو قریظہ کا سردار، نعیمؓ سے بڑے اخلاق سے ملا۔ اس نے دریافت کیا:

"لشکرِ قریش کے سپہ سالار ابوسفیان کا کیا حال ہے؟"

نعیمؓ بن مسعود نے جواب دیا:

"ابوسفیان بالکل خیریت سے ہیں۔ انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ غیر جانبدار ہو کر قلعہ بند ہو گئے ہیں"۔

بنو قریظہ کا سردار نعیمؓ کے اس جواب سے مطمئن ہونے کے بجائے اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس نے گھبرا کے سوال کیا:

"شکریہ تو اس وقت ادا کیا جائے جب قریشِ مکہ ہمارے غیر جانبدار رہنے سے فتح حاصل کر سکیں۔ میں تو سمجھا تھا آپ کوئی خوشخبری لائے ہوں گے۔ خالی شکریہ سے تو ہمارا کوئی بھلا نہ ہوا"۔

"دیکھیے سردار"۔

نعیمؓ نے بڑی ہوشیاری سے کہا:

"لشکرِ قریشِ مکہ کا سردار آپ کا اس لیے شکر گزار ہے کہ آپ کے غیر جانبدار ہو جانے سے مسلمان گھبرائے ہوئے ہیں۔ چونکہ آپ قلعہ بند ہیں اس لیے مسلمان خندق سے نکل کر قریشِ مکہ پر حملہ نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ اگر وہ خندق سے نکل کے ابوسفیان کے لشکر پر حملہ کریں گے تو ان کا اندرونی محاذ کمزور ہو جائے گا۔ کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ کھلی جنگ شروع ہوتے ہی بنو قریظہ اپنے قلعہ سے نکل کر مدینہ میں اودھم مچا دیں گے"۔

بنو قریظہ کا سردار اور بھی گھبرا گیا۔

اس نے دریافت کیا:

"سردار۔ آخر آپ کا لشکر مسلمانوں کو کب تک شکست دے سکے گا۔ ہم قلعہ بند ہو کر بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اگر ابوسفیان مسلمانوں کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہوئے تو ہم لوگوں کا کیا بنے گا۔ ہم نے تو ابوسفیان کے کہنے پر ہی غیر جانبداری کا یہ رویہ اختیار کیا ہے"۔

"محترم سردار"۔

نعیمؓ نے ایک اور پینترا بدلا:

"جنگ کا حال تو میدانِ جنگ والے ہی جانتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"ٹھیک بالکل ٹھیک"۔

یہودی سردار نے فوراً تائید کی:

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں!"

"تو پھر میری بات غور سے سنیے۔"
نعیمؓ بن مسعود نے بڑے استقلال سے کہا:
"ہمارا لشکر مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتا۔ ہم تو مسلمانوں سے کھلے میدان میں جنگ سے بچنے کے لیے محاصرہ اٹھا کر واپس جانا چاہتے ہیں۔"
"کیا۔ کیا کہا آپ نے؟"
یہودی سردار اٹھ کر کھڑا ہوگیا:
"کیا قریش واقعی واپس جا رہے ہیں؟"
"محترم سردار۔"
نعیمؓ نے جواب دیا:
"میں آپ کا ہمدرد ہوں اور نہیں چاہتا کہ جنگ میں آپ کے آدمی بھی ضائع ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ ابوسفیان اب آپ کی فوجی مدد سے مسلمانوں سے آخری معرکہ کرنا چاہتے ہیں۔"
"فوجی مدد۔"
بنوقریظہ کا سردار بدحواس ہوگیا:
"میں سمجھا نہیں۔"
"میں بتاتا ہوں آپ کو۔"
نعیمؓ نے سنجیدگی سے کہا:
"ابوسفیان دو ایک روز میں آپ پر زور دیں گے کہ آپ قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر زوردار حملہ کردیں۔"
"مگر۔ مگر اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟"
بنوقریظہ کا سردار بے حد بوکھلایا ہوا تھا:
"ہم تنہا تو مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے۔"
"میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں مگر وہ نہیں سمجھتے۔"
نعیمؓ نے جلتی پر اور تیل ڈالا:
"جس طرح انہوں نے خندق پار کرنے کی کوشش میں اپنے بہت سے بہادروں کی بھینٹ چڑھادی ہے اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ آپ کے کچھ بہادر ضائع ہوں اور آپ میں اور مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے دشمنی پیدا ہو جائے۔"
"بات تو سوچنے کی ہی ہے۔"
یہودی سردار نے سر ہلاتے ہوئے کہا:
"یہ لوگ تو لڑ بھڑ کر مکہ چلے جائیں گے اور ہم مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کو بُرے ہو جائیں گے۔"
"سردار ــــ"
نعیمؓ نے واضح الفاظ میں کہا:
"میں ہمیشہ سے آپ لوگوں کا دوست ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں کا نقصان ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ مسلمانوں سے جنگ کرنے سے صاف انکار کردیں۔ اس طرح آپ مسلمانوں کی نظروں میں تو ذلیل و خوار نہیں ہوں گے۔"
"یہ تم نے ٹھیک کہا سردار نعیمؓ۔"
بنوقریظہ کا سردار اکڑ گیا:
"تم واپس جاکے ابوسفیان سے کہہ دو کہ بنوقریظہ مسلمانوں سے جنگ نہیں کریں گے۔"
"میں تو کہہ دوں گا سردار مگر ــــ"
نعیمؓ کہتے کہتے رک گئے۔ پھر بولے:
"انکار کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔"
"پھر کونسا طریقہ ہے؟"
یہودی سردار الجھن میں پڑ گیا:
"تم ہی بتاؤ کوئی ترکیب!"
نعیمؓ نے محسوس کیا کہ لوہا اب گرم ہوگیا ہے اور چوٹ لگانے کا یہی موقع ہے۔ پس انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا:
"سردار۔ میں بتا چکا ہوں کہ ابوسفیان واپس جانے والے ہیں۔ اس لیے اگر وہ آپ پہ جنگ کے لیے زور دیں تو آپ انہیں پیغام بھیجیے کہ وہ کم از کم ایک سو قریش سپاہی ایک ایک کرکے مدینہ بھیجیں۔ جب ان کی تعداد ایک سو ہو جائے گی تو ہم انہیں اپنے ساتھ رکھیں گے اور مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ میں ایک سو قریش سپاہی منگا کر انہیں یرغمال بنالوں۔" یہودی سردار نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا تو موقع ہی نہیں آئے گا"۔

نعیمؓ نے اسے سمجھایا:

"آپ کے اس مطالبے سے ابوسفیان کی نیت معلوم ہو جائے گی۔ اگر وہ واقعی جنگ کرنا چاہتے ہیں تو ایک سو آدمی ضرور بھیج دیں گے ورنہ میدان چھوڑ جائیں گے"۔

"سردار نعیمؓ تم تو بہت عقلمند ہو۔ کیا ترکیب بتائی ہے تم نے!"

سردار خوش ہو کر بولا:

"میں بالکل یہی کروں گا۔ آنے دو ذرا ان کا پیغام!"

نعیمؓ بن مسعود نے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی ہی اس لیے تھی اور ان باتوں سے ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ مشرکین مکہ اور بنو قریظہ میں اتنا زیادہ اختلاف پیدا کر دو کہ بنو قریظہ مدینہ میں مسلمانوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکیں۔

ان کا آدھا منصوبہ تو کامیاب ہو گیا تھا یعنی انہوں نے بنو قریظہ کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اب انہیں ابوسفیان کو اپنے دام میں لانا تھا۔

پس نعیمؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چل پڑے۔



☆

خالہ تو ابنِ حاتم کو دیکھ کر جتنی خوش ہوئیں وہ ایک الگ بات ہے اصل خوشی تو اس کی ملگیتر نوحنا کو ہوئی تھی۔ اس کی تو جیسے مراد بر آئی تھی۔

دو سال پہلے جب ابنِ حاتم اسے چھوڑ کے گیا تھا تو اس نے رو رو کے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ پھر وقت نے اس کا غم ہلکا کر دیا اور اسے صبر آتا گیا۔

نوحنا کی ماں کو بھی ابنِ حاتم کے جانے کا بہت افسوس تھا۔ نوحنا کے لیے ابنِ حاتم سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ نوحنا اور ابنِ حاتم کی منگنی کو شادی میں بدل کے نوحنا کو ابنِ حاتم کے ساتھ ہی مدینہ بھیج دے مگر نعیمؓ بن مسعود اس پہ راضی نہ تھے۔

مکہ اور مدینہ والوں کے درمیان جو کشمکش شروع ہوئی تھی اس نے اب خونی رنگ اختیار کر لیا تھا اور دو جنگیں ہونے کے بعد اب تیسری جنگ جاری تھی۔

نوحنا خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی لیکن جب اس کی ماں نے اسے ابنِ حاتم سے گفتگو کا موقع دیا اور وہ دونوں اکیلے ہوئے تو نوحنا منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

ابنِ حاتم کو نوحنا کے غم کا احساس تھا۔ اس نے اس کا اعتراف کیا اور کہا:

"نوحنا۔ تمہاری خفگی بجا ہے مگر مجبوریوں پہ بھی تو نظر کرو۔ میں اپنے اختیار میں تو نہ تھا"۔

نوحنا نے چہرہ گھما کر اسے دیکھا۔ پھر جیسے سارے گلے، سارے شکوے، ساری شکایتیں تمام ہو گئیں۔ نوحنا مسکرا دی:

اس کے ساتھ ہی سارے گلے شکوے برابر ہو گئے۔

"ابنِ حاتم!" وہ پیار سے بولی۔ مگر اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی:

"تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے"۔

ابنِ حاتم بے چین ہو گیا۔

اس کے پاس نوحنا کی بات کا کوئی جواب نہ تھا، سوائے اپنی مجبوریوں کے۔ اس نے ایک بار پھر انہی کا سہارا لیا۔

"نوحنا، غور کرو۔ میں تم سے کن حالات میں جدا ہوا تھا"۔

وہ بے قراری سے بولا:

"وہ تو چچا نعیمؓ کی مہربانی تھی کہ وہ ہمیں یہاں سے لے گئے ورنہ پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا۔ یہاں ہمارا کوئی سہارا ابھی تو نہ تھا"۔

"یہ بات نہیں ابنِ حاتم!"

نوحنا نے سنبھل کر کہا:

"تمہارے اچانک چلے جانے سے امی اور ابو میں اکثر باتیں ہوتی تھیں۔ ابو کو یہ ملال تھا کہ نعیمؓ چچا نے میرے ابو سے کوئی بات ہی نہیں کی، حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ تمہاری میرے ساتھ منگنی ہو چکی ہے"۔

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے فوراً وضاحت کی:

"چچا کو علم نہ تھا۔ منگنی کی بابت تو میں نے انہیں مکہ پہنچ کے بتایا تھا"۔

نوحنا نے مصنوعی خفگی سے کہا:

"اگر تم نے چچا کو پہلے بتا دیا ہوتا تو شاید وہ مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی مکہ لے جاتے"۔

"ناراض نہ ہو نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے مناتے ہوئے کہا:

"اللہ نے چاہا تو حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر میں تمہیں رخصت کرا کے اپنے گھر لے جاؤں گا"۔ اس نے اسے تسلی دی۔

نوحنا بپھر گئی:

"یہ کیا کہہ رہے ہو ابنِ حاتم۔ کیا تم واپس چلے جاؤ گے۔ میں اب تمہیں مکہ واپس نہ جانے دوں گی!"

"نوحنا۔ نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے خوشامدانہ رویہ اختیار کیا:

"حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ مکہ اور مدینہ میں جنگ ہو رہی ہے۔ قریشِ مکہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ میرا تعلق حملہ آور فوج سے ہے۔ اس صورت میں، میں تمہیں مکہ کیسے لے جا سکوں گا؟"

"ہائے اللہ۔ اب کیا ہوگا"۔

نوحنا کے آنسو چھلک آئے:

"نہیں نہیں ابنِ حاتم۔ اب میں تمہیں واپس نہیں جانے دوں گی۔ تم مجھے مکہ نہیں لے جا سکتے تو میں بھی تمہیں واپس نہ جانے دوں گی"۔

نوحنا کی آواز اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی اس کی ماں نے سن لی اور وہ گھبرا کے ان کے پاس آ گئی۔

یہاں کیفیت یہ تھی کہ نوحنا کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ابنِ حاتم کی کلائی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔

ابنِ حاتم غریب سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے نوحنا؟" ماں نے نرمی سے کہا۔

نوحنا نے سنبھل کے ابنِ حاتم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ماں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں پھر واپس مکہ جاؤں گا"۔

نوحنا نے گلوگیر آواز میں کہا:

"میں انہیں نہیں جانے دوں گی ماں!"

نوحنا کی ماں بھی پریشان ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ نعیم بن مسعود اب مدینہ آ ہی گئے ہیں تو اب یہیں رہیں گے۔

اس خیال سے وہ بہت خوش تھی مگر اس انکشاف سے وہ غیر مطمئن اور افسردہ ہو گئی۔

"بیٹے ابنِ حاتم!"

ماں نے اداسی سے کہا:

"نوحنا یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"خالہ جان ـــ" ابنِ حاتم کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں ہاں بیٹے کہو۔ صاف صاف کہو"۔ ماں نے اسے حوصلہ دیا۔

"خالہ جان ۔ میں نوحنا کو چھوڑ نہیں سکتا"۔

ابنِ حاتم نے جواب دیا :

"حالات ٹھیک ہوتے ہی میں نوحنا کو یا تو وہاں لے جاؤں گا یا میں یہاں آجاؤں گا ۔ اس وقت میں چچا نعیم کے ساتھ آیا ہوں اور انہی کے ساتھ واپس جانا ہوگا"۔

ماں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے مگر میں اس جوان جہان بیٹی کو کب تک اپنے کلیجے سے لگائے لئے بیٹھی رہوں گی"۔

اس نے سنجیدگی سے کہا :

"یہ تو جنگ ہے بیٹے ۔ معلوم نہیں کب تک جاری رہے ۔ تمہاری امانت کو میں اب زیادہ دیر نہیں سنبھال سکتی ۔

جب تمہیں مکہ واپس جانا تھا تو پھر میرے پاس کیوں آئے بیٹے ۔ نوحنا تمہارے انتظار ہی کے سہارے تو زندگی گزار رہی ہے ۔ اب تم چلے گئے تو خدا معلوم اس پر کیا بیتے گی"۔

ابنِ حاتم بھی مغموم ہو گیا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ نوحنا کو ساتھ لے جائے مگر یہ بات اس کے اختیار میں کب تھی ۔ اس کا چچا نعیم ہی کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔

ابنِ حاتم کے پاس نوحنا یا اس کی ماں کو دینے کے لیے کوئی جواب نہ تھا، سوائے اپنی مجبوریوں کا دکھڑا رونے کے اور وہ بار بار "مجبوری" کا نام لے کر ان کا دل بھی دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

ابنِ حاتم کبھی خاموشی سے نوحنا کو دیکھتا تو کبھی اس کی ماں کو ۔ وہ دونوں منہ سے چپ سر جھکائے بیٹھی تھیں ۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ انہیں ابنِ حاتم کی "مجبوری" کا پوری طرح احساس ہو گیا تھا ۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"چچا نعیم آ گئے"۔

ابنِ حاتم کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور اس نے اٹھنا چاہا۔

"تم بیٹھے رہو بیٹے"۔ نوحنا کی ماں اٹھ کھڑی ہوئی :

"میں دیکھتی ہوں کون ہے؟"

نوحنا کی ماں نے دروازہ کھولا تو نعیم بن مسعود کے بجائے نوحنا کے والد داخل ہوئے جو قریب ہی اپنے عزیزوں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔

نوحنا کی ماں انہیں ادھر لانے کے بجائے اپنے کمرے میں لے کر چلی گئیں۔

"ابنِ حاتم آیا ہوا ہے مکے سے"۔ نوحنا کی ماں نے بتایا۔

"اچھا"۔

وہ چونک پڑے :

"اب تو وہ یہیں رہے گا نا؟"

"یہی تو مشکل ہے"۔

نوحنا کی ماں نے پریشانی سے کہا :

"وہ اپنے چچا کے ساتھ آیا ہے اور ان کے ساتھ ہی چلا جائے گا"۔

"نعیم مدینہ میں کتنے دن ٹھہریں گے؟" نوحنا کے والد نے افسردگی سے پوچھا۔

"ٹھہریں گے کہاں؟"

نوحنا کی ماں الجھتے ہوئے بولیں :

"وہ کسی کام سے آئے ہیں ۔ ابنِ حاتم کو یہاں چھوڑ گئے ہیں ۔ واپسی میں ساتھ ہی ۔ ۔ ۔ ۔"

ان کی بات ادھوری رہ گئی ۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی تھی ۔

"میں دیکھتا ہوں کون ہے؟"

نوحنا کے والد اٹھنے لگے تو بیوی نے انہیں روک دیا :

"آپ بیٹھیے ۔ میں جا رہی ہوں ۔ شاید نعیم آئے ہیں"۔

نوحنا کی ماں نے دروازہ کھولا تو نعیم سامنے کھڑے تھے ۔

"ابنِ حاتم کو بھیج دیجیے"۔

نعیم نے جلدی سے کہا :

"ہمیں ابھی واپس جانا ہے"۔

"نعیم میاں ۔ آخر ہم بھی تمہارے عزیز دار ہیں"۔

نوحنا کی ماں نے پیار سے کہا :

"اندر آؤ ۔ دو گھڑی بیٹھو ۔ پھر چلے جانا"۔

نعیم جلدی میں تھے اس لیے اندر آنے سے ہچکچا رہے تھے۔

نوحنا کی ماں پھر بولیں:

"نعیم میاں۔ ہم تمہیں زیادہ دیر نہیں روکیں گے۔ اندر نوحنا کے والد موجود ہیں۔ کیا تم ان سے بھی نہیں ملو گے؟"

نعیم مجبور ہو گئے۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں"۔

وہ اندر آتے ہوئے بولے:

"ضرور ملوں گا ان سے"۔

نعیم، نوحنا کی ماں کے ساتھ برآمدے میں پہنچے تو وہاں ابنِ حاتم، نوحنا اور اس کے والد کھڑے تھے۔ ابنِ حاتم اور نوحنا آواز سن کر باہر آ گئے تھے۔

"السلام علیکم"۔

کہتے ہوئے نعیم بن مسعود، نوحنا کے والد کی طرف بڑھے۔

"وعلیکم السلام"۔

اور نوحنا کے والد نے اپنے بازو کھول دیے۔ نعیم ان سے بغل گیر ہو گئے۔

"اندر چلو نعیم میاں"۔

نوحنا کے والد نے ان کو کمرے میں آنے کی دعوت دی:

"بہت دن کے بعد ملاقات ہوئی ہے"۔

"بھائی جان"۔ نعیم کے قدم آگے نہ بڑھ سکے اور وہ بولے:

"وقت بہت کم ہے۔ ہمیں صبح ہونے سے پہلے پہلے اُحد کی پہاڑیاں پار کر جانا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ملاقات ہو گی بلکہ برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ اس وقت آپ ہمیں معاف کیجیے اور ابنِ حاتم کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ بہت جلد حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر درمیان میں کوئی دیوار نہیں رہے گی۔

نوحنا جیسے آپ کی بیٹی ہے ویسے ہی میری بھی بیٹی ہے۔ میں اسے عزت و احترام کے ساتھ بیاہ کر لے جاؤں گا۔ آپ بالکل مطمئن رہیے"۔

نعیم بن مسعود نے کسی کے بولنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ تمام متوقع سوالوں کے جوابات

خود ہی دیدیے چنانچہ کسی کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

نعیم نے آگے بڑھ کر نوحنا کے سر پہ ہاتھ پھیرا پھر ابن حاتم کے ساتھ باہر آ گئے۔ صبح ہونے سے پہلے یہ دونوں اُحد کی پہاڑیاں پار کر کے اپنے مرکز میں پہنچ گئے۔

یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ بنو غطفان اُحد کی پہاڑیوں کی سمت میں اپنے خیمے لگائے ہوئے تھے اس لیے پہاڑیوں سے اترتے ہی وہ اپنے خیمہ میں پہنچ گئے۔

مشرکینِ مکہ میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

محاصرے کی طوالت نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ غذا کی قلت اور موسم کی شدت کے علاوہ مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی پُراسرار خاموشی نے انہیں طرح طرح کے وسوسوں میں الجھا کے رکھ دیا تھا۔

ابوسفیان بڑی شدت سے نعیم کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ نعیم واپس آ گئے ہیں، اس نے انہیں بلوا بھیجا۔

جس وقت ابوسفیان کا آدمی نعیم کے پاس پہنچا وہ اپنے قبیلے والوں کو واضح اور واشگاف الفاظ میں بتا رہے تھے:

"مدینہ کا بنو قریظہ قبیلہ ہماری کوئی مدد نہیں کرے گا بلکہ وہ تو ہمیں قربانی کا بکرا بنانے کی فکر میں ہیں۔

میں نے ان سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ہم نے جنگ میں غیر جانبدار رہ کر سخت غلطی کی ہے کیونکہ انہیں ہم لوگوں پر کوئی اعتماد نہیں"۔

بنو غطفان کے ایک شخص نے پوچھا:

"مگر ہمیں تو ابوسفیان نے یہی بتایا تھا کہ بنو قریظہ نے ہم سے فوجی مدد کا وعدہ کیا ہے اور جس وقت ہم مدینہ پر باہر سے حملہ کریں گے تو وہ اندر سے فساد پھیلا کر مسلمانوں کو دُہری جنگ میں الجھا دیں گے اب وہ مدد کرنے سے کیوں انکار کر رہے ہیں؟"

نعیم بن مسعود نے جواب دیا:

"میں نے کہہ دیا کہ انہیں ہم پہ اعتماد نہیں"۔

اسی وقت ابوسفیان کا آدمی نعیم کو بلانے آ گیا ـــ اور نعیم بن مسعود اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ابوسفیان کے پاس چلے گئے۔

ابوسفیان کو بنوقریظہ سے بہت امیدیں تھیں مگر نعیم بن مسعود نے اس سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا:

"سردار ابوسفیان۔ آپ نے بنوقریظہ سے غلط امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ انہیں ہم پر کوئی اعتماد نہیں۔ بلکہ ان کا تو یہ خیال ہے کہ اگر ان کے ہاتھ قریش کے کچھ آدمی آ جائیں تو وہ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر کے ان کا اعتماد حاصل کریں تاکہ قریشِ مکہ کی واپسی کے بعد مسلمان انہیں تنگ نہ کریں"۔

"مگر انہوں نے تو فوجی مدد کا وعدہ کیا تھا"۔

ابوسفیان نے بڑی بے بسی سے دریافت کیا:

"اب وہ اس سے کیوں بچنا چاہتے ہیں؟"

"جنگ میں ہر بات اور ہر گھات جائز ہوتی ہے سردار ابوسفیان"۔

نعیم بن مسعود نے کہا:

"ہماری مدد تو ایک طرف رہی، میرا خیال ہے کہ وہ بہت جلد ہمارے کچھ آدمی بطور یرغمال ہم سے طلب کریں گے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

ابوسفیان گھبرا گیا اور بولا:

"ہم کیا اتنے احمق ہیں کہ انہیں اپنے آدمی یرغمال بنانے کے لیے حوالے کر دیں؟"

"اب یہ آپ کی مرضی ہے جیسا چاہیں ویسا کریں"۔

نعیم نے جواب دیا:

"میں نے جو بتایا وہ حرف بحرف درست ہے"۔

ابوسفیان نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا:

"کیا انہوں نے ہماری مدد سے بالکل ہی ہاتھ اٹھا لیا ہے؟"

"منہ سے کوئی انکار نہیں کرتا سردار"۔

نعیم بن مسعود نے کہا: "یہ اندازے تو میں نے ان کی باتوں سے لگائے ہیں۔ مجھ سے تو انہوں نے
ہی کہا ہے کہ ہم تیاری کر رہے ہیں اور جلد ہی کوئی فیصلہ کریں گے!"

نعیمؓ بن مسعود تو یہ جواب دے کر اپنے خیمہ میں آ گئے مگر ابوسفیان کو دن بھر چین نہ پڑا۔ وہ تمام ن پریشان رہا۔

رات ہوتے ہی اس نے اپنا ایک خاص آدمی بنوقریظہ کے پاس بھیجا اور انہیں پیغام دیا کہ:

"اے بنوقریظہ! تم اپنا وعدہ پورا کرو اور جنگ کے لیے تیار ہو کر صبح کو ہمارا ساتھ دو تاکہ ہم باہر سے اور تم اندر سے حملہ کرو اور مسلمانوں کو کچل کے رکھ دیں!"

ابوسفیان کا آدمی رات کے اندھیرے میں بچتا بچاتا بنوقریظہ کے سردار تک پہنچ گیا۔ اسے جو پیغام دیا گیا تھا اس کے الفاظ نرم تھے اور برابری کا انداز تھا مگر قاصد نے بنوقریظہ کے سردار کو جو پیغام پہنچایا اس کے الفاظ یہ تھے:

"اے بنوقریظہ! تم نے ہم سے جنگی تعاون کا عہد کیا تھا۔ اب میدان چھوڑ کے کیوں بھاگ رہے ہو۔
تم اپنا وعدہ پورا کرو اور کل صبح کو جنگ کے لیے اپنے قلعہ سے نکلو۔
ادھر سے ہم مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں اُدھر سے تم مسلمانوں پر چڑھ دوڑو۔
اور انہیں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان کچل کے رکھ دو۔ ہمیں فوراً جوابی پیغام بھیجو"۔

بنوقریظہ والوں کو ابوسفیان کا پیغام بہت ناگوار گزرا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں نعیم بن مسعود کی باتیں بھی یاد آئیں۔

انہوں نے کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کیے۔ پھر اسی قاصد کے ہاتھ جوابی پیغام بھیج دیا جس میں انہوں نے کہا کہ:

"اے قریشِ مکہ کے سردار ابوسفیان! کل ہفتہ کا دن ہے۔ یہ دن ہمارے لیے مبارک دن ہے۔ اس دن ہم عبادت کرتے ہیں جنگ نہیں کرتے۔
تاہم، ہم اپنے اطمینان کے لیے چاہتے ہیں کہ تم اپنے چند سردار یا ان کی اولاد کو ہمارے پاس بطور یرغمال بھیجو تاکہ جنگ کے وقت ان کی وجہ سے ہمیں تمہاری امداد کا یقین رہے!"

مشرکینِ مکہ کا قاصد جب یہ پیغام لے کر واپس آیا تو ابوسفیان کو یقین ہو گیا کہ نعیم بن مسعود نے اس سے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست ہے اور یہودی واقعی ان کی مدد کرنے کے بجائے ہمارے آدمیوں کے بدلے مسلمانوں سے صلح صفائی کرنا چاہتے ہیں۔

اس طرح مشرکینِ مکہ اور بنو قریظہ میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کا باہمی اتحاد ٹوٹ گیا۔

مدینہ پر حملہ آور مشرکینِ مکہ کی، مسلمانوں کے سخت مدافعتی انتظامات جن میں خندق کھود کر حصار پیدا کرنا تھا، ہمتیں پست کر دی تھیں اس پر گوناگوں مشکلات، مخالف موسم، سردی کی شدت، سرمایہ کی کمی، رسد کی قلت اور مختلف عرب قبائل کے مخالف دعوؤں نے ان میں آپس کے جھگڑے کھڑے کر دیے تھے۔

ادھر ذوالحجہ کا مہینہ سر پر کھڑا تھا۔

قریشِ مکہ ان دنوں میں مہمان نوازی کے فرائض ادا کرتے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ بنو قریظہ کا جنگ سے الگ ہو جانا تھا۔ مشرکین کی تعداد اگرچہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تین گنا سے بھی زیادہ تھی لیکن ان کی ایک نہ چل رہی تھی۔

خالد بن ولید نے اپنے دستوں کے ساتھ بارہا خندق کو پار کرنے کی کوشش کی مگر جنگِ اُحد کے موقع پر مسلمانوں سے جو غلطی ہوئی تھی اسے دہرانے پر مسلمان کسی طور تیار نہ تھے اس لیے خالد کی جان بازی اور سپہ گری دھری کی دھری رہ گئی اور مسلمانوں نے اسے خندق میں اترنے کا ایک بھی موقع نہ دیا۔

دشمنانِ اسلام پہلے ہی بدحواس ہو رہے تھے کہ ان پر ایک آسمانی مصیبت نازل ہو گئی۔

ایک رات باد و باراں کا ایسا سخت طوفان اٹھا کہ میدانِ جنگ الٹ پلٹ ہو گیا۔ خیمے اکھڑ گئے۔ سامانِ خورد و نوش میں مٹی بھر گئی۔

بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ اس پر سردی کی شدت اور پانی کی بوچھاریں۔ لوگ بدحواس ہو گئے۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

دشمن ہر طرف سے مایوس تو ہو ہی چکا تھا۔ اب اس پر خوف دہراس بھی طاری ہو گیا۔ اندیشے اور وسوسے اسے گھیر کر بیٹھ گئے۔

ابوسفیان ایسا بدحواس ہوا کہ اس نے فوراً جلسہ کیا اور اس میں سرداروں سے کہا:

"ایک طرف تو بنو قریظہ نے ہمیں دھوکہ دیا۔ دوسری طرف ہوا اور سردی ہماری مخالف ہو گئی۔ بارش نے بھی طوفان اٹھا رکھا ہے۔ میں تو واپس جا رہا ہوں۔ تم لوگ بھی اپنا انتظام کر لو اور واپس لوٹ جاؤ۔ یہی اس وقت بہتر ہے۔"

یہ کہہ کے ابوسفیان سیدھا اپنے اونٹ کے پاس پہنچا۔ اونٹ کے گھٹنے بندھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان نے بوکھلاہٹ میں اسے مارنا شروع کر دیا۔ اونٹ بے چارہ کس طرح اٹھتا۔ وہ مار کھاتا رہا اور اذیت سے بلبلاتا رہا۔

ایک آدمی کی نظر اونٹ کے پیروں پر پڑی تو اس نے اس کی رسیاں کاٹیں۔ تب اونٹ بے چارہ اٹھنے کے قابل ہوا۔

یوں قریشِ مکہ جو بڑے زور و شور سے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے وہ ناکام و نامراد واپس لوٹ گئے اور اس طرح حیاتِ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دشمنانِ اسلام کا مدینہ منورہ پر آخری حملہ ناکام ہو گیا۔ قریش کے جاتے ہی بنو غطفان بھی چپ چاپ واپس ہو گئے۔

مشرکینِ مکہ اس قدر افراتفری میں میدان سے بھاگے تھے کہ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا تھا۔ اس وقت ابوسفیان نے خالد بن ولید اور عمرو بن العاص سے یہ درخواست کی تھی کہ:

"تم دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ ہمارے پیچھے پیچھے چلو تاکہ اگر مسلمان خندق سے نکل کر ہم پر عقب سے حملہ کرنے کی کوشش کریں تو تم ہماری حفاظت کر سکو۔"

چنانچہ خالد بن ولید اپنے دو سو سواروں کے ساتھ بطور "ساقہ" لشکرِ مشرکین کے پیچھے چلتا رہا تاکہ خطرے کی صورت میں مقابلہ کر سکے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرکین کو خالد پر کس قدر بھروسہ اور اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ میدان میں اگر نتیجہ حاصل ہو سکتی تو اس کے لیے بھی خالد کی خدمات انتہائی ضروری ہیں اور اگر وہ خطرات اور مصائب میں گھر جائیں تو بھی انہیں جو شخص بچا سکتا ہے وہ خالد اور صرف خالد بن ولید ہے۔

خالد بن ولید کا اس قدر اہم اور پرخطر ذمے داری کو قبول کر لینا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ خود خالد کو اپنے اوپر بے پناہ اعتماد تھا اور وہ بلا خوف و خطر اپنے آپ کو مشکل میں ڈال دیتے تھے۔

خالد کا یہی جذبۂ اعتماد ان کی آئندہ پوری زندگی میں ساری و طاری اور جاری نظر آتا ہے!

پس غزوہ خندق میں غیبی امداد نے جس طرح مشرکینِ مکہ کے منہ پھیرے تھے اس کے بارے میں قرآنِ حکیم نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

"اے ایمان والو!
اپنے حق میں اللہ کی اس نعمت کا تصور کرو جب تمہارے خلاف لشکر جمع
ہوئے اور ہم نے ان کے خلاف آندھی بھیجی اور وہ غیبی لشکر بھیجے جن کو تم
دیکھ نہیں سکتے تھے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ دیکھنے والا ہے!"

(الاحزاب)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"اب قریش کی لڑائیاں ختم ہو گئیں۔ اب آیندہ ہم ان پر چڑھائی کریں گے"۔

یعنی مشرکینِ مکہ اپنی طاقت بدر و اُحد میں آزما چکے تھے اور اس دفعہ انھوں نے عرب بھر کے تمام مخالفینِ اسلام کو جمع کر کے حملہ کیا تھا سو وہ بھی ناکام ہو گیا۔

اب جبکہ اپنی طاقت کو دوبارہ اکٹھا کرنا ممکن نہیں تو مشرکین کس طرح دوبارہ کوئی جنگ کر سکتے ہیں کیونکہ آیندہ کے معرکے اس سے بھی سخت ہوں گے؛

اس معرکہ میں بہت کم جانی نقصان ہوا۔

اسلامی لشکر کا نقصان تو برائے نام ہی تھا۔ حملہ کے دوران صرف چھ مسلمان شہید ہوئے جن میں سعدؓ بن معاذؓ جیسی عظیم شخصیت بھی تھی۔ انہیں تیر کا زخم آیا تھا اور ان کا غزوہ بنو قریظہ کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔

مشرکین کی طرف سے عمرو بن عبدود مارا گیا جو ایک ہزار سواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اسے حضرت علیؓ نے جہنم رسید کیا۔

حضرت عائشہؓ کے ایک قول کے مطابق مندرجہ ذیل آیت بھی غزوہ خندق کے بارے میں نازل ہوئی:

"اور جب چڑھ آئے (مشرکین) تم پر اوپر کی جانب سے اور نیچے کی جانب
سے اور پھر گئیں (دہشت کی وجہ سے) آنکھیں اور پہنچ گئے دل گلوں تک،
(کلیجے منہ کو آ گئے)"۔





سنہ ۶ ہجری مطابق فروری ۶۲۸ء۔ ماہ ذی قعد بروز دوشنبہ سرورِ کائنات اور لشکرِ اسلام
ے سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے چودہ سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے
ادہ سے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔

جب آپ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو قربانی کے جانوروں کو قلادہ ڈالا اور احرام باندھا۔ پھر بنی خزاعہ
ے ایک آدمی کو جاسوس بنا کر مکہ روانہ کیا کہ وہ قریشِ مکہ کے حالات معلوم کر کے واپس آئے۔

سرورِ دو عالمؐ جب غدیر اشطاط کے مقام پر پہنچے تو جاسوس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ قریشِ مکہ کو مسلمانوں کے آنے کی اطلاع ہو چکی ہے۔ وہ قبائل کو جمع کر رہے ہیں تاکہ جنگ کی جائے اور آپؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔

انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم تو زیارتِ کعبہ کی غرض سے نکلے ہیں اور ہمارا مقصد صرف عمرہ ادا کرنا ہے۔ جنگ و جدل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں اس لیے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے اور اگر کوئی خواہ مخواہ سدِ راہ ہو تو پھر ہمیں مجبوراً جنگ کرنا ہو گی۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"اب خدا کا نام لے کر بڑھے چلو"۔

زائرینِ بیت اللہ، عشقِ الٰہی میں چور اور زیارتِ بیت اللہ کے خیال سے مسرور آگے بڑھ رہے تھے

کہ ایک مقام پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یکایک رک گئے اور فرمایا :

"خالد بن ولید ایک فوجی دستہ لیے عمیم کے مقام پر گھات لگائے بیٹھا ہے اور ہمارے انتظار میں ہے اس لیے مناسب ہے کہ ہم کاوا کاٹ کر دائیں جانب سے چلیں اور بے خبری میں اس کے سر پر پہنچ کے اس کے حملہ کو ناکام بنا دیں"۔

پس ! ایسا ہی کیا گیا۔ اور مسلمان زائرین نے اچانک خالد بن ولید کے سامنے پہنچ کر اسے حیران کر دیا۔

خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ مدینہ والوں کی خبر لینے کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ سب گھات لگائے بیٹھے تھے۔

مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کے گھات میں ہونے کی اطلاع مل گئی اور مسلمان اس کے اچانک حملہ سے محفوظ رہے۔

خالد بن ولید نے راستہ تو چھوڑ دیا مگر وہ ساتھ ساتھ لگا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ مسلمان سفر و حضر میں نماز ضرور پڑھتے ہیں چنانچہ وہ اس انتظار میں تھا کہ جب مسلمان نماز میں مصروف ہوں تو ان پر حملہ کر کے ان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔ تاہم اسے اس ارادے میں بھی ناکامی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس منصوبے سے آگاہ کر دیا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت صلاۃِ خوف[1] کا حکم دیدیا۔

اپنی اس کوشش میں بھی ناکام ہونے کے بعد خالد مکہ واپس لوٹ گیا۔

اس موقع پر جنگ نہ ہوئی اور مسلمانانِ مدینہ اور قریشِ مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ ہو گئی۔ حدیبیہ مکہ سے جدہ کی جانب ایک منزل پر واقع ہے اور آجکل شمیسیہ کے نام سے مشہور ہے۔

حدیبیہ دراصل ایک کنوئیں کا نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے "فتحِ مبین" اور "بیعتِ رضوان" کی مقدس تاریخ وابستہ ہے۔

"فتحِ مبین" کے بارے میں حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ :

"اس سے مراد فتحِ خیبر ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آئی تھی اور جس میں

---

[1] یعنی ایک دستہ نماز پڑھے اور دوسرا دستہ پہرے داری کرے۔ یہی صلاۃِ خوف مسلمانوں کی آیندہ تمام جنگوں میں جاری رہی۔

مسلمانوں کے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت آیا تھا"۔

بیعتِ رضوان کا واقعہ اس طرح تھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنابِ عثمانِ غنی رض کو قریشِ مکہ سے گفتگو کے لیے بھیجا تھا مگر مکہ والوں نے انہیں روک لیا اور خبر مشہور ہو گئی کہ انہیں شہید کر دیا گیا ہے۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے بیعت لی تھی کہ وہ مر جائیں گے مگر راہِ فرار اختیار نہ کریں گے !

اس بیعت کی خبر جب مکہ والوں تک پہنچی تو وہ گھبرا گئے اور انہوں نے فوراً مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ حضرت عثمان رض زندہ ہیں اور واپس آ رہے ہیں۔

یہ بیعت جہاد کے بہت ہی اہم موقع پر لی گئی تھی اور مسلمانوں نے پورے جوش و ولولہ سے اس بیعت میں حصہ لیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فداکاری اور جذبۂ ایثار کی قدر افزائی کی اور سورۂ فتح میں اپنی خوشنودی اور رضا کا پروانۂ رحمت نازل کر کے اس واقعہ کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اسلامی تاریخ میں اسے "بیعتِ رضوان" کا نام دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"بلاشبہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر اس
درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے اور جان لیا اللہ نے جو اُن کے جی میں تھا۔
پس اتارا اُن پر اطمینان اور سکون اور انعام میں دیا ان کو ایک فتحِ قریب!"
(الفتح)

صلح حدیبیہ یا بیعتِ رضوان سے چونکہ خالد بن ولید کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں اس لیے ہم اس کے تفصیلی ذکر سے قطع نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

دوسرے سال عمرۃ القضا کے موقع پر خالد بن ولید پھر نظر آتا ہے۔

صلح حدیبیہ میں یہ طے پا گیا تھا کہ مسلمان اس سال عمرہ ادا نہ کر سکیں گے بلکہ اگلے سال وہ عمرہ کے لیے اس انداز سے آئیں گے کہ ان کے پاس معمولی ہتھیار حفاظتِ خود اختیاری کے لیے ہوں گے۔ تلواریں نیام میں رہیں گی۔

خالد بن ولید کو اس زمانہ میں مسلمانوں اور اسلام سے اس درجہ پر خارش ہو گئی تھی کہ جب دوسرے سال

مسلمان معاہدہ کے مطابق عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے مکہ میں داخل ہوئے تو خالد بن ولید مکہ سے باہر چلا گیا کیونکہ وہ یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ مسلمان اس کی نظروں کے سامنے مکہ میں داخل ہوں۔ حالانکہ مکہ معظمہ مسلمانوں کے لیے بھی اتنا ہی قابلِ احترام تھا جتنا قریش مکہ کے لیے۔

پھر یہ کہ اس کے لیے ایک سال پہلے باقاعدہ معاہدہ بھی ہُوا تھا اور مدینہ سے عمرہ کرنے کے لیے آنے والے بہت سے مسلمان نہ صرف قریش تھے بلکہ بعض تو خاص خالد بن ولید کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی عقیدت کی پختگی نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

خالد بن ولید شرک کی حالت میں اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کے شدید دشمن تھے لیکن عقیدے کی یہی پختگی جو مسلمانوں سے شدید عداوت کا باعث تھی آگے چل کر اخلاص اور ان کے کارہائے نمایاں کی بنیاد بنی جو اسلام لانے کے بعد انہوں نے اسلام کی نصرت و سربلندی کے لیے انجام دیے۔

یہاں پہنچ کر دراصل خالد بن ولید کی زندگی کا ایک دور ختم ہوتا ہے یعنی اس وقت تک خالد بن ولید مسلمانوں اور اسلام کے شدید دشمنوں میں شامل تھے اور انہوں نے اپنی جوانمردی اور بیدار مغزی سے مسلمانوں کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور اُحد کے میدان میں وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر ان کی اسلام سے شدید نفرت جب اسلام لانے کے بعد اتنی ہی شدید محبت میں تبدیل ہوئی تو انہوں نے ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے جنہیں پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

خالد بن ولید کے اسلام لانے کے بارے میں مؤرخین میں بڑا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔
۵ھ سے ۸ھ تک ان کے اسلام لانے کا سن بیان کیا گیا ہے۔ پانچ اور چھ ہجری کے بارے میں تو کوئی شہادت نہیں ملتی مگر ۸ ہجری میں فتح مکہ سے چھ ماہ قبل اور غزوۂ موتہ سے صرف دو ماہ قبل ان کے اسلام لانے کے بارے میں عقلی امور اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔

اس سلسلے میں ابن سعدؓ نے خود خالد بن ولیدؓ کا ایک قول پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ہم دونوں (خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یکم صفر ۸ ہجری کو حاضر ہوئے۔"

بلاذری کہتے ہیں:

"عمرو بن العاصؓ نجاشی کے پاس سے مسلمان ہو کر لوٹے تو راستہ میں انہیں عثمان بن طلحہؓ اور خالد بن ولیدؓ ملے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ چنانچہ یہ تینوں صفر ۸ ہجری میں رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔"

ابن قتیبہ اور طبری کا بھی یہی قول ہے۔

ابن عساکر، واقدی کا قول نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"ہمارے نزدیک یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ خالدؓ غزوۂ خیبر میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ عمرو بن العاصؓ اور عثمان بن طلحہؓ تینوں فتح مکہ سے قبل ۸ھ میں اسلام لائے تھے۔"

یہ اور ایسے بہت سے بیانات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خالد بن ولیدؓ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور وہ غزوہ جس میں خالد بن ولیدؓ نے بحیثیت ایک مسلمان کے حصہ لیا، غزوہ موتہ تھا!

اس دوران قریشی سردار نعیم بن مسعود کے بھتیجے ابنِ حاتم اور اس کی منگیتر نوحنا کے حالات کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہو گئے۔

جنگِ خندق کے اختتام پر ابنِ حاتم چچا کے ساتھ مکہ واپس آ گیا تھا۔ اس نے تو کچھ صبر کر لیا اور فرقت کے دن کسی نہ کسی طرح گزارتا رہا مگر نوحنا ایک نوخیز دوشیزہ تھی۔ اس نے ابنِ حاتم کو تقریباً بھلا دیا تھا مگر اچانک دو سال کے بعد ابنِ حاتم مکہ سے مدینہ پہنچا اور نوحنا نے اسے اپنے قریب پایا تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور ابنِ حاتم کے واپس جاتے ہی اس کے غم میں شدید بیمار ہو گئی۔

اس کے والدین کو پہلے تو یہ خیال ہُوا کہ نوحنا کسی معمولی بیماری کا شکار ہوئی ہے اور جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی اس لیے انہوں نے زیادہ فکر نہ کی مگر جب نوحنا کی بیماری بڑھتے بڑھتے اسے بالکل ہی صاحبِ فراش کر گئی تو اُن کی آنکھیں کھلیں۔

اب انہوں نے ادھر ادھر بھاگ دوڑ شروع کی۔ اچھے سے اچھے طبیب کو دکھایا گیا مگر ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ نوحنا کو کوئی عام مرض نہیں ہے بلکہ وہ مرضِ عشق میں مبتلا ہے۔ کم گو اور حیادار نوحنا اپنی زبان نہ کھولتی تھی اور اس کے والدین اس کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ دیکھ کر دن رات کڑھتے رہتے تھے مگر نوحنا کا مرض جوں کا توں تھا۔

قدرت کو نوحنا کی زندگی بچانا مقصود تھی اس لیے اس نے نوحنا کی سہیلی صفورا کو اس کے پاس بھیج دیا۔

صفورا، نوحنا کی بچپن کی سہیلی تھی اور وہ ایک سال پہلے اپنے چچا کے گھر بیاہ کے جدہ چلی گئی تھی۔ اب ایک سال بعد واپس آئی تو نوحنا کی بیماری کا سن کر فوراً ملنے چلی آئی۔

نوحنا کی حالت دیکھ کر صفورا دھک سے رہ گئی۔

وہ تو چارپائی سے لگ گئی تھی اور سوکھ کے کانٹا ہو گئی تھی۔ صفورا کو دیکھ کر جیسے اسکے صبر کا بت ٹوٹ گیا۔ وہ اس کے گلے لگ کر اتنا روئی کہ اس کے ساتھ پورا گھر رونے لگا۔

تجربہ کار صفورا نے نوحنا کا مرض پا لیا۔

رو دھو کے نوحنا کا دل کچھ ہلکا ہوا تو صفورا نے اس کے والدین کو دوسرے کمرے میں بھیج کے نوحنا سے بات شروع کی۔

اس نے بڑے سخت لہجہ میں پوچھا؛

"سچ بتا نوحنا۔ وہ ظالم کون ہے جس نے تیرا یہ حال بنایا ہے؟"

نوحنا کی آنکھیں پھر اشک بار ہو گئیں اور وہ صفورا کے گلے لگ کر پھر سے رونے لگی۔ صفورا نے اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا اور بولی:

"رونا دھونا بند کر اور مجھے ٹھیک ٹھیک بتا وہ کون ہے؟"

نوحنا کچھ نہ چھپا سکی۔

"اس کا نام ابن حاتم ہے"۔

اس نے صفورا کو بتایا:

"اور میری خالہ کا بیٹا ہے"۔

"کیا اس نے تجھے چھوڑ کے کسی اور سے شادی کر لی ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے صفورا"۔

نوحنا نے جواب دیا:

"اس سے میری منگنی ہوئی ہے اور اس نے اب تک منگنی نہیں توڑی"۔

"پھر کیا جھگڑا ہے؟" صفورا نے پوچھا:

"وہ خود نہیں لے جانا چاہتا یا تیرے والدین وہاں شادی کرنے پر راضی نہیں رہے؟"

"یہ بات بھی نہیں ہے"۔

نوحنا نے جواب دیا:

"وہ مکہ میں رہتا ہے اور میں یہاں ہوں۔ پھر شادی کیسے ہو؟"

بات سوچنے والی تھی۔ صفورا بھی سوچ میں پڑ گئی۔

پھر اس نے پوچھا؛

"کیا تیرا وہ مسلمان ہو گیا ہے؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں"۔

نوحنا کو واقعی اس بارے میں کچھ علم نہ تھا اور نہ آخری ملاقات میں اس نے ابن حاتم سے اس بارے میں کوئی گفتگو کی تھی۔

صفورا نے دوسرا سوال کیا:

"تیری اس سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"غزوۂ خندق کے زمانے میں"۔

نوحنا نے بتایا:

"ابن حاتم قریش مکہ کے لشکر کے ساتھ جنگ پر آیا تھا اور ایک رات چھپتے چھپاتے مجھ سے ملنے بھی آیا تھا"۔

نوحنا سے گفتگو کے بعد صفورا اٹھی اور اس کے والدین کے پاس پہنچی۔ وہ جاتے ہی ان پر برس پڑی۔

"خالہ جان۔ خالو جان! آپ نے نوحنا کو موت کے منہ میں پہنچا دیا اور اب بھی آپ لوگ اس قدر اطمینان سے بیٹھے ہیں"۔

نوحنا کے والد گھبرا گئے۔

"صفورا بیٹی!"

انہوں نے خوف زدہ لہجے میں کہا:

"پورے مدینہ کا کوئی ایسا طبیب نہیں ہے جس کا میں نے علاج نہ کرایا ہو۔ مگر اب یہ میری تقدیر کہ نوحنا کو کسی کی دوا نہیں لگتی"۔

"خالو جان آپ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں"۔

صفورا کا لہجہ پہلے جیسا ہی سخت اور ترش تھا:

"نوحنا جوان ہے۔ آپ اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟"

"مجھے کیا انکار ہے بیٹی!"

انہوں نے جواب دیا:

"منگنی تو ہو ہی چکی ہے۔ یہ اچھی ہو جائے تو رخصتی کر دیں گے۔"

"واہ خالو جان۔ آپ اس کے اچھے ہونے کا انتظار کرتے رہیں گے اور یہ اسی طرح جلتی کڑھتی قبر میں پہنچ جائے گی۔"

صفورا کو غصہ آ گیا تھا:

"خدا کے لیے اس پر رحم کیجیے اور کسی کو بھیج کر مکہ سے فوراً ابنِ حاتم کو بلوائیے ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

ابنِ حاتم کے نام پر نوحنا کی ماں چونکی۔

"میں کیوں بلواؤں اسے؟"

وہ قدرے سخت لہجے میں بولی:

"کیا وہ خود نہیں آ سکتا۔ کسی نے روکا ہے اسے؟"

بات معقول تھی۔ صفورا سوچنے لگی۔ پھر اک دم بولی:

"خالہ جان۔ آپ نے ابنِ حاتم کو خبر کی ہے کہ نوحنا بستر سے لگ گئی ہے؟"

صفورا کا سوال بڑا سخت تھا۔ نوحنا کی ماں لاجواب ہو گئی۔

"بیٹی۔ میں کس کو بھیجوں؟"

وہ پژمردگی سے بولی:

"گھر میں نوحنا کے باپ کے سوا کون ہے جو مدینہ جائے!"

"آپ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا دکھ بیان کرنا چاہیے تھا۔" صفورا نے انہیں مشورہ دیا۔

پھر خود ہی اس مسئلے کا حل پیش کیا اور بولی:

"میں اپنے میاں سے کہہ کے کسی کو مکہ بھجواتی ہوں۔ دیکھیں ابنِ حاتم کیا کہتا ہے!"

"وہ بہت نیک بچہ ہے بیٹی!"

نوحنا کی ماں کہاں تو ابنِ حاتم کے خلاف ہو رہی تھیں اور کہاں ایک دم نرم پڑ گئیں:

"وہ سنے گا تو دوڑا چلا آئے گا۔"

صفورا تھوڑی دیر اور ٹھہری۔ پھر نوحنا کو تسلیاں دے کر اپنے گھر آ گئی۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ صفورا کا شوہر ابنِ حاتم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی کاہن کے پاس پڑھنے جاتے تھے۔

صفورا نے اپنے شوہر کو نوحنا کی اصل بیماری کا حال بتایا تو وہ بے چین ہو گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد مکہ جانے والے کسی آدمی کے ہاتھ ابنِ حاتم کو پیغام بھجوائے گا۔



قریشِ مکہ اور سپہ سالارِ اعظم نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین جو معاہدہ طے پایا اس میں درج ذیل دفعات شامل تھیں:

۱۔ اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں گے۔

۲۔ آئندہ سال مکہ میں بغرضِ عمرہ اس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو گا۔
تلواریں نیام کے اندر رہیں گی۔
مسلمان صرف تین دن مکہ میں رہیں گے۔ اس دوران اہلِ مکہ پہاڑوں پر چلے جائیں گے۔

۳۔ معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن و عافیت کے ساتھ آمد و رفت جاری رہے گی۔

۴۔ اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے گا تو اس کو مکہ واپس بھیجا جائے گا اور اگر مدینہ سے کوئی شخص بھاگ کر مکہ آئے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔

۵۔ تمام عرب قبائل آزاد ہیں کہ ہر دو فریقین میں سے جو جس کا حلیف بننا چاہے اس کا حلیف بن جائے۔

۶۔ یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہے گا اور کوئی فریق اس مدت میں اس کی

خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

معاہدہ کی تحریر لکھتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنے پر سہیل نے اعتراض کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ہے تو یہ واقعہ اور حقیقت، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ ہمیں صلح مقصود ہے۔ اس لیے اگر تم پسند نہیں کرتے تو ہم اصرار نہیں کرتے۔"

یہ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاتبِ معاہدہ سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ کو حکم دیا کہ وہ ان الفاظ کو محو کر دیں۔

مگر جناب علیؓ کے لیے یہ کب ممکن تھا کہ وہ "رسول اللہ" کے الفاظ کو اپنے ہاتھ سے قلم زد کر دیں، جن الفاظ کی شمولیت نے ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر کے ظلمت کے نور سے شرک کو ایمان سے اور جہل کو علم سے بدل ڈالا تھا۔

نبی کریمؐ نے محسوس کیا کہ جنابِ علی مرتضیٰؓ اس حکم کی تعمیل سے ہچکچا رہے ہیں تو آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے ان الفاظ کو محو کر دیا۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد مسلمانوں نے محسوس کیا کہ معاہدہ کی بعض شرائط میں ان کا پہلو کمزور رہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے دب کر معاہدہ کیا ہے۔

حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے حضورِ اقدسؐ میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ! کیا یہ حدیبیہ کا واقعہ فتح ہے؟"

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"قسم بخدا۔ بلاشبہ یہ فتح ہے"۔[1]

بعض دفعات کی وجہ سے یہ معاہدہ بظاہر مسلمانوں کی شکست اور کمزوری کا باعث نظر آتا تھا مگر اس کی حقیقت اور دور رس نتائج کا علم نبی پاکؐ کو تھا۔

حضورِ اکرم نے خود تو اس وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کی مگر جلیل القدر محدثین نے اسے فتح مبین ثابت کرنے کے لیے بہت سے دلائل دیے ہیں۔

۱۔ فتح الباری

چنانچہ امام حدیث وسیرت زہریؒ فرماتے ہیں:

"اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی "فتح عظیم" صلح حدیبیہ ہے کیونکہ اس سے پہلے کفار و مشرکین سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا پھر جب یہ صلح عمل میں آ گئی تو دونوں فریقوں کو اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا۔ تبادلہ خیالات کی آزادی میسر ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اسلام کو اپنی عقلِ صحیح سے جانچتا اُس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا کہ وہ فوراً اسلام قبول کر لے۔

پس!

ان دو سال کے درمیان (جب تک دونوں طرف سے معاہدہ کی پابندی کی گئی) اس قدر لوگ مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل کی پوری مدت میں اس سے بھی کم مسلمان ہوئے تھے۔"



صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ابن حاتم کو مدینہ سے یہ پیغام پہنچا کہ نوحہ سخت بیمار ہے۔ اگر اس کی صورت دیکھنا ہو تو فوراً پہنچو۔

یہ پیغام سفوراء کے شوہر نے کسی ذریعہ سے اس کو بھجوایا تھا۔ ابنِ حاتم یہ پیغام پا کر سیدھا اپنے چچا نعیم بن مسعود اشجعی کے پاس پہنچا۔

"چچا جان!"

اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا:

"نوحہ کی طبیعت بہت خراب ہے"۔

نعیم پہلے تو کچھ نہ سمجھ سکے مگر جب انہوں نے ابنِ حاتم کی حالت دیکھی تو انہیں فوراً یاد آ گیا کہ نوحہ اس کی منگیتر ہے۔

انہوں نے نرمی سے پوچھا:

"پھر کیا چاہتے ہو ابنِ حاتم؟"

"میں مدینہ جا رہا ہوں چچا جان"۔ ابنِ حاتم نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

نعیم بن مسعود کو اس کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ انہوں نے کہا:

"جب تم جانے پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو تو پھر مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

چچا کے تلخ لہجے سے ابنِ حاتم کے سر سے جذبات کا نشہ اتر گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنا مقصد بیان کرنے کے لیے غلط انداز اور غلط الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

پس اس نے معذرت پیش کی:

"چچا جان مجھے معاف کر دیجیے۔ میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ نوخا قریب المرگ ہے مجھے اس کی صورت دیکھنے کو بلایا گیا ہے"۔

نعیم بن مسعود نے اس کی معذرت دل ہی دل میں قبول کر لی۔

"یہ بات ہے تو میں تمہیں نہیں روکوں گا"۔

انہوں نے حلاوت سے کہا:

"لیکن اس کی اطلاع مجھے سردار ابوسفیان کو پیشگی دینا پڑے گی ورنہ صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت تمہیں مدینہ سے فوراً واپس بھیج دیا جائے گا"۔

"پھر میں کیا کروں چچا جان"۔ ابنِ حاتم بے بسی سے بولا۔

"مجھے سوچنے دو ابنِ حاتم"۔

نعیم کو بھتیجے پر ترس آ گیا۔

وہ کچھ دیر کچھ سوچتے رہے۔ پھر قلم دوات منگا کر انہوں نے ابوسفیان کے نام ایک خط لکھا جس کی تحریر یہ تھی:

قریش کے سپہ سالار ابوسفیان کے نام!

حامل رقعہ ہذا میرا سگا بھتیجا ابنِ حاتم ہے۔ بچپن میں اس کی منگنی اس کی خالہ کی بیٹی سے ہو گئی تھی جو اس وقت مدینہ میں ہے۔

اس وقت مدینہ سے اطلاع آئی ہے کہ ابنِ حاتم کی منگیتر کی حالت بہت خراب ہے اور کسی وقت بھی اس کے جسم و جان کا رشتہ منقطع ہو سکتا ہے۔

میری خواہش ہے کہ ان حالات کے تحت ابنِ حاتم کو صرف ایک ہفتہ کیلیے مدینہ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس کی واپسی کا میں ذمہ دار ہوں"۔

نیچے دستخط کر کے یہ خط نعیم بن مسعود نے ابنِ حاتم کو دیا اور کہا:

"تم خود یہ خط لے کر ابوسفیان کے پاس چلے جاؤ اور اگر وہ کوئی سوال جواب کرے تو اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرنا"۔

ابنِ حاتم کے دل میں تو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ وہ اسی وقت سوار ہُوا اور بڑی تیز رفتاری سے سردار ابوسفیان کی طرف روانہ ہُوا۔

نعیم بن مسعود اشجعی قبیلہ بنوغطفان کے ایک بااثر سردار تھے۔ ابوسفیان اس بڑے اور بااثر قبیلے کی قدر کرتا تھا۔

نعیم بن مسعود اگرچہ مسلمان ہو چکے تھے مگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں روک دیا تھا کہ ابھی وہ اپنے اسلام لانے کا اعلان نہ کریں تاکہ وہ مکہ میں رہ کر وہاں پھنسے ہوئے غریب اور بے بس مسلمانوں پر ظلم کرنے سے ابوسفیان اور دوسرے سرکردہ لوگوں کو باز رکھ سکیں۔

نعیم بن مسعود اس کام میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے کئی مسلمانوں کے ظلم و ستم اور سزاؤں میں کمی کروا دی تھی۔

ابنِ حاتم، سردار ابوسفیان کے ڈیرے پر پہنچا تو قریش کے بہت سے سردار وہاں مجمع لگائے بیٹھے تھے۔ صلح حدیبیہ کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کی جنگی تیاریوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کوچہ و بازار میں رونق تھی اور لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

ابنِ حاتم، سردار کے ڈیرے کے سامنے گھوڑے سے اترنے لگا تو دو سوار تیزی سے گھوڑا بڑھا کر اس کے پاس آ گئے۔

"اے لڑکے۔ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" ایک سوار نے گھوڑے سے کود کر سوال کیا۔

"میرا نام ابنِ حاتم ہے"۔

ابنِ حاتم نے ملائمت سے جواب دیا:

"میں غطفان کے معزز سردار نعیم بن مسعود اشجعی کا بھتیجا ہوں"۔

"اچھا اچھا۔ تمہارا تعلق بنوغطفان سے ہے۔" وہ دونوں نرم پڑ گئے۔

"ہاں"۔ ابنِ حاتم نے کہا:

"مجھے سردار ابوسفیان تک سردار نعیم بن مسعود کا ایک خط پہنچانا ہے"۔

اس نے ان کا لہجہ نظر انداز کر دیا۔ پھر ان کی جانب دیکھ کر پوچھا:

"کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

"ضرور، ضرور۔"

دونوں نے جواب دیا:

"سردار ابوسفیان ہمارے آقا ہیں۔ ہمارا تعلق ان کے محافظ دستے سے ہے۔"

ان میں سے ایک نے ابنِ حاتم کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور دوسرا اس کے آگے آگے مناسب فاصلے سے چلنے لگا۔

رؤسائے عرب عام طور سے دُہری حویلیاں بناتے ہیں۔ اگلا حصہ مہمان خانے کے کام آتا اور پچھلا حصہ زنانخانہ ہوتا تھا۔

مہمان خانہ کے احاطے میں اس قدر جگہ ہوتی تھی کہ بیک وقت وہاں پچاس پچاس گھوڑے باندھے جا سکتے تھے اور پھر بھی جگہ باقی رہ جاتی تھی۔

ابوسفیان کا محافظ ابنِ حاتم کو چھوڑ کر مہمان خانے کے دروازے میں داخل ہوا۔ یہ ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جس میں سو سے زیادہ کے بیٹھنے کی نشستیں تھیں۔

محافظ نے اندر پہنچ کے ابوسفیان کو اطلاع دی:

"بنوغطفان کے سردار نعیم بن مسعود اشجعی کا قاصد خط لے کر آیا ہے۔"

محافظ نے اتنی زور سے کہا کہ تمام حاضرین چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ابوسفیان نے محافظ کو حکم دیا:

"قاصد کو عزت سے اندر لاؤ۔"

محافظ باہر آیا اور ابنِ حاتم کو ساتھ لے گیا۔

ابنِ حاتم نے سلام کر کے خط ابوسفیان کی طرف بڑھا دیا۔ ابوسفیان نے بند لفافہ لے کر قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف بڑھا دیا جو شاید اس کا نائب یا حاجب تھا۔

اس نے خط کھول کر بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ خط کا پہلا جملہ یہ تھا:

"حاملِ رقعہ ہذا میرا سگا بھتیجا ابنِ حاتم ہے۔"

ابوسفیان یہ سنتے ہی غصے سے کھڑا ہو گیا اور محافظ پر برس پڑا:

"احمق کہیں کا۔ تو کہہ رہا تھا کہ سردار نعیم کا قاصد آیا ہے۔ یہ تو سردار کا سگا بھتیجا ابنِ حاتم ہے۔ تو سرداروں کی عزت کرنا نہیں جانتا۔"

محافظ تھر تھر کانپنے لگا۔

"جا دُور ہو یہاں سے۔"

ابوسفیان بڑبڑاتا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اشارے سے ابنِ حاتم کو اپنے پاس بلایا اور قریب ہی جگہ دے دی۔

اب حاجب نے دوبارہ خط پڑھنا شروع کیا۔ خط ختم ہُوا تو ابوسفیان نے پوچھا:

"تم کتنے دن کے لیے مدینہ جانا چاہتے ہو ابنِ حاتم؟"

ابنِ حاتم نے سوچ کے بتایا:

"شاید ایک ہفتہ یا ایک مہینہ۔"

ابوسفیان اس کا منہ دیکھنے لگا:

"کوئی صحیح اندازہ نہیں بتا سکتے کیا؟"

ابوسفیان کے لہجے میں تلخی تھی۔

ابنِ حاتم کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے بھی کڑوے لہجے میں جواب دیا:

"سردار، میں ایک بیمار کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ میں کس طرح بتا سکتا ہوں کہ کتنے دن وہاں رکنا پڑے گا؟"

ابوسفیان نے اس کے تیور دیکھے تو فوراً اجازت دیدی۔

"ٹھیک ہے۔ تم جا سکتے ہو۔ مگر جلد آنے کی کوشش کرنا۔ ہم اپنے آدمیوں کو کاہنوں اور جادوگروں کے شہر میں بھیجنا نہیں چاہتے۔"

"سردار۔"

ابنِ حاتم بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا اور تڑخ کر بولا:

"مدینہ میرا شہر ہے۔ وہاں کاہن اور جادوگر نہیں، شریف زادے رہتے ہیں۔"

ابوسفیان خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بنوغطفان سے وہ کسی طرح بھی بگاڑ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابنِ حاتم نے اسے خاموش دیکھا تو کہا:

"مجھے واپسی کی اجازت دیجیے سردار۔ میں فوراً مدینہ روانہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"اچھا۔"

ابوسفیان نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا:

"جاؤ۔ سردار نعیم کو خط کا تحریری جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ انہیں زبانی بتا دینا۔"

ابنِ حاتم سلام کر کے ایک جھٹکے سے مڑا اور کسی بگولے کی طرح ہال کے دروازے سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے دل میں مشرکین کے خلاف جو الاؤ سا ابل رہا تھا مگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار کر سکتا۔

ابوسفیان اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی پُر سوچ نگاہیں ابنِ حاتم کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک خالی دروازے پر جمی رہیں!





قریشِ مکہ صلح حدیبیہ کی شرائط پر بڑی سختی سے عمل کراتے تھے۔ مکہ میں بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے لیکن انہیں مدینہ جانے کی اجازت نہ تھی۔

بعض مسلمانوں کو پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا اور انہیں پھر سے مشرک بنانے کے لیے ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔

اس صلح نامہ کی سب سے کڑی شرط یہ تھی کہ مکہ سے کوئی شخص مدینہ نہیں جا سکتا اور اگر وہ مدینہ پہنچ گیا تو پھر یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ اسے مکہ واپس بھجوائیں۔

ذاتِ باری تعالیٰ کا اپنے بارے میں فرمان ہے کہ وہ (اللہ) جسے چاہے ہدایت دے۔ چنانچہ جس وقت صلح نامہ حدیبیہ تحریر کیا جا رہا تھا اس وقت مشرکینِ مکہ کی نمائندگی سہیل بن عمرو کر رہا تھا اور اسی سہیل بن عمرو کا بیٹا ابوجندلؓ باپ کی انتہائی سختی کے باوجود اسلام لا چکا تھا۔ اور سہیل یہاں آنے سے پہلے ابوجندلؓ کو زنجیروں میں باندھ کر آیا تھا۔

سہیل بن عمرو وہی مشرک اور ظالم ہے کہ جب صلح نامہ کے آغاز میں جنابِ علی مرتضیٰؓ نے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لکھا تو وہ بگڑ کر بولا:

"میں نہیں جانتا کہ رحمٰن اور رحیم کون ہے اس لیے شروع میں وہی لکھا جائے جو ہم آج تک لکھتے چلے آئے ہیں یعنی .... بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"۔

چونکہ اس کلمے میں شرک والی کوئی بات نہ تھی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بات مان لی اور بسم اللہ کے بجائے باسمک اللّٰھم لکھا گیا۔

پھر جب جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام محمد رسول اللہ لکھا تو اس وقت بھی اس بدطینت نے اعتراض کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محمد رسول اللہ کے بجائے ابنِ عبداللہ لکھا دیا۔

اسی ظالم اور مشرک کے ہاں ابو جندل رضی اللہ عنہ نے جنم لیا جن کو سہیل بن عمرو زنجیروں میں جکڑ آیا تھا مگر ابو جندل رضی اللہ عنہ ایسے تگڑے جوان تھے کہ وہ معہ زنجیروں کے گھر سے بھاگ کے اسلامی خیمہ گاہ میں پہنچ گئے۔

سہیل بن عمرو نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو نامکمل عہدنامہ الگ رکھتے ہوئے زور سے چیخا:

"اے محمد! شرائط کی رُو سے ابو جندل رضی اللہ عنہ پہلا شخص ہے جسے آپ ﷺ کو واپس کرنا ہوگا۔"

اس کے جواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"دستاویز ابھی نامکمل ہے اور شرائط کی پابندی اس کی تکمیل کے بعد ہوگی۔"

مگر سہیل بن عمرو نہ مانا۔ اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس صلح نامہ کی تکمیل بہرصورت مقصود تھی اس لیے نومسلم مظلوم ابو جندل رضی اللہ عنہ کا ہاتھ آپ ﷺ کو ان مشرکوں اور ظالموں کے ہاتھ میں دینا پڑا۔

اس پر ابو جندل رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے جسم سے کُرتا اتار کر دُرّوں کے وہ نیلے نشانات دکھائے جو ظالموں نے مارے تھے۔

انہوں نے یہ بھی کہا:

"یہ حال دیکھ کر بھی مجھے پھر ظالموں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔"

مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرائطِ صلح کی پاسداری منظور تھی۔ آپ ﷺ نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں تسلی دی:

"ابو جندل رضی اللہ عنہ! خدا تیری کشائش کے لیے کوئی سبیل نکالے گا۔"

ابو جندل رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو واپس چلے گئے اور انہیں دوبارہ پابہ زنجیر کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے اظہار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قارئین کو ابو سفیان کی فطری اور ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو جائے کیونکہ ابو جندل رضی اللہ عنہ کے اس متذکرہ واقعے کے کچھ عرصہ بعد نعیم بن مسعود اشجعی کا بھتیجا ابنِ حاتم قریشِ مکہ کے سردار ابو سفیان کے پاس مدینہ جانے کی اجازت لینے گیا تھا۔

اگر اس معاملہ میں نعیم بن مسعود کا نام نہ ہوتا تو ابنِ حاتم کو اجازت دینا تو الگ رہا، ابو سفیان فوراً اسے گرفتار کر کے طوق وسلاسل پہنا دیتا۔

ابو سفیان اس معاملے میں اس قدر سخت دل تھا کہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ مکہ سے کوئی مشرک بھی مدینہ جانے کی فکر میں ہے تو وہ اسے بھی قید میں ڈال دیتا۔

اس نے مکہ اور اس کے مضافات سے مدینہ جانے والے ہر راستہ پر جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کر دی تھیں جو وہاں سے گزرنے والوں سے پوچھ گچھ کرتی تھیں اور مشکوک لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

ابنِ حاتم جس وقت ابو سفیان کے پاس سے لوٹ کر آیا تو نعیم بن مسعود نے اس کا چہرہ دیکھ کے اندازہ لگا لیا کہ مریضِ عشق کے چہرے پر بحالی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ابو سفیان نے اسے مدینہ منورہ جانے کی اجازت دیدی تھی۔

"چچا جان!"

ابنِ حاتم نے سلام کے بعد نعیم کو بتانا شروع کیا:

"آپ کے سردارِ اعلیٰ نے مجھے اجازت تو دے دی ہے مگر اسے شاید اپنے دل پر بڑا بوجھ ہوا۔ وہ مجھ سے الٹے سیدھے سوال بھی کرتا رہا۔ آپ کے بارے میں شاید اسے شبہ ہے کہ ہمارا پورا قبیلہ بنو غطفان مسلمان ہو گیا ہے لیکن وہ صاف طور پر مجھ سے کچھ معلوم نہ کر سکا۔"

نعیم بڑے غور سے ابنِ حاتم کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ابو سفیان کو کسی نے ان کے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ اور ابو سفیان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نعیم بن مسعود، بنو قریظہ کے یہودیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے نہیں گئے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے حق میں تھے اور انہوں نے ہی بنو قریظہ کو جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

پس!

ابنِ حاتم کی باتیں سننے کے بعد وہ چند لمحے تو سوچتے رہے۔ پھر بولے:

"اچھا۔ راہداری کا پروانہ دکھاؤ مجھے!"

"کیسا پروانہ، کہاں کی راہداری؟ میں کچھ سمجھا نہیں چچا جان!"

ابنِ حاتم پریشان ہو گیا۔
نعیم نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا:

"ابوسفیان نے تمہیں اجازت دے دی ہے نا؟"

"جی ہاں۔ بالکل"۔

ابنِ حاتم نے اثبات میں سر ہلا کر کہا:

"میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ بیمار کا معاملہ ہے اس لیے مجھے ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے"۔

"اچھا!"

نعیم بن مسعود نے ذرا اچنبھے سے کہا:

"تو تم نے ایک ماہ کا اجازت نامہ لیا ہے۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ ابوسفیان تو روزانہ ایک نہ ایک آدمی کو "مدینہ" بھاگ جانے کے جرم میں یا پھر مسلمان ہو جانے کی پاداش میں پکڑ کے زنجیریں ڈلوا دیتا ہے"۔

"وہ اتنا ظالم ہے، چچا جان؟"

ابنِ حاتم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اس سے بھی زیادہ!"

نعیم بن مسعود نے کہا:

"اچھا اب تم مجھے اجازت نامہ تو دکھاؤ۔ کیا لکھا ہے اس میں؟"

"اجازت نامہ!"

ابنِ حاتم کی سمجھ میں اب آیا:

"مگر چچا جان۔ ابوسفیان نے مجھے کوئی تحریر نہیں دی۔ میں نے کہا بھی کہ آپ کے خط کا جواب دیا جائے مگر وہ ٹال گیا"۔

نعیم پھر فکر مند ہو گئے۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر سر اٹھا کر بولے:

"ابوسفیان نے اچھا نہیں کیا۔ اگر اسے مخالفت کرنا تھی تو تمہیں جانے سے روک دیتا۔ تمہارے پاس تحریر نہیں ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ راستہ میں لگے ہوئے اس کے آدمی تمہیں پریشان کریں اور مدینہ نہ جانے دیں۔

ابنِ حاتم پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے کہا:

"آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے، چچا جان۔ میری واپسی کے وقت وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اب آپ کی کیا رائے ہے؟"

"تم جاؤ گے اور ضرور جاؤ گے"۔

نعیم بن مسعود نے کہا:

"اگر ابوسفیان کے آدمیوں نے تمہیں روک کر واپس کر دیا تو میں جنگ کر دوں گا اور اسی وقت اعلان کر دوں گا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ دیکھتا ہوں ابوسفیان میرا کیا بگاڑتا ہے۔

ابنِ حاتم۔ تم صرف دو روز ٹھہر جاؤ۔ میں اپنے حلیف قبیلوں کے پاس سوار دوڑاتا ہوں تاکہ ان کا تعاون مجھے حاصل رہے"۔

ابنِ حاتم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس وقت وہ نعیم کو تنہا چھوڑ دے!

۲

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی عہد میں جبکہ ابھی ان کی وحشیانہ زندگی کو ختم ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے، جس قدر عظیم الشان فتوحات حاصل کیں، ان پر غور کیا جائے تو ایک عجیب طرح کی حیرت طاری ہو جاتی ہے۔

وہ کونسی چیز تھی جس نے عرب کی تہذیب و اخلاق سے عاری قوم کو ایک مہذب اور شائستہ قوم کے پیکر میں ڈھال دیا تھا۔ اور ان میں وہ اتحاد پیدا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا؟

یہ وہی قوم تھی جس کے کسی شاعر کا ایک شعر ہی، ایک ہی باپ کے دو بیٹوں میں ہمیشہ کے لیے تفرقہ ڈال دیتا تھا اور باہمی عداوت کی ایک ایسی آگ بھڑک اٹھتی تھی جس کا نتیجہ خونریزی اور مسلسل جنگوں کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ انقلاب کس طرح پیدا ہوا؟

کیا اس انقلاب کا سبب وہ نیا دین (اسلام) تھا جسے انہوں نے اختیار کیا تھا؟

یا وہ عدل تھا جو اس وقت قائم ہو چکا تھا؟

یا وہ مساوات تھی جس نے حاکم و محکوم کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا تھا؟

یا پھر فوجوں کی اعلیٰ کارکردگی تھی جس نے انہیں فتوحات سے نوازا؟

ان تمام باتوں کا ایک ہی جواب ہے کہ:

"وہ دینِ اسلام ہی تھا جس نے عربوں کے منتشر شیرازے کو یکجا کر دیا۔ ان کی صفوں میں اتحاد پیدا کیا۔

دورِ جاہلیت کی مہلک رسوم سے انہیں روکا اور عین اس وقت جب ان کی قوتیں باہمی تنازعات میں ضائع ہو رہی تھیں ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا اور ان کی قوتوں کو اس نصب العین کے حصول میں لگا دیا۔

جب مسلمانوں نے اپنے گرد نظریں دوڑائیں تو انہیں معلوم ہوا کہ ایک طرف تو امراء عیش پرستی میں ...ول ہیں اور دوسری طرف مظلوم اور غریب رعایا جور و ستم میں دبی ہوئی ہے۔ زنگِ انسانیت کام ہو رہے ...اہے. ہر طرف گمراہی کا بازار گرم ہے۔

اس وقت انہیں یہ خدائی فرمان یاد آیا:

"تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے
بھلائی کی تلقین کرے اور بدی سے بچائے"۔

پس اس فرمان کے تحت انہوں نے لوگوں کو ہدایت دینے کی خاطر کمر ہمت باندھی اور اشاعتِ اسلام میں لگ گئے۔

ان کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ مقصد تھا "اللہ کی وحدانیت کا اعلان اور مخلوقِ خدا کی بھلائی"۔ ...ین کے اس مقصد کے حصول کے لیے جن شہسواروں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے، پہاڑوں کے سینے ...ق کر ڈالے اور دریاؤں اور سمندروں کو پایاب کر دیا ان میں **خالد بن ولید**رضؓ کا نام بڑی بلندی پہ چمکتا ...مکتا دکھائی دیتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا شجرۂ نسب مندرجہ ذیل ہے:

ابو سعید خالدؓ بن ولید بن عبد اللہ بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب بن لوئی!

اس طرح خالد کا نسب ساتویں پشت میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مل جاتا ہے!

خالدؓ کی والدہ کا نام لبابہ الصغرا تھا جو حارث بن حزن ہلالیہ کی بیٹی تھیں۔ خالدؓ کی والدہ اور ان کے ...الد ولید کا سلسلۂ نسب مضر پہ جا کر مل جاتا ہے۔

خالدؓ بن ولید کی تاریخ پیدائش پر مؤرخین میں کافی اختلاف ہے۔ ابنِ عساکر اور ابنِ برہان الدین نے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ:

"بچپن میں ایک دفعہ خالدؓ بن ولید اور جناب عمرؓ بن خطاب میں کشتی ہوئی
تھی جس میں خالدؓ نے عمرؓ کی پنڈلی توڑ ڈالی تھی جو کافی علاج معالجے کے بعد
ٹھیک ہوئی تھی"۔

اس واقعہ سے خالدؓ اور عمرؓ کا تقریباً ہم عمر ہونا ثابت ہوتا ہے. ظہورِ اسلام کے وقت حضرت عمرؓ کی

عمر ۲۷ سال تھی۔ اس طرح خالدؓ بھی اس وقت تقریباً ۲۷ سال کے ہوں گے۔

اب دیکھیے:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ پہلی وحی ۱۲۔ فروری ۶۱۰ء کو نازل ہوئی۔ اس میں سے اگر ۲۷ سال نکال دیے جائیں تو ۵۸۳ بچتے ہیں اور یہی خالد کی تاریخ پیدائش ہے۔ یعنی خالدؓ، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے ۱۲ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔

خالدؓ بن ولید کی کہانی آگے بڑھانے سے پہلے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جائے پیدائش، والدین اور ان کے قبیلے کا تھوڑا سا تذکرہ ہو جائے کیونکہ ماہرینِ نفسیات کا یہ خیال ہے کہ انسان پر اپنے ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس مقام کے دریا، پہاڑ اور وادیاں وہاں کے باسیوں کے دوست ہوتے ہیں اور ان کے مزاج و عادات کو متاثر کرتے ہیں۔

بعض ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی بھی بچے پر اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی سے ماحول کا اثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے ثبوت میں ماہرین نے سترھویں صدی کے مشہور انگریز مدبر تھامس لوب کی مثال دی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔

کہتے ہیں یہ مدبر بے انتہا بزدل تھا اور ہر دم خوف و ہراس میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جس وقت ہسپانوی بحری بیڑے آرمیڈا نے انگلستان پر چڑھائی کی تو تھامس لوب اس وقت ماں کے پیٹ میں تھا۔

اس حملہ کی دہشت سے اس کی ماں بہت خوفزدہ رہتی تھی رہی خوف و دہشت اس کے پیٹ کے بچے پہ اثر انداز ہوئی۔ اس طرح تھامس لوب باوجود ایک معروف مدبر ہونے کے تمام عمر بزدل اور خوف زدہ رہا۔

خالدؓ کا وطن مکہ اور قبیلہ قریش سے ان کا تعلق تھا۔

قریش عرب کا سب سے زیادہ مشہور قبیلہ تھا اور زمانۂ قدیم سے مکہ کی کلید برداری اسی قبیلے کے پاس تھی۔ مکہ کے لوگ انتہائی جفاکش ہوتے تھے اس لیے کہ مکہ، حجاز کے جنوب میں ایک بنجر وادی میں آباد ہے۔ یہاں کی پتھریلی زمین نہ کاشت کے قابل ہے اور نہ صنعت و حرفت کے لیے موزوں ہے۔ چنانچہ ان کا پیشہ تجارت بلکہ بیرونی تجارت ہوتا تھا اور مکہ والے سال کا بیشتر حصہ سفر میں رہتے تھے۔

قرآنِ حکیم نے مکہ والوں کی بود و باش کے سلسلے میں فرمایا ہے:

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں جاڑے اور گرمی کے دنوں کے سفروں کی الفت پیدا کی ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ اس الفت کو پیدا کر دینے کی وجہ سے اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے انہیں امن میں رکھا"۔

(القرآن)

مکہ کی آب و ہوا گرم ہے مگر یہاں کا پانی صاف شفاف اور ہر قسم کی گندگی سے پاک ہے۔ چونکہ یہ علاقہ ساحلِ سمندر کے قریب ہے اس لیے اس پر صحرائی آب و ہوا کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ یہ حالات پہلی صدی ہجری کے ہیں)۔

ان طبعی حالات کا اثر ان کے مزاج پہ پڑنا ضروری تھا چنانچہ جفاکشی اور مشقت کی عادت ان کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ وہ کھلے آسمان تلے رہتے تھے اس لیے قدرتاً ان کو ستارہ شناسی کا بھی شوق تھا۔ ہمہ وقت سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ بہت زیادہ محنتی اور بہادر تھے۔

تجارت کی وجہ سے ان کا سابقہ دوسری قوموں سے پڑتا رہتا تھا اس لیے وہ دانائی اور فراست میں دوسرے علاقوں والوں کی نسبت ان پر فوقیت رکھتے تھے۔

مکہ جس کا نام پہلے بکہ تھا ہمیشہ سے قابلِ احترام شہر سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس جگہ وہ عمارت تعمیر ہے جسے بیت اللہ اور خانہ کعبہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس عمارت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی مدد سے تعمیر کیا تھا۔

اہلِ مکہ کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد تھے۔ چونکہ مکہ کی تولیت ان کے ہاتھ میں تھی اس لیے خانہ کعبہ کے ساتھ ساتھ قریشِ مکہ بھی دوسروں کی نسبت زیادہ قابلِ احترام سمجھے اور جانے جاتے تھے۔

اپنے اس احترام اور تقدس کے باعث وہ اسلام سے پہلے حج کے موقعہ پر عرفات میں قیام نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم مکہ کے رہنے والے ہیں پھر ہم مکہ سے باہر کیوں جائیں۔ حج کے لیے باہر سے آنے والوں کو وہ مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنے عام کپڑوں میں حج نہ کریں بلکہ خاص کپڑے (احرام) پہن کے آئیں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر ننگے ہو کر حج کریں۔

(بحوالہ خالد سیف اللہ از ابو زید شبلی)

مکہ اس تجارتی راستہ پر واقع تھا جہاں سے ہندوستان اور دوسرے ممالک کے تاجر اپنا سامان لے کر یمن، شام اور مصر کو جایا آیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مکہ میں کئی بڑے بڑے بازار تھے جہاں سامان کی خرید و فروخت

ہوتی تھی۔ ہر آنے والا قافلہ یہاں کچھ دن ضرور ٹھہرتا اور آگے کے سفر کے لیے سامانِ خورد و نوش وغیرہ جمع کرتا تھا۔

مکہ میں بڑے بڑے تاجر تھے جو اپنا سامان لے کے شام و مصر کا سفر کرتے تھے۔ اس طرح تجارت ان کا بڑا معزز پیشہ تھا۔

کثرتِ سفر اور دوسری اقوام سے میل جول سے اہلِ مکہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک طرف تو وہاں ہر طرح کے مال کی فراوانی ہو گئی۔ دوسری طرف انہیں مختلف تہذیبوں اور افکار کے مطالعے اور مشاہدے کا موقع ملا اور ان کی عقلیں صیقل اور ذہن کشادہ و بلند ہو گئے۔

مذہبی برتری کے علاوہ اہلِ مکہ کو تمام عرب پر ادبی اور اخلاقی حیثیت سے بھی امتیاز حاصل تھا۔ اس امتیاز کا آغاز اس وقت ہوا جب قریش کے جدِ امجد قصی بن کلاب نے خزاعہ پر غلبہ حاصل کر کے مکہ کی سیادت اور بیت اللہ کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

قصی نے جو قدر و منزلت حاصل کی وہ ان کے بعد بھی ان کی نسل میں قائم رہا۔ چنانچہ اہلِ مکہ تمام جزیرۃ العرب میں ادب و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔

ان امتیازات میں مکہ کے بازاروں کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہاں بڑے بڑے میلے لگتے۔ خرید و فروخت اور کھیل تماشوں کے علاوہ وہاں تمام عرب کے شعرا، ادیب اور خطیب جمع ہوتے تھے۔

یہ بازار عام طور پر سالانہ میلوں ٹھیلوں پر خوب سجائے جاتے تھے اور ہفتوں یہ نمائشیں اور میلے جاری رہتے تھے۔

اس دور میں قبیلہ پرستی کا بڑا زور تھا۔ قبیلہ کے نام اور آن پر عرب کا ہر اعلیٰ و ادنیٰ ہر وقت اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار رہتا تھا۔

عکاظ کا سالانہ میلہ مکہ کا سب سے بڑا تہوار تھا۔ اس میں تمام عالمِ عرب جمع ہوتا۔ شعرا اپنے اپنے قبیلے کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔

ان محفلوں میں شاعر آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے قبیلے کی تعریف و توصیف میں فی البدیہہ اشعار کہتے۔ اسی طرح خطیب و ادیب بھی مکالموں میں مصروف رہتے۔

اس بدیہہ گوئی اور مکالموں کی بدولت ہی عربی زبان اس قدر وسیع و فصیح ہے کہ دنیا کی چند عظیم زبانوں میں تسلیم ہوتی ہے۔

اہلِ مکہ کے معاملہ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ تمام شعرا اپنے قبیلہ کی تعریف کرتے وقت "قریش" کو

اس مقابلہ سے مستثنیٰ کر دیتے تھے۔ تمام عرب نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ "قبیلہ قریش" عرب کا سب سے عظیم اور محترم قبیلہ ہے۔

چنانچہ عرب کا مشہور شاعر اخطل کہتا ہے:

"میں نے تمام لوگوں کو خوب اچھی طرح پرکھ کے یہ رائے قائم کی ہے
کہ ہم سوائے قریش کے باقی تمام لوگوں سے افضل ہیں"۔

عرب اپنی بڑائی، برتری اور بہادری پر غرور کی حد تک فخر کرتے ہیں۔ قوتِ برداشت، کامیابی کی تمنا اور دشمنوں سے انتقام کا جذبہ ان میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔

مہمان نوازی اور پناہ گزینوں کی حفاظت کو عرب اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں اپنی جان تک دے دیتے تھے۔

اہلِ مکہ کا شعور بیدار تھا اور ان کا سیاسی نظام شورائی قسم کا تھا۔ عہدوں اور رتبوں کی تقسیم میں ہر قبیلہ حصہ لیتا اور اسے اس کا حصہ اور حق ملتا تھا۔

باہمی صلاح مشورے کے لیے مکہ میں ایک دار الندوہ قائم تھا۔ وہاں قبائلی سردار جمع ہوتے تھے اور "موضوعِ بحث معاملہ" پر اپنی رائے دیتے۔ ان آرا کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اسی نظام کو مغربی دنیا نے اختیار کیا اور دار الندوہ کا نام "پارلیمنٹ" ہو گیا۔

خالدؓ بن ولید کا تعلق بنو مخزوم سے تھا جو قریش کا ایک معزز قبیلہ تھا اور اس قبیلہ میں دانا، زیرک اور باکمال لوگوں کی کمی نہ تھی۔

مغیرہ بن عبد اللہ بن عمرو جن کی سخاوت کا چرچا دور دور تھا، ان کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

اسی قبیلہ کے ایک فرد ابو وہب بن عمرو نے سب سے پہلے عربوں کو یہ بتایا تھا کہ:

"تعمیرِ کعبہ میں حرام یا غلط طریقہ سے حاصل کی ہوئی رقم قطعی خرچ نہیں ہونی چاہیے!"

اس کا قصہ اس طرح ہے کہ:

جب قریش نئے سرے سے تعمیرِ کعبہ کرنے لگے تو ابو وہب نے کہا:

"اے میری قوم کے لوگو!

تم اس عمارت کی تعمیر شروع کرنے لگے ہو جو خانۂ خدا ہے اور جہاں دن رات خدا کا نام لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کا سختی سے خیال رکھو کہ اسکی

تعمیر میں کوئی ایسی رقم نہ خرچ ہونی چاہیے جس کے متعلق حرام ہونے کا تھیں ذرا سا بھی شبہ ہو۔

اس تعمیر میں نہ تو فاحشہ کا روپیہ لگنا چاہیے نہ سود کا روپیہ۔ ایسا روپیہ بھی اس تعمیر میں نہ خرچ ہونا چاہیے جو ظلم و ستم سے حاصل کیا گیا ہو۔"

صاحبِ روض الانف لکھتے ہیں کہ:

"ابو وہب بن عمرو کی اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قریش، سود، ظلم اور فواحشات کو دل سے حرام سمجھتے تھے مگر بظاہر انہیں ایسا کرنے میں کوئی باک نہ تھا"۔

قبیلہ بنو مخزوم کا قریش میں جو مقام تھا اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جس وقت کعبۃ اللہ کی تعمیرِ نو کا مرحلہ درپیش ہوا تو طے یہ پایا کہ اس کی تعمیر میں تمام قبائل حصہ لیں گے اس لیے عمارت کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

اس وقت بنو مخزوم کے حصہ میں عمارت کا تقریباً ¼ حصہ آیا یعنی حجرِ اسود سے رکنِ یمانی تک کی تعمیرِ نو بنو مخزوم کے حوالے ہوئی۔

اس بات سے ان کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ قریش میں بنو ہاشم کے بعد بنو مخزوم ہی تھے اور قریش کی سیادت و قیادت کے سلسلہ میں بنو ہاشم اور بنو مخزوم میں ہمیشہ تکرار رہتی تھی۔ اسی لیے ابوجہل، بنو ہاشم کو طعنے دیا کرتا تھا کہ:

"۔۔۔۔ جس وقت سخاوت، شجاعت، بزرگی اور عزت و شرف کا مقابلہ ہوا اور گھوڑے میدان میں دوڑنے لگے اور ہم نے مقابلہ جیت لیا تو اس وقت تم نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم میں نبی پیدا ہوگیا۔"

پھر جب خدا کے حکم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تو بنو مخزوم نے یہ کہہ کر مخالفت شروع کر دی کہ:

"اگر نبی پیدا ہونا تو ہم میں سے ہوتا"۔

پھر جب قریش نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس قدر مخالفت کی کہ آپ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بنو ہاشم سے لین دین بالکل بند کر دیں اور انہیں کسی قسم کی مدد نہ دیں تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شعب ابی طالب میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے ساتھ وہاں چلے گئے تو اس قدر سخت محاصرہ کیا گیا کہ محصورین پر دانہ پانی بند ہوگیا اور لوگ، جن میں خود حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی شامل تھے، پیٹ پر پتھر باندھ کر اپنی بھوک کی اذیت کم کرتے تھے۔

یہ مصائب جھیلتے جب ایک عرصہ گزر گیا تو اسی بنو مخزوم کے ایک شخص زبیر بن ابی امیہ نے اس محاصرے کی سب سے پہلے مخالفت کی اور مکہ میں اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔

مسلمانوں پر ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب وہ مشرکینِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر شاہِ حبشہ نجاشی رض کے دربار میں چلے گئے۔

اس وقت قریشِ مکہ نے انہیں واپس لانے کے لیے عمرو بن العاص اور بنو مخزوم کے ایک شخص کو حبشہ بھیجا تھا۔ اس سے بھی بنو مخزوم کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ اس اہم موقع کے لیے جن دو آدمیوں کو منتخب کیا گیا ان میں سے ایک بنو مخزوم سے تھا۔

بنو مخزوم اور بنو ہاشم میں سلسلۂ ازدواج بھی جاری تھا یعنی بنو ہاشم، بنو مخزوم کو بیٹیاں دیتے بھی تھے اور لیتے بھی تھے یعنی وہ ایکدوسرے کی عظمت کے قائل تھے۔ عاتکہ بنت عبد الملک، ابوامیہ بن مغیرہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔

یہ وہی ابوامیہ بن مغیرہ ہیں جن کے بیٹے زبیر بن امیہ نے سب سے پہلے قریش کے ظالمانہ معاہدہ کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

فاطمہ بنت عمرو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے والدِ محترم حضرت عبداللہ رض، آپ کے چچاؤں ابوطالب اور زبیر اور صفیہ کے سوا باقی تمام پھوپھیوں کی والدہ تھیں۔

اگر یہ رشتے دور کے معلوم ہوتے ہوں تو خود رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی بنو مخزوم سے ازدواجی تعلق قائم کیا تھا۔ چنانچہ آپ کی دو ازواجِ مطہرات حضرت امِ سلمہ رض اور حضرت میمونہ رض بنو مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔

حبشہ ہجرت کرنے والوں میں حضرت ابو سلمہ رض اور حضرت ارقم بن ابی ارقم رض بھی بنو مخزوم سے متعلق تھے۔ یہ وہی ارقم ہیں جن کے گھر میں مسلمانوں کی پہلی مسجد بنائی گئی تھی جہاں مسلمان کفارِ مکہ کی نظروں سے چھپ کر خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے۔

خالد رض کا قبیلہ بنو مخزوم صرف عزت اور مرتبہ ہی میں ایک عظیم قبیلہ نہ تھا بلکہ اس کے پاس دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی اور بنو مخزوم تجارت کے میدان میں بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

واقدی نے لکھا ہے کہ:

"جنگِ بدر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مشرکینِ مکہ نے ایک قافلہ شام کی طرف روانہ کیا اور طے یہ ہوا تھا کہ اس کا منافع باہم تقسیم نہیں کیا جائے گا بلکہ اس منافع سے مسلمانوں سے جنگ کے لیے سامانِ حرب خریدا جائے گا۔

پس اس قافلہ میں بنو مخزوم کے دو سو اونٹ شامل تھے جن پر ان کا سامانِ تجارت بار تھا اور منافع بھی ان کا تقریباً پانچ ہزار مثقال سونا بنتا تھا۔"

خالدؓ کی پرورش ایک ایسی قوم میں ہوئی تھی جو شجاعت، عزت، وجاہت اور دولت میں ایک بلند مقام رکھتی تھی۔

خالدؓ پر اپنے قبیلہ اور والدین کا بہت اثر پڑا اور انہوں نے عقلمندی، دانائی، شجاعت اور بہادری اور فنونِ سپہ گری میں انتہائی کمال حاصل کیا۔ انہی خوبیوں کی بدولت انہوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قصی بن کلاب نے بنو خزاعہ پر غلبہ حاصل کر کے انہیں مکہ سے نکال دیا تھا اور ان کی جگہ اپنا قبیلہ قریش یہاں آباد کیا تھا۔

اس وقت سے مکہ اور بیت الحرام کی ریاست و سیادت قریش کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ اس ریاست کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

۱۔ دارالندوہ :
یہ عمارت قصی نے کعبہ کے بالمقابل بنوائی تھی۔ یہاں قبیلہ کے معززین اور سردار باہمی صلاح مشورہ کے لیے جمع ہوتے تھے۔

۲۔ اللواء (علم برداری) :
یہ محکمہ جنگ کے لیے جھنڈا تیار کرتا تھا اور یہی دوسرے لوگوں کو چھوٹے جھنڈے بنا کر دیتا تھا۔

۳۔ حجابۃ الکعبہ (کعبہ کی دربانی) :
جس فرد کے ذمے یہ خدمت ہوتی تھی وہ کعبہ کا دروازہ کھولتا تھا اور کعبہ کے سلسلہ میں

تمام امور کی نگہداشت اس کی ذمہ داری ہوتی تھی۔

۴۔ سقایہ (پانی پلانا) :
جس شخص کے سپرد یہ خدمت ہوتی تھی وہ حج کے ایام میں حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام کرتا تھا۔

۵۔ رفادہ (مہمان نوازی اور ضیافت) :
رفادہ، قصی نے قریش پر فرض کی تھی۔ وہ ہر سال حج کے قریب تمام قریش سے حسبِ توفیق رقم اکٹھا کرتا اور اس رقم سے کھانا پکوا کر نادار اور غریب حاجیوں میں تقسیم کرتا تھا۔

۶۔ قیادت :
یعنی جنگ کے موقع پر سپہ سالاری کے فرائض انجام دینا۔

قصی نے اپنی زندگی میں یہ تمام محکمے اپنے ہاتھ میں رکھے پھر وفات کے قریب اس نے کعبہ کی تولیت کے تمام امور اپنے بڑے لڑکے عبد الدار کے سپرد کر دیے۔

عبد الدار کے بعد اس کے لڑکوں اور بھتیجوں (بنو عبدِ مناف) میں اختلاف پیدا ہوا اور جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا مگر بعض لوگوں نے درمیان میں پڑ کر صلح کرا دی اور ان محکموں کو بنو عبد الدار اور بنو عبدِ مناف میں تقسیم کرا دیا۔



اب ایک بار پھر ہم آپ کو یوحنا اور ابنِ حاتم کی طرف لیے چلتے ہیں۔

ابنِ حاتم نے ابو سفیان سے مدینہ جانے کی اجازت لے لی تھی اس لیے اس کے چچا نعیم بن مسعود نے بھی اسے نہ روکا۔

ابنِ حاتم نے رختِ سفر باندھا اور مدینہ کی طرف چل پڑا۔ راستہ طویل تھا مگر ابنِ حاتم کی آنکھوں کے سامنے تو اس کی جانِ بہار کا پیکرِ رقصاں تھا۔

اسے بتایا گیا تھا کہ نوحنا سخت بیمار ہے اور اس کے بچنے کی امید کم ہے۔ اس لیے ابنِ حاتم جب بھی اس کا تصور کرتا تو نوحنا اسے ہنستی مسکراتی نظر آتی۔ اس تصور نے ابنِ حاتم کا سفر آسان کر دیا اور وہ بغیر کسی خاص پریشانی کے مدینہ پہنچ گیا۔

نوحنا کی سہیلی صفورا نے اس کے والدین کو بتا دیا تھا کہ اس نے ابنِ حاتم کو نوحنا کی بیماری کی خبر بھجوا دی ہے مگر انہیں یہ امید نہ تھی کہ ابنِ حاتم اتنی جلدی مدینہ پہنچ جائے گا۔

نوحنا کے والدین نے ابنِ حاتم کو اپنے سامنے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ نوحنا کے والد نے اپنے ہونے والے داماد کو گلے لگایا اور ماں نے اس کی بلائیں لیں۔

بیمار نوحنا کے کانوں میں ابنِ حاتم کی آواز پہنچی تو اس نے نوحنا پر مسیحائی کا کام کیا۔ اس کے اجڑے گلشن میں جیسے بہار آ گئی۔

کہاں تو نوحنا کو پکڑ کے کروٹ دلائی جاتی تھی اور کہاں وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار کا سہارا لیے لیے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔

اس کی ماں اسے ابنِ حاتم کے آنے کی خبر دینے آ رہی تھی۔ اس نے نوحنا کو دروازے پر کھڑے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

"بیٹی نوحنا!"

اس نے تعجب سے کہا:

"تُو تو کروٹ نہیں بدل سکتی تھی۔ تجھے یہاں تک کون لایا؟"

نوحنا کے چہرے پر بحالی آ گئی تھی۔

"ہاں۔ میں خود آئی ہوں"۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی:

"میری طبیعت اب ٹھیک ہے"۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے"۔

ماں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا تجھے معلوم ہے کون آیا ہے؟"

نوحنا نے جواب دینے کے بجائے گردن جھکا لی۔

اس کی ماں نے ایک اور اشارہ دیا:

"وہ مکہ سے آیا ہے۔ پورے ڈھائی سال بعد"۔

"اچھا" کہہ کر نوحنا خاموش ہو گئی۔

ماں نے ہنستے ہوئے کہا:

"اب تو سمجھ گئی ہو گی کہ کون آیا ہے!"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے"۔

نوحنا نے ماں سے آنکھیں ملائیں:

"میں نے ان کی آواز پہچان لی ہے"۔

ماں خوش ہو گئی اور "ہائے رے میری بچی" کہہ کر بیٹی کو سینے سے لپٹا لیا۔

اسی وقت نوحنا کے باپ کی آواز سنائی دی:

"ارے تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

وہ کمرے کے اندر ابنِ حاتم کے پاس بیٹھے تھے کہ بیوی کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔ انہیں تعجب ہوا کہ وہ کس سے باتیں کر رہی ہیں جبکہ نوحنا تو کمزوری کے سبب آنکھیں بھی نہ کھول سکتی تھی۔ اسی لیے انہوں نے واں سے پوچھا تھا۔

"میری بیٹی نوحنا ہے میرے پاس"۔

ماں نے بیٹی کو سینے سے جدا کرتے ہوئے جواب دیا:

"اسی سے بولی ہوں میں"۔

باپ کو بڑی حیرانی ہوئی۔

بیمار نوحنا تو بستر سے لگی تھی۔ مشکل سے دن میں دو ایک بار بات کرتی تھی اور بس! اپنا شک دور کرنے کے لیے وہ کمرے سے باہر آئے۔ ابنِ حاتم بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابنِ حاتم اور نوحنا کے باپ نے نوحنا کو ایک ساتھ ہی دیکھا۔

"بیٹی نوحنا"۔

اور اس کے والد تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

نوحنا کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اس وقت رونق آ گئی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا اور اندر کو چلے۔

نوحنا کی ماں کی نظر آتے ہوئے ابنِ حاتم پر پڑی تو پہلے انہوں نے جلدی سے نوحنا کا ڈھلکا ہوا آنچل

اس کے سر پہ ڈالا۔ پھر ہنستے ہوئے بولیں:

"آجاؤ بیٹے ابنِ حاتم۔ تم بھی یہیں آجاؤ۔"

ابنِ حاتم تو خود جلد سے جلد نوھنا کے قریب ہونا چاہتا تھا۔ وہ قدم اٹھاتا سب کے برابر پہنچ گیا اور سب کمرے میں داخل ہوئے۔

نوھنا کو بستر پر لٹانے کی کوشش کی تو نوھنا نے انکار کر دیا۔

"نہیں ماں۔ میں لیٹے لیٹے تھک گئی ہوں۔"

اس نے دھیرے سے کہا:

"مجھے تکیے کے سہارے بٹھا دیجیے۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔"

نوھنا کے والد بولے:

"ہماری بیٹی تو بالکل اچھی ہو گئی ہے۔"

"ہاں بابا۔"

باپ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے نوھنا نے کہا:

"میں بالکل اچھی ہوں۔ آپ میری کوئی فکر نہ کیجیے۔"

"شکر ہے میرے مالک۔"

یہ آواز نوھنا کی ماں کی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے چہرے پر آتی ہوئی سرخی دیکھ کر کھلی جا رہی تھیں۔

نوھنا کے باپ نے ابنِ حاتم سے رسمی سا سوال کیا:

"ہاں بیٹے۔ نعیم بن مسعود کی سناؤ۔ وہ کیسے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہیں خالو جان۔ آپ سب لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔"

"بیٹے ابنِ حاتم!"

نوھنا کے والد سنجیدہ ہو گئے:

"مدینہ میں یہ افواہ اڑی ہے کہ نعیم بن مسعود مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس میں کہاں تک حقیقت ہے؟"

"خالو جان۔ یہ افواہ نہیں حقیقت ہے۔"

ابنِ حاتم نے بتایا:

"ہم سب تین سال پہلے ہی مسلمان ہو گئے تھے مگر چچا نے ہمیں منع کر دیا تھا کہ ابھی اس بات کا چرچا نہ کیا جائے۔"

پھر اس نے ذرا رک کر کہا:

"چچا جان اب بھی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

نوھنا کے والد نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"ان کے اعلان کرتے ہی سارا مکہ ان کا مخالف ہو جائے گا۔"

"خالو جان یہ بات نہیں ہے۔"

ابنِ حاتم نے پُر زور الفاظ میں کہا:

"چچا جان کو کسی کی مخالفت کی پروا نہیں ہے نہ وہ کسی سے ڈرتے ہیں۔"

"تو پھر اعلان کیوں نہیں کرتے نعیم۔"

نوھنا کے والد نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے دریافت کیا:

"اگر کوئی حرج نہ ہو تو اعلان کر دیں اور سیدھے مدینہ چلے آئیں۔"

"بات یہ ہے چچا جان:"

ابنِ حاتم نے آواز دبا کے کہا:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چچا جان کو اس اعلان سے روک رکھا ہے تاکہ ان کے مدینہ کے بجائے مکہ میں رہنے سے وہاں کے کمزور مسلمانوں پر زیادہ ظلم و ستم نہ ہو سکے۔ چچا جان کو جب کسی بے کس مسلمان پر ظلم کی خبر ملتی ہے تو وہ فوراً وہاں پہنچتے ہیں اور اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔"

نوھنا کے والد نے سر ہلایا:

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے تو پھر اس کی پابندی کرنا ہو گی۔"

اس دوران نوھنا تکیے کے سہارے بیٹھی چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔ پھر جیسے نوھنا کی ماں کو اچانک خیال آیا۔ وہ بولیں:

"ارے بیٹی نوھنا۔ تم نے ابنِ حاتم کو سلام نہیں کیا۔"

"میں نے سلام کیا تھا ماں۔"

نوحنا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی:

"وہ باتوں میں سن نہیں سکے شاید"۔

"معاف کرنا نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے معذرت کی:

"میں واقعی باتوں میں لگ گیا تھا۔ مجھے سب سے پہلے تمہاری خیریت دریافت کرنا تھی"۔

"بیٹھے۔ اس کی خیریت کیا پوچھتے ہو"۔

ماں نے بات بیچ ہی میں اچک لی:

"اس کی طبیعت تو ایسی خراب ہوئی کہ بس اللہ جانتا ہے۔ بس زندگی تھی کہ بچ گئی۔ آج تو بالکل اچھی نظر آرہی ہے خدا کے فضل سے"۔

"میں حکیم صاحب کی طرف جا رہا ہوں"۔

نوحنا کے والد کھڑے ہوتے ہوئے بولے:

"پوچھوں گا کہ کس وقت دیکھنے آئیں گے نوحنا کو"۔

اور وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

نوحنا کی ماں بھی کچھ دیر بعد کسی بہانے وہاں سے اٹھ آئیں تاکہ دونوں کو گفتگو کرنے کا کچھ وقت مل سکے۔

ان کے جاتے ہی نوحنا اور ابنِ حاتم نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر دیر تک دیکھتے ہی رہے۔ آخر ابنِ حاتم نے خاموشی کو توڑا:

"کچھ بولو گی نہیں۔ یونہی چپ بیٹھی رہو گی کیا؟"

"تم ہی کچھ کہو۔ تم بھی تو خاموش ہو"۔ نوحنا نے کہا اور شرما گئی۔

"کہنے کا حق تمہارا ہے نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے آہستہ سے کہا:

"تمہیں مجھ سے شکوہ کرنا چاہیے۔ پوچھنا چاہیے کہ میں نے تمہاری خبر کیوں نہ لی۔ اتنے دن میں خاموش کیوں رہا؟"

"اب شکوہ کیا کروں؟"

نوحنا کا لہجہ دردیلا ہوگیا:

"تم آگئے بس سب شکوے شکایت ختم ہوگئے۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہارے آنے کی کوئی امید نہ تھی ہاں یہ دعا ضرور مانگتی تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار تمہیں دیکھ لوں"۔

"ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے نوحنا"۔

ابنِ حاتم کے لبوں سے بھی ایک سرد آہ نکل گئی:

"مجھے جیسے ہی تمہاری بیماری کی خبر ملی بس میں نے کوشش شروع کر دی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر ابوسفیان نے مجھے مدینہ آنے سے روکا تو میں بغیر اطلاع کے وہاں سے بھاگ آؤں گا"۔

نوحنا کے کان کھڑے ہوگئے:

"کیا مدینہ آنے کے لیے ابوسفیان کی اجازت لینا پڑتی ہے"۔

"اور کیا نوحنا ــــ"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"اس نے تمام راستوں پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص مکہ سے مدینہ نہیں آسکتا"۔

"کیوں؟" نوحنا نے پوچھا:

"اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟"

"مکہ والوں کا خیال ہے کہ مدینہ والے جادو جانتے ہیں"۔

ابنِ حاتم نے اسے سمجھایا:

"اور جو مدینہ جاتا ہے اس پر جادو کر کے وہ اسے مسلمان کر لیتے ہیں۔ جبھی تو ابوسفیان کسی کو یہاں آنے نہیں دیتا"۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

نوحنا نے بڑی امیدوں سے پوچھا:

"واپس جاؤ گے کیا؟"

ابنِ حاتم کو اس سوال کی امید تھی۔ اس نے اس کے بہت سے جواب سوچے تھے مگر اس وقت ان میں سے ایک جواب بھی یاد نہ آرہا تھا اور اسی گھبراہٹ میں وہ منہ کھولے بس ٹکٹکی باندھے نوحنا کو دیکھے جا رہا تھا، دیکھے جا رہا تھا۔

نوحنا جواب نہ پا کر دوبارہ بولی:

"میں نے کچھ پوچھا ہے ابنِ حاتم!"

ابنِ حاتم ٹھنڈی سانس لے کر بولا:

"میں نے سن لیا ہے نوحنا۔"

"تو پھر؟"

"اس کا جواب ابھی میرے پاس نہیں ہے۔"

نوحنا نے دوسرا سوال کیا:

"اچھا یہ تو بتاؤ کتنے دن رہو گے یہاں؟"

ابنِ حاتم کو نوحنا کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی:

"نوحنا۔ یہ بھی تو وہی سوال ہے جس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔"

ابنِ حاتم نے کہا:

"بہرحال میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کم از کم ایک ماہ تو ضرور مدینہ میں رہوں گا۔ پھر دیکھوں گا حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں۔"

"میں تم سے ضد نہیں کروں گی ابنِ حاتم!"

نوحنا دھیمے لہجے میں بولی:

"بس یہ خیال رکھنا کہ ماں اور بابا دونوں میرے لیے پریشان رہتے ہیں۔ تم جانتے ہو اُن کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔"

"نوحنا۔ تم اس سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہونا۔"

ابنِ حاتم نے اسے سمجھایا:

"مدینہ کے بادشاہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو تم سیدھی اُن کے حضور پہنچ جانا۔ وہ تمہاری ہر مشکل آسان کر دیں گے۔ میں بھی انشاءاللہ جلد ہی کوئی فیصلہ کر لوں گا۔"

اسی وقت نوحنا کی ماں نے آ کر کہا:

"بیٹے ابنِ حاتم۔ تمہارا بستر نوحنا کے باپ کے کمرے میں لگا دیا ہے میں نے۔ اگر تم چاہو تو آرام کر سکتے ہو۔"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"میں یہاں نہیں ٹھہروں گا خالہ جان۔ میرے بہت سے دوست ہیں یہاں۔ کسی کے پاس بھی ٹھہر جاؤں گا۔ آپ کا گھر یوں بھی چھوٹا ہے۔"

"نہیں بیٹے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے ہوتے ہوئے کسی اور جگہ ٹھہرو۔"

نوحنا کی ماں نے کہا:

"پھر تم کوئی غیر تو نہیں ہو۔"

"مگر خالہ جان ــــ"

"بس اب انکار کی ضرورت نہیں۔"

نوحنا کی ماں نے اس کی بات کاٹ دی:

"تم جب تک مدینہ میں ہو ہمارے پاس رہو گے۔"

ابنِ حاتم کو خاموش ہو جانا پڑا۔

ابنِ حاتم کو مدینہ آئے پندرہ دن سے زیادہ گزر چکے تھے!

نوحنا کی بیماری تو اسے دیکھتے ہی جاتی رہی تھی اور اب دن رات کی ابنِ حاتم کی رفاقت نے اسے بالکل تندرست کر دیا تھا۔

نوحنا کی صحت یابی سے اس کے والدین بہت خوش تھے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ ابنِ حاتم کوئی فیصلہ کرے تو نوحنا کو ہمیشہ کے لیے اس کے حوالے کر دیں۔

ایک شام نوحنا کی ماں نے یہ ذکر چھیڑا۔

انہوں نے نوحنا کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور اسے تاکید کر دی کہ وہ گفتگو کے دوران وہاں نہ آئے

نوحنا کے والد بھی آ گئے۔

نوحنا کی والدہ نے کہا:

"بیٹے۔ تم غیر تو نہیں ہو اس لیے میں چاہتی ہوں کہ نوحنا کے بارے میں تم اب کوئی فیصلہ کر ڈالو۔ تمہیں دو ہفتے سے زیادہ ہمارے گھر میں رہتے ہوئے گزر چکے ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اہلِ محلہ انگلی اٹھا سکتے ہیں!"

"خالہ جان۔ آپ بالکل درست فرما رہی ہیں۔"
ابنِ حاتم نے صاف الفاظ میں کہا:
"مجھے نوحنا سے شادی کرنے یا اسے رخصت کرانے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ یہ تو میری زندگی کا ایک مقصد ہے مگر جب میں مکہ سے چلا تھا تو چچا نعیم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تک وہ اجازت نہ دیں گے میں شادی نہ کروں گا۔ ان سے کیا ہوا یہ وعدہ ہی مجھے اس ضروری کام سے روک رہا ہے ورنہ میں تو ہر وقت تیار ہوں۔"
"مگر بیٹے ابنِ حاتم!"
نوحنا کے والد بولے:
"تمہارے چچا نے کوئی وقت تو مقرر نہیں کیا کہ وہ تمہیں اس کی کب اجازت دیں گے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہم مزید انتظار کب تک کریں؟"
"آپ ٹھیک فرما رہے ہیں خالو جان۔"
ابنِ حاتم نے جواب دیا:
"میں نے اپنے طور پر ایک آدمی کو مکہ بھیجا ہے۔ اس کے ذریعے میں نے چچا جان کو تمام حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے شادی کی اجازت بھی مانگی ہے۔"
"اچھا!"
بوڑھا باپ خوش ہو گیا:
"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ کب تک جواب آنے کی امید ہے؟"
"وہ کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہے چچا جان۔"
ابنِ حاتم نے جواب دیا:
"جہاں آپ نے اتنا انتظار کیا ہے کچھ اور انتظار کر لیجیے۔"
پھر اس نے لجاجت سے کہا:
"یہ میری ایک طرح سے آپ سے درخواست ہے۔ اس آدمی کے واپس آتے ہی میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لوں گا۔"
"درخواست کی کیا بات ہے بیٹے!"
نوحنا کے والد نے نرمی سے کہا:
"ہم انتظار کر لیں گے۔ اللہ کچھ نہ کچھ بہتری کرے گا۔"

ابنِ حاتم نے ایک ہفتہ مزید اس گھر میں قیام کیا مگر اس میں اور اس کی منگیتر نوحنا میں گفتگو کم ہی ہوتی۔ دونوں خاموش خاموش رہتے۔
نوحنا اس لیے چپ چپ تھی کہ اس کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ ابنِ حاتم کے آنے سے اس کی صحت پر اچھا اثر پڑا تھا مگر اب اس پر یہ فکر سوار ہو گئی تھی کہ اگر ابنِ حاتم کے چچا نے اسے شادی کی اجازت نہ دی تو کیا ہو گا؟
ابنِ حاتم اپنی جگہ پریشان تھا۔
اس نے نوحنا کے والدین سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک ماہ گزرنے پر کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کرے گا اور تین ہفتے گزر چکے تھے۔ اس نے جس آدمی کے ذریعے نعیم بن مسعود کو پیغام بھیجا تھا اس کی طرف سے ابھی کوئی جواب نہ آیا تھا۔
دراصل ابنِ حاتم ایک تذبذب اور الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے ہر وقت یہ فکر ستاتی رہتی تھی کہ اگر اس نے بغیر چچا سے اجازت حاصل کیے نوحنا سے شادی کر لی تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا اور اگر اس نے شادی سے انکار کر دیا تو نوحنا کی کیا حالت ہو گی!
پھر ایک دن مکہ سے جواب آ گیا۔
جواب اسے دو ذرائع سے موصول ہوئے۔
ایک تو اس شخص نے ابنِ حاتم کو جواب بھیجا تھا جسے اس نے خود درخواست کی تھی۔ یہ شخص مکہ پہنچتے ہی فوری طور پر نعیم بن مسعود سے ملا تھا اور نعیم نے اسے اسی وقت جواب دے دیا تھا۔
دوسرا جواب دراصل جواب نہیں بلکہ نعیم کا حکم نامہ تھا جو انہوں نے اپنے قاصد کے ذریعہ ابنِ حاتم کو بھیجا تھا۔
نعیم بن مسعود کے دونوں جوابوں یا حکموں کا متن ایک ہی تھا۔ انہوں نے دونوں متذکرہ ذرائع سے ابنِ حاتم کو حکم دیا تھا کہ:
"فوراً مکہ واپس آ جاؤ۔ حالات بہت گمبھیر ہو گئے ہیں۔"
ابنِ حاتم کو یہ دونوں حکمنامے صرف ایک گھنٹے کے فرق سے آگے پیچھے ملے اور اس کے دماغ پر دوہرا بم گرا گئے۔
چچا کا حکم نامہ دو باتوں کو ظاہر کرتا تھا:
ایک بات تو یہ کہ اسے فوراً واپس بلایا گیا ہے۔ یہ ایسی بات نہ تھی جس سے ابنِ حاتم زیادہ پریشان

ہوتا۔ اسے مدینہ آئے ہوئے ایک ماہ ہونے والا تھا اس لیے چچا کا اسے واپس بلانا ایک عام سی بات معلوم ہوتا تھا۔

لیکن ۔۔۔ حکمنامے کی دوسری بات حالات کی گھمبیرتا کو ظاہر کرتی تھی اور یہ بات اس کے لیے بے پریشان کن تھی۔

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا حالات پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے نعیم بن مسعود کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اسے فوراً واپس طلب کر لیں اور اس کے واپس نہ جانے یا دیر کرنے کی صورت میں حالات کی گھمبیرتا کا اظہار کیا ہے۔

نعیم بن مسعود نے ابنِ حاتم کے مدینہ کے سفر کے سلسلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس نے ابنِ حاتم کو قریشِ مکہ کے سردار ابوسفیان کے پاس بھیج کر اس سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ یہ اجازت تحریری نہ تھی مگر ابوسفیان کا حکم قریشِ مکہ کے لیے "لات و منات"[1] کے حکم سے کم درجہ نہ رکھتا تھا۔

ابنِ حاتم کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے میزبانوں اور خصوصاً نوحنا سے حالات کی سنگینی کا ذکر کر کے واپسی کی اجازت مانگے لیکن کم از کم نوحنا سے یہ بات کرتے ہوئے اسے انتہائی شرم محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے کچھ دن پہلے نوحنا کو تسلی دی تھی کہ ایک ماہ پورا ہونے کے بعد وہ کوئی قدم اٹھائے گا۔ نوحنا نے اس سے یہی مطلب لیا تھا کہ ابنِ حاتم اس سے شادی کر لے گا۔ ابنِ حاتم کا بھی شاید یہی ارادہ تھا لیکن مکہ سے آمدہ حکمنامے نے اس کے ہاتھ پیر شل کر دیے تھے۔

چنانچہ ۔۔۔

وہ ڈرتے ڈرتے اور سر جھکائے نوحنا کے باپ کے پاس پہنچا۔ نوحنا اور اس کی ماں بھی دونوں اس وقت وہیں موجود تھیں۔

ابنِ حاتم کا مضبوط دل ان تینوں کے چہرے دیکھ کر کانپ اٹھا۔ وہ بڑی امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"خالو جان اور خالہ اماں!"

اس کے منہ سے صرف اتنے ہی الفاظ ادا ہو سکے۔ پھر اس نے مکہ سے چچا کا بھیجا ہوا تحریری حکمنامہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

نوحنا اور نوحنا کے والد کچھ واجبی سے پڑھے لکھے تھے مگر نوحنا کی والدہ تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھیں۔

۱۔ کفار کے دو بڑے بت

نوحنا ان کے برابر کے پلنگ پر بیٹھی تھی اس لیے اس کی نظریں تحریر تک نہ پہنچ سکیں اور نوحنا کے والد کو تنہا وہ حکمنامہ پڑھنا پڑا۔

حکمنامہ مختصر تھا پھر بھی یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں اسے پڑھ جاتے مگر وہ خط کی چند ہی سطریں پڑھ پائے تھے کہ انہیں ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے ان کی آواز حلق میں پھنس گئی ہو حالانکہ وہ خط زیرِ لب پڑھ رہے تھے۔

ایک جھٹکے کے ساتھ نوحنا کے والد کا سر ایک طرف جھک گیا۔ اگر نوحنا کی ماں انہیں نہ سنبھالتی تو سر پٹی سے ٹکرا جاتا۔

انہیں سنبھال کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ ابنِ حاتم نے اس میں نوحنا کی والدہ کی مدد کی۔ اسی دوران نوحنا کو وہ خط مل گیا جو ان کے ہاتھ سے بستر پر گر گیا تھا۔

نوحنا نے خط پڑھا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور باپ کا یوں چکرا جانا اس کی سمجھ میں آ گیا۔ بات ہی ایسی تھی۔

نوحنا نے خط پڑھنے کے بعد اسے بستر پر ہی چھوڑ دیا۔ پھر ماں کو دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔

ابنِ حاتم کی نظریں ان دونوں کے تعاقب میں تھیں۔ اس نے نوحنا کو خط پڑھ کے بستر پر ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ ماں کو اشارہ کرنے سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ نوحنا ماں کو خط کی تحریر سے آگاہ کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں لے گئی ہے۔

نوحنا کے والد بستر پر بے سُدھ پڑے تھے۔

نوحنا اپنی ماں کے ساتھ دوسرے کمرے میں گفتگو کر رہی تھی، اور ابنِ حاتم نوحنا کے باپ کی پائنتی بیٹھا خیالات کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

اسے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ چچا کے خط کے بارے میں سب کو علم ہو چکا ہے۔ نوحنا کے باپ نے خط خود پڑھا تھا۔ اس کے بعد نوحنا نے خط پڑھا اور اب وہ اپنی ماں کو خط کے بارے میں بتا رہی ہو گی۔

اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کیا قدم اٹھانا چاہیے؟

ظاہر ہے کہ نوحنا اور اس کے والدین ابنِ حاتم کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں بلکہ شاید ناراض بھی۔ اس لیے اب اس کا اس گھر میں ایک پل بھی ٹھہرنا رہے سہے تعلقات کو ختم کر سکتا تھا۔

خیالات کا دھارا اسے کہیں سے کہیں بہائے لیے جا رہا تھا کہ نوحنا اور اس کی ماں کمرے میں واپس آ گئیں۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتیں ابنِ حاتم نے بولنے میں پیش قدمی کی:

"میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس وقت آپ صرف میری بات سنیں۔ پھر آپ جو مناسب سمجھیں کر لیجیے گا۔"

نوحنا کی ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا تو بیٹی نے سر جھکا کر نیم رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ابنِ حاتم نے اس پر فوراً ہی بولنا شروع کر دیا۔

"میں اپنے مرے ہوئے باپ اور ماں کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں زندہ رہا اور میں نے شادی کی تو وہ صرف نوحنا ہو گی جو میری بیوی بنے گی۔

اس کے ساتھ ہی میں اس بات کا بھی اعلان کرتا ہوں کہ نوحنا اور آپ لوگ جس جگہ چاہیں مجھے اطلاع دیے بغیر نوحنا کی شادی کر سکتے ہیں۔ مجھے کوئی گلہ شکوہ نہ ہو گا۔"

نوحنا کی ماں کو ابنِ حاتم کی بات پر اطمینان سا ہو گیا:

"ہمیں تم پر اعتماد ہے ابنِ حاتم۔"

وہ مدھم آواز میں بولیں:

"نوحنا جب تک شادی کرنے پر آمادہ نہ ہو گی ہم اپنی طرف سے اس پر کوئی زور نہ دیں گے۔"

ابنِ حاتم نے فوراً نوحنا کی طرف دیکھا۔

وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو وہ کچھ مایوسی کے عالم میں اس کی صورت دیکھتی رہی پھر نظریں نیچی کر لیں۔

ابنِ حاتم ایک دبی دبی آہ بھر کر کھڑا ہو گیا۔

"نوحنا!"

اس نے دھیمے لہجے میں کہا:

"خالو جان کا ضعیفی کا عالم ہے۔ اب گھر کی ذمہ داری تم پر ہے۔ گھر سنبھالو اور جب تک انتظار کر سکتی ہو کر لینا۔ پھر تمہیں اختیار ہے۔

میں حالات درست ہوتے ہی مدینہ واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مدینہ کو ہی اپنا وطن بناؤں گا اور ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

ابنِ حاتم نے بڑی تیزی سے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور گھوڑے کو ساز پہنا کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

نوحنا کے والد کی طبیعت اس وقت تک سنبھل گئی تھی۔ رخصت کے وقت وہ بھی دروازے پر موجود تھے۔

الوداعی منظر بڑا دردناک تھا۔

کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ صرف ہونٹ تھرتھرائے اور آنکھیں خلوص و محبت کے موتی برساتی رہیں۔

ابنِ حاتم اپنے چچا کا حکم نامہ پاتے ہی مدینہ سے رخصت تو ہو گیا مگر اس کا دل مدینہ ہی میں تھا۔ خالو اور خالہ کی ضعیفی کا عالم اور نوحنا کی بے بسی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور اس کا سفر بھی بے دلی سے کٹ رہا تھا۔ اس کی رفتار بھی سست ہی تھی۔





اس کے سفر کی آخری منزل تھی۔

ابنِ حاتم نے یہ منزل طے کرنے کے لیے گھوڑے پہ سامان بار کیا ہی تھا کہ تین سواروں نے تیزی سے اسے آ گھیرا۔

ابنِ حاتم نے انہیں بڑے تعجب سے دیکھا۔ اس لیے کہ اسے مکہ اور اس کے اطراف کے لوگ اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ اس کا قبیلہ بنو غطفان بھی مکہ کے قریب ہی آباد تھا اور وہ سردار نعیم بن مسعود اشجعی کے بھتیجے کے طور پہ دور و نزدیک ہر جگہ پہچانا جاتا تھا۔

پھر اسے ان سواروں نے کیوں گھیرا؟

آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟

اس نے انہیں تیز نظروں سے گھورا:

”کون ہو تم لوگ اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ ابنِ حاتم کا لہجہ تند و تلخ تھا۔

”ہم تمہیں مکہ لے کر جائیں گے۔“ ایک سوار نے جواب دیا۔ اس کا انداز بھی کرخت تھا۔

”تم جانتے نہیں میں کون ہوں!“

ابنِ حاتم نے انہیں مرعوب کرنا چاہا۔

”ہم جانتے ہیں۔“ اسی سوار نے جو شاید ان کا سردار تھا، جواب دیا:

”اور اسی لیے کہا ہے کہ تمہیں ہمارے ساتھ مکہ چلنا ہوگا۔“

”اور میں کہتا ہوں کہ تم مجھے نہیں جانتے۔“

ابنِ حاتم کا لہجہ اور تلخ ہو گیا:

”ورنہ اس طرح کی گستاخی کی جرأت نہ کرتے!“

”تم ابنِ حاتم ہو نا!“

سوار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا:

”بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود اشجعی کے بھتیجے۔ کیا میں نے غلط کہا؟“

ابنِ حاتم کو اک دم طیش آ گیا:

”بے شک تم نے ٹھیک کہا۔“

اس نے گرج کر کہا:

”تم یقیناً مجھے جانتے ہو مگر یہ نہیں جانتے کہ بنو غطفان کے جوان سوائے اپنے سردار کے کسی اور کا حکم نہیں مانتے!“

اس کے ساتھ ہی ابنِ حاتم نے تلوار کھینچ لی۔

تینوں سوار ذرا جھجکے۔ پھر ان کا سردار نرم پڑ گیا۔

”جھگڑا نہ کرو ابنِ حاتم۔“

وہ ہاتھ اٹھا کر بولا:

”ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے۔ ہمارے سردار ابوسفیان نے تمہیں اپنے پاس بلوایا ہے۔ چل کے ان کی بات مان لو، پھر اپنے قبیلے چلے جانا۔“

ابنِ حاتم کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چیخ کے بولا:

”کیا ابوسفیان نے مجھے اپنے پاس بلانے کے لیے چچا نعیم بن مسعود کی اجازت حاصل کی ہے؟“

”ابنِ حاتم!“

سوار سردار گھبرا گیا:

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابوسفیان تمام قریش کے سردار ہیں۔ تمہارے چچا نعیم بن مسعود کے بھی سردار ہیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہ کہا جائے گا۔“

ابنِ حاتم نے تلوار ہوا میں لہرائی:

”ضمانت کی ضرورت انہیں پڑتی ہے جن کی کلائیوں میں تلوار سنبھالنے کی طاقت نہ ہو۔ میرے ہاتھ

معذور نہیں ہیں"۔

"مگر۔۔۔ مگر تمہیں لانے کا حکم دیا گیا ہے"۔

سوار سردار نے جھجک کر کہا:

"ہم اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہیں"۔

اور اس نے بھی تلوار نکال لی۔

"اور میں اپنی حفاظت کرنے پر مجبور ہوں"۔

ابنِ حاتم کی تلوار سوار سردار کی تلوار سے الجھ گئی۔

باقی دونوں سوار بھی تلواریں سونت کر ابنِ حاتم کے مقابلے پہ آ گئے اور وہاں ایک اور تین کے درمیان معرکہ شروع ہو گیا۔

سرائے کے آدمیوں نے تلواریں چلتی دیکھیں تو دم کے دم میں بھیڑ لگ گئی۔ ابنِ حاتم اگرچہ نوعمر نوجوان تھا مگر ایک سردار کا بیٹا اور ایک عرب امیر کا بھتیجا تھا۔ شمشیر زنی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اگرچہ اس پر تین اطراف سے حملہ ہو رہا تھا لیکن وہ اپنا گھوڑا مسلسل حرکت میں رکھے ہوئے تھا تاکہ دشمن کے گھیرے میں نہ آ سکے۔

چند ہی لمحوں کی لڑائی کے بعد حملہ آور سواروں کو معلوم ہو گیا کہ وہ ابنِ حاتم کو زندہ گرفتار کرنا تو ایک طرف رہا اس کے مقابلہ میں زیادہ دیر ٹھہر بھی نہیں سکتے۔

ذرا سے مقابلے کے بعد ہی ان میں سستی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ پھر ابنِ حاتم نے گھوڑا تیزی سے گھما کر ایک سوار کو جھکائی دی اور ایسا ہاتھ مارا کہ تلوار اس کے شانے کو تراشتی ہوئی سینے میں اتر گئی۔ وار اس قدر مہلک تھا کہ سوار اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور زین سے لٹک گیا۔ باقی دونوں سواروں نے یہ منظر دیکھا تو وہ گھوڑے موڑ کر بھاگ نکلے۔

ابنِ حاتم نے بجائے ان کا تعاقب کرنے یا وہاں ٹھہرنے کے گھوڑے کو ایڑی دی اور لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

○

جس وقت ابنِ حاتم مدینہ میں تھا تو ابوسفیان کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ ابنِ حاتم مسلمان ہو گیا ہے

اور اس کے چچا نعیم بن مسعود اشجعی نے اسے خالہ کی بیٹی کی بیماری کے بہانے مدینہ روانہ کر دیا ہے۔

ابنِ حاتم اور ابوسفیان میں اجازت مانگتے وقت ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ اس خبر سے وہ بہت چڑ اٹھا اور اس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعہ نعیم بن مسعود سے شکوہ کیا کہ وہ اپنے بھتیجے ابنِ حاتم کو فوراً مدینہ سے طلب کرے ورنہ وہ خود صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت اسے مدینہ سے طلب کر لے گا۔

نعیم بن مسعود نے بات بڑھانے کے بجائے ابوسفیان کے قاصد ہی کے ذریعہ اسے یہ پیغام بھجوا دیا کہ:

"ابنِ حاتم، قریشِ مکہ کے سردار کی اجازت سے ایک ماہ کے لیے مدینہ گیا ہے۔ اگر وہ ایک ماہ کے بعد بھی واپس نہ آیا تو میں خود اس کے خلاف سخت اقدام کروں گا اس لیے سردارِ قریش کو فی الحال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔

پتہ نہیں قاصد نے ابوسفیان سے کس طرح اور کن الفاظ میں نعیم بن مسعود کا جواب پہنچایا کہ وہ غصہ میں آ گیا اور اس نے فوراً ہی نعیم کو دوسرا پیغام بھیجا۔

ابوسفیان کا یہ پیغام بھی زبانی ہی تھا۔ اس کے قاصد نے کہا:

"قریش سردار ابوسفیان نے نعیم بن مسعود اشجعی کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ انہوں نے جس وقت ابنِ حاتم کو مدینہ جانے کی اجازت دی تھی تو ابنِ حاتم اپنے پرانے دین پہ، جس پہ تمام اہلِ مکہ اور خود آپ بھی چلتے ہیں، قائم تھا۔ لیکن وہ مدینہ پہنچ کے بے دین ہو گیا ہے اور مدینہ کے کاہن اور جادوگر (نعوذ باللہ) محمدؐ بن عبداللہ کے لائے ہوئے دین میں شامل ہو گیا ہے اس لیے سردارِ قریش ابوسفیان اپنے اجازت نامے کو منسوخ کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ نعیم بن مسعود اس بے دین کو مدینہ سے بلوا کر ہمارے حوالے کریں تاکہ اسے سزا دی جا سکے یا پھر ہم ابنِ حاتم کو خود مدینہ سے صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت محمدؐ بن عبداللہ سے طلب کریں؟"

بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود کو سخت غصہ آیا۔ انہوں نے چاہا کہ ابوسفیان کو نہ صرف سخت جواب دیں بلکہ اس سے جنگ شروع کر دیں مگر انہیں فوراً ہی حضورِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آ گیا۔

نعیم بن مسعود نے جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پہ مسلمان ہو کر اسلام قبول کیا تھا تو حضورؐ نے انہیں

ا۔۲ : صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

حکم دیا تھا اور ان سے عہد لیا تھا کہ وہ اپنے اسلام کو فی الحال ظاہر نہیں کریں گے اور مکہ میں ٹھہر کے بے کس اور مجبور مسلمانوں کی، جو ابوسفیان کی قید میں ہیں حتی الامکان مدد کرتے رہیں گے۔

یہ بات سوچ کر نعیم نے ابوسفیان کو مندرجہ ذیل جواب بھجوایا:

"قریش سردار ابوسفیان کا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ میرا بھتیجا مدینہ پہنچ کے بے دین ہو گیا ہو، حالانکہ ابھی تک مجھے اس کے بارے میں اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔

بہر حال میں ابنِ حاتم کو فوراً واپس بلوا رہا ہوں اور اگر یہ ثابت ہُوا کہ واقعی وہ بے دین ہو گیا ہے تو میں اسے قریش سردار کے حوالے کرنے میں قطعی پس و پیش نہ کرونگا"۔

نعیم بن مسعود کا جواب بڑا معقول تھا اور ابوسفیان کو اس سے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ بڑا اشتعال دماغ تھا اور مسلمانوں کے ہاتھوں پیہم شکستوں سے بوکھلایا ہوا تھا۔ کچھ دشمنوں نے بھی لگائی بجھائی کی تھی اور اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ بنو غطفان کا سردار دراصل مدینہ کے سالار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صلح کی بات چیت کر رہا ہے اور اس نے ابنِ حاتم کو اسی سلسلے میں مدینہ بھیجا ہے۔

چنانچہ اس نے مطمئن ہونے کے بجائے مدینہ سے آنے والے راستوں پر مامور پہریداروں کو فوراً یہ پیغام بھجوا دیا کہ ابنِ حاتم جس وقت بھی مدینہ سے واپس آئے تو اسے بنو غطفان کی طرف جانے سے روک کر بہر صورت ابوسفیان کے پاس پہنچایا جائے۔

اس وقت کا یہ واقعہ جس میں ابنِ حاتم کے ہاتھوں ایک آدمی مارا گیا تھا، ابوسفیان کے اسی حکم کا ردِ عمل تھا۔ ابوسفیان کے سواروں نے ابنِ حاتم کو ایک عام نوجوان سمجھ کر گھیر لیا اور اسے ابوسفیان کے پاس چلنے کا حکم دیا تھا مگر جب ابنِ حاتم نے ان کا مقابلہ کر کے ان میں سے ایک کو ختم کر دیا تو باقی دو اپنی جانیں بچا کے بھاگ کھڑے ہوئے مگر وہ زیادہ دور نہیں گئے۔

قریب ہی ان کی چھاؤنی تھی۔ وہ گھوڑے بھگاتے چھاؤنی میں پہنچے اور وہاں موجود سواروں کو بتایا کہ قریش سردار ابوسفیان نے جس ابنِ حاتم کو پکڑ کے لانے کا حکم دیا تھا وہ ایک سوار کو زخمی کر کے بھاگ گیا ہے۔

یہ سن کر چھاؤنی کے چند سوار تیار ہونے لگے۔ پھر ایک نے ان آنے والوں سے دریافت کیا:

"تم کہہ رہے ہو کہ وہ ایک آدمی کو زخمی کر کے بھاگ گیا ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی"۔

ایک بھگوڑے نے بات بنائی:

"اس میں نہ سمجھ آنے والی کیا بات ہے۔ ہم تین تھے اور وہ اکیلا مگر وہ چھلاوہ تھا۔ بڑا شہزور اور بہترین شمشیرزن۔ ہم نے اسے گھیر لیا مگر اس نے ایسی تلوار چلائی کہ ہم حیران رہ گئے"۔

"اور یہ حیرانی تمہیں یہاں بھگا لائی!"

یہ آواز چھاؤنی کے کماندار کی تھی جو اُن کی باتیں سن کے وہاں پہنچا تھا:

"تم لوگ بزدل ہو۔ تین ہو کے تم ایک کو نہ پکڑ سکے۔ کم از کم زخمی تو کر دیتے اسے"

"ہم نے اس کا سخت مقابلہ کیا تھا"

ایک بھگوڑے نے شیخی بگھاری:

"مگر وہ بہت پھرتیلا تھا۔ جُل دے کے نکل گیا"۔

"بے شرمو۔ شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے"۔

سردار نے ڈپٹ کر کہا:

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اس سے ڈر کے بھاگ آئے ہو۔ اگر تم نے مقابلہ کیا ہوتا تو وہ کیسے بھاگ سکتا تھا۔ اور اگر وہ بھاگا تھا تو تم نے اس کا پیچھا کیوں نہ کیا۔ یہاں کیوں آئے ہو؟"

ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے شرم سے گردنیں جھکا لیں۔

سردار نے ان کو ساتھ لیا اور ابنِ حاتم کے تعاقب میں چل پڑا۔

"گھوڑے تیز بھگاؤ"۔

سردار نے گھوڑے کو مہمیز کرتے ہوئے کہا:

"ابھی وہ دُور نہیں گیا ہوگا"۔

ان دونوں نے بھی گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور تینوں گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد انہیں ایک سوار عام رفتار سے جاتا دکھائی دیا۔

ایک بھگوڑے نے ادھر اشارہ کیا:

"وہ جا رہا ہے سردار"۔

تینوں گھوڑے دوڑا کر ابنِ حاتم کے پاس پہنچ گئے۔ ابن حاتم تعاقب کرنے والوں کے گھوڑوں کی آوازیں سن کر پہلے ہی رک چکا تھا۔ اس نے آنے والوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں دیکھیں تو خود بھی تلوار نکال کر لہرانے لگا۔

قریب آ کر چھاؤنی کے سردار نے کڑک کر اسے حکم دیا:

"تلوار پھینک دو جوان اور ہمارے ساتھ سردار ابوسفیان کے پاس چلو۔"

ابنِ حاتم نے تلوار لہراتے ہوئے جواب دیا :

"یہ بات مجھ سے پہلے بھی کہی گئی تھی۔"

"وہ بات تھی۔ یہ میرا حکم ہے"۔ سردار نے سخت لہجے میں کہا۔

ابنِ حاتم اسی طرح تلوار لہراتا رہا۔ پھر متانت سے بولا :

"اس طرح کے حکم کا جواب میری تلوار پہلے بھی دے چکی ہے اور چاہو تو تلوار سے پھر جواب لے سکتے ہو۔"

"تم سیدھی طرح نہیں مانو گے"۔

یہ کہتے ہوئے سردار نے ابنِ حاتم پر بھرپور وار کیا۔

ابنِ حاتم نے بڑی پھرتی سے گھوڑا اٹھا کر اس کا وار بچایا مگر اس کا دایاں پیر ناگہانی طور پر رکاب میں الجھ گیا۔ وہ بڑی پھرتی سے اپنا گھوڑا ان سے کچھ دور بھگا لے گیا تاکہ اسے رکاب سے اپنا پاؤں نکالنے کا موقع مل جائے۔

اس نے کوشش بھی کی لیکن اسی دوران ایک ساتھ تین تلواریں اس کی اٹھی ہوئی تلوار سے ٹکرائیں۔ اس سے ابنِ حاتم کا ہاتھ جھک گیا اور ایک سوار کی تلوار اس کے شانے سے پھسلتی ہوئی قبضہ شمشیر تک پہنچ گئی۔

ابنِ حاتم کا ہاتھ بری طرح زخمی ہو کر جھول گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دوسرے ہی لمحے دشمن کی تلواریں اس کے سینے تک پہنچ گئیں۔

ابنِ حاتم مجبور ہو گیا۔

ایک سوار نے گھوڑے سے اتر کر ابنِ حاتم کے دونوں ہاتھ جن میں سے ایک زخمی تھا، پیچھے کی طرف لے جا کر باندھ دیے۔

ان سواروں نے ابنِ حاتم کے گھوڑے کی باگیں بھی خود ہی سنبھال لیں اور اسے گرفتار کیے ہوئے مکہ کی طرف چل پڑے۔

مشہور ہے کہ اچھی خبر دیر میں مگر بری خبر پر لگا کر اڑتی ہیں اور پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

جہاں یہ واقعہ پیش آیا وہاں سے کوئی گزرتا ہوا دکھائی نہ دیا لیکن پھر بھی اس واقعہ کو کسی نے دیکھ لیا اور مکہ میں ابنِ حاتم کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی گرفتاری کی خبر پہنچ گئی۔

مشرکینِ مکہ نے بغلیں بجائیں مگر کفار کے سنجیدہ لوگ اس واقعہ کے نتائج پر غور کرنے لگے۔ ان کے خیال میں یہ واقعہ بہت اہم تھا اور اس کے دوررس نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اس لیے کہ ابنِ حاتم کا تعلق بنو غطفان قبیلہ سے تھا اور یہ مشرکینِ مکہ کا حلیف تھا۔ پس اس صورتِ حال میں اگر وہ ابوسفیان کی مخالفت پر اتر آیا تو مشرکین میں خانہ جنگی چھڑ سکتی تھی۔

ابنِ حاتم پر دو الزامات تھے :

پہلا یہ کہ وہ مدینہ جا کے مسلمان ہو گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس نے لشکرِ قریش کے ایک سپاہی کو قتل کر دیا ہے۔

چنانچہ جب اسے ابوسفیان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس سے دونوں الزاموں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی۔ چونکہ سپاہی کے قتل کا الزام زیادہ سنگین تھا، اس لیے ابوسفیان نے ابنِ حاتم سے پہلے اسی بارے میں تفتیش کی۔

ابوسفیان نے دریافت کیا :

"ابنِ حاتم۔ تم نے ایک قریش سوار کو بلا وجہ قتل کر دیا۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے ؟"

ابنِ حاتم، جسے زخمی ہونے کے باوجود زنجیریں پہنا دی گئی تھیں، اس نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا :

"میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کی ہے !"

"خودکشی ؟"

ابوسفیان نے چونک کر اسے دیکھا :

"تم جھوٹ بول رہے ہو ابنِ حاتم۔ اس سوار کی موت تمہاری تلوار کے زخم سے ہوئی ہے۔ اس کے عینی شاہد موجود ہیں۔ تم کہتے ہو اس نے خودکشی کی ہے۔ کیا تم اس کی کوئی شہادت پیش کر سکتے ہو ؟"

"اے لشکرِ قریش کے سردارِ اعلیٰ"۔

ابنِ حاتم نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا :

"اگر ایک بے وقوف ایک بہادر کے سامنے تلوار لے کے کھڑا ہو جائے اور پھر وہ اس بہادر کے ہاتھ سے مارا جائے تو یہ خودکشی ہی ہوگی نا !"

ابوسفیان چکرا گیا۔

اس نے دل ہی دل میں اس نوجوان کی تعریف کی مگر زبان سے کہا :

"ابنِ حاتم۔ تم نے خود اقبال کیا ہے کہ وہ تمہارے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔ تم چونکہ ہمارے حلیف قبیلہ

بنو غطفان سے تعلق رکھتے ہو اس لیے تمہیں قتل کرنے کے بجائے خوں بہا ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

تم اپنے چچا نعیم بن مسعود کو اطلاع دو کہ وہ خوں بہا کے طور پر پچاس اونٹ بھیج کے تمہیں اس الزام سے بری کرائیں"۔

ابن حاتم صرف غصے سے ابو سفیان کو گھورتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

چند لمحوں بعد ابو سفیان نے پھر کہا:

"اب تمہیں اپنے دوسرے الزام کا جواب دینا ہے جو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ وہ جرم یہ ہے کہ تم بہانہ کر کے مدینہ گئے اور وہاں جا کے مسلمان ہو گئے۔ اس کا تم کیا جواب دیتے ہو؟"

"یہ دونوں باتیں غلط ہیں"۔

ابن حاتم نے کڑک دار آواز میں کہا:

"میں نے مدینہ جانے کا بہانہ نہیں کیا۔ دراصل میری منگیتر وہاں شدید بیمار ہے۔ اس کی بیماری کی خبر پا کر میں مدینہ گیا تھا اور اس کے لیے میں نے آپ سے باقاعدہ اجازت لی تھی اور آپ نے مجھے وہاں جانے کی اجازت دی تھی۔

رہی یہ بات کہ میں مدینہ جا کر مسلمان ہو گیا ہوں تو اس کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔ اگر آپ کے یا آپکو اطلاع دینے والے کے پاس کوئی ثبوت موجود ہے تو مجھے بتایا جائے ورنہ یہ مجھ پر اور بنو غطفان پر ایک ایسا الزام ہے جو کسی دشمن نے اس لیے لگایا ہے کہ بنو قریش اور بنو غطفان میں اختلاف ہو جائے اور دشمن اس سے فائدہ اٹھائے"۔

ابن حاتم کے جوابات اس قدر مدلل تھے کہ وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے سردار ابن حاتم کے طرفدار ہو گئے اور انہوں نے ابو سفیان کو مجبور کیا کہ وہ ابن حاتم کو چھوڑ دے۔

ابو سفیان بہت دیر تک غصے میں پڑا رہا پھر بہت سوچ کے بولا:

"ابن حاتم۔ میں تمہیں اپنے دوست نعیم بن مسعود سے گہرے تعلقات کی بنا پر معاف کر رہا ہوں۔ امید ہے تم آئندہ ایسی حرکت نہ کرو گے"۔

ابن حاتم اس کے سر پڑ گیا۔

"مجھے کوئی معافی نہیں چاہیے"۔

اس نے بڑے رعب سے کہا:

"نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ مجھے قریش لشکریوں نے بلاوجہ راستہ میں روک کر نہ صرف میری توہین

کی ہے بلکہ مجھ پر حملہ آور ہو کر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس وقت تک اپنے قبیلہ میں واپس نہیں جاؤں گا جب تک قریش لشکری مجھ سے معافی نہیں مانگیں گے"۔

ابو سفیان الٹا الجھن میں پڑ گیا۔

بنو غطفان کے سردار کے بھتیجے کو وہ سزا بھی نہیں دے سکتا تھا۔ دوسری طرف اب وہ اپنے فوجیوں سے کس منہ سے کہتا کہ وہ ابن حاتم سے معافی مانگیں جبکہ خود اس کے حکم سے مدینہ جانے والے راستوں پر چوکیاں قائم کی گئی تھیں اور ابن حاتم کی گرفتاری کا حکم بھی اسی نے دیا تھا۔

اس نے ابن حاتم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے قبیلے میں جانے کے لیے کسی طور راضی نہ ہوا مجبوراً اسے ایک مکان میں رکھا گیا۔

صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مسلمان اس سال حج یا عمرہ نہ کر سکیں گے اور مدینہ واپس چلے جائیں گے۔

ایک اور شرط یہ تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو مسلمانوں کے سردار اعلیٰ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے مدینہ میں پناہ نہ دیں گے بلکہ اسے مکہ واپس بھیج دیں گے۔

ان شرائط کی وجہ سے مسلمان کچھ آزردہ خاطر تھے کیونکہ پہلے تو انہیں اس سال عمرہ نہیں کرنے دیا گیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح نامہ کی تکمیل کے فوراً بعد قربانی دی اور خراش بن امیہ خزاعی سے حلق دوس کروایا[1]۔ پھر احرام کھول دیا۔

جب مسلمانوں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام کھول دیا ہے تو انہوں نے بھی جلدی جلدی سر منڈوائے یا بال ترشوانے پر اکتفا کیا اور احرام کھول دیے۔

قربانی دینے اور احرام کھولنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں بیس دن قیام کیا۔ اس دوران مسلمان آپس میں صلح حدیبیہ کی شرائط پر بحث و تمحیص کرتے رہے۔

بعض لوگ اس صلح سے خوش تھے اور بعض ناخوش۔ ہر مسلمان نے اپنی عقل و سمجھ کے مطابق اس صلح پر تبصرہ کیا اور رائے قائم کی۔

۱۔ سر منڈوانا

پھر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ کی طرف کوچ فرمایا۔ چنانچہ مدینہ واپسی کے سفر کے دوران سورہ فتح نازل ہوئی:

انا فتحنا لک فتحاً مبیناً ؕ

ہم نے آپؐ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو یہ آیت سنائی اور فرمایا:

"یہ مجھے تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے"۔

جنابِ عمرؓ نے حیرت سے پوچھا:

"کیا یہ واقعی فتحِ مبین ہے؟"

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"ہاں۔ یہ فتحِ مبین ہے!"

(ترمذی ـــ ابواب التفاسیر)

چنانچہ اس صلح نامہ کی شرائط کے بارے میں جناب عمرؓ کے دل میں جو اضطراب اور بے چینی تھی اور انہوں نے معاہدہ کے موقع پر (اپنے خیال کے مطابق) حمیتِ حق کے مخلصانہ جذبہ میں جو جذباتی مظاہرہ کیا تھا (گزشتہ صفحات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) اس کی تلافی کے لیے وہ مدتوں نفلی عبادات انجام دے کر خدا سے معافی مانگتے رہے۔

حضرت عمرؓ کے اس عمل (اعتراض) پر مخالفت اور موافقت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اس لیے اس بحث کو چھیڑنا بیکار ہے۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ جنابِ عمرؓ نے صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط پر اعتراض کیا تھا اور اپنے شک و شبہ کا اظہار بھی کیا تھا۔ پھر انہوں نے خدا تعالیٰ کے حضور اپنی معافی بھی پیش کی اور ہم جانتے ہیں اور یہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا درگزر کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

صلح حدیبیہ کی شرائط بظاہر ایک "مغلوبانہ صلح" کا تاثر دیتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے بعض صحابہ کرامؓ شکستہ دل بھی ہوئے لیکن یہ صلح تاریخِ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے جو مسلمانوں کی مستقبل کی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

مؤرخین نے اس صلح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دور بینی، معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کا شاہکار قرار دیا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانوں کے لیے دوررس نتائج اور روحانی و مادی فوائد کا ذریعہ بنایا جس کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

صلح حدیبیہ کے بارے میں آیات میں خدا نے اس صلح کو فتحِ مبین قرار دیا اور مسلمانوں کو بشارت دی کہ وہ آیندہ ایک ایسا معرکہ سر کریں گے جس کے فتح کرنے کی ان میں اس وقت طاقت نہیں۔ اس فتح سے انہیں بہت مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ تم مشرکینِ مکہ کو آج بھی شکست دے سکتے تھے لیکن اس وقت مشرکینِ مکہ میں بہت سے مرد و زن ایسے ہیں جو دل سے اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اگر تم ان سے جنگ کرتے تو وہ لوگ جو دل سے مسلمان ہیں انہیں بھی مشرکین کے ساتھ تمہارے خلاف تلوار اٹھانا پڑتی اور جنگ کے دوران تم جب ان مسلمانوں کو نشانہ بناتے تو اس سے تمہیں دوہرا نقصان ہوتا۔

پس ـــ اللہ تعالیٰ نے یہ خاص مہربانی فرمائی کہ دونوں گروہوں کو ٹکراؤ سے روک دیا۔ ورنہ وہ سارے فوائد اور مثبت نتائج جو بہ آسانی حاصل ہو رہے تھے، مسلمان ان سے محروم ہو جاتے۔

اس صلح سے مسلمانوں کو ایک باقاعدہ قوت اور ریاست کا مالک تسلیم کر لیا گیا۔

قریشِ مکہ جو مسلمانوں کا وجود تک برداشت کرنے کے روادار نہ تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کئی جنگیں لڑی تھیں انہوں نے اس معاہدہ میں مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں داخلے کا (اس سال نہ سہی اگلے سال ہی سہی) حق دیا۔

یہ مسلمانوں کی ایک عظیم فتح ہی تو تھی!

ہجرتِ مدینہ سے صلح حدیبیہ تک مسلمان اور قریشِ مکہ مسلسل برسرِپیکار رہے تھے اور ایسے حالات میں تبلیغ کا کام جو صرف امن کے زمانہ ہی میں ہو سکتا ہے، بالکل تھوڑا ہوا تھا۔ اب جبکہ دونوں طرف امن بحال ہوا تھا اور لوگ ایک سے دوسرے شہر اور علاقے میں بے خطر آ جا سکتے تھے، اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

صلح نامہ کی رُو سے قریشِ مکہ نے "اسلام" کو بھی عرب کے مروجہ مذاہب میں ایک مذہب تسلیم کر لیا تھا۔ اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عرب کے بدو قبائل کو اسلام کی تعلیم و تبلیغ شروع کی اور ان میں بہت سے قبائل حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اس معاہدہ کی ایک دوسری شق جسے اوپر بیان کیا گیا ہے وہ یہ تھی کہ اگر کوئی مشرک و کافر مکہ میں مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے تو اسے مشرکینِ مکہ واپس منگوانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا جائے تو مدینہ والے اسے واپس نہیں منگوا سکتے۔

کچھ مسلمان اس شرط کو بھی کمزوری کی علامت سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ صلح حدیبیہ مشرکین سے

دب کر کی گئی ہے۔

مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس شرط کی شدید مخالفت خالد بن ولید نے بھی کی تھی، جو اُس وقت تک مشرک تھے اور مشرکینِ مکہ کی مجلسِ مشاورت کے ممبر تھے۔

جس وقت صلح حدیبیہ کا معاملہ پیش ہوا تو خالد بن ولید مسلمانوں کے شدید دشمن تھے اور خاکم بدہن حضورِ پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تو اس قدر مخالف تھے کہ انہیں قتل کرنے کی تدبیروں میں لگے رہتے تھے چنانچہ انہوں نے پہلے تو مسلمانوں سے صلح کرنے کی شدید مخالفت کی۔ پھر جب مشرکین کے بہت سے سرداروں نے حالات کے پیشِ نظر صلح پر زور دیا تو وہ بہت مشکل سے راضی ہوئے۔

اس کے بعد جب صلح کی شرائط ان کے سامنے آئیں تو انہوں نے ایک ایک شرط پر اعتراض کیا اور خصوصاً اس شرط پر تو بہت مخالفت کی کہ اگر کوئی مشرک مکہ میں مسلمان ہو کر مدینہ بھاگ جائے تو اسے مدینہ سے زبردستی واپس منگوا کر اسے سخت قید میں رکھا جائے اور اس وقت تک اسے آزادی نہ دی جائے جب تک وہ دوبارہ مشرک نہ ہو جائے۔

ابوسفیان نے خالد کو سمجھایا تھا:

"دیکھو خالد ہماری اس شرط سے ہمارا کوئی آدمی مسلمان ہونے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ اسے علم ہوگا کہ جن کے لیے وہ مسلمان ہوا ہے وہ اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے اور اگر وہ مدینہ بھاگ جائے گا تو ہم محمدؐ سے اسے واپس منگوا لیں گے۔

دوسری بات یہ کہ اس شرط کی وجہ سے محمدؐ کہ ہمارے درمیان کسی کو مسلمان بنانے کی کوشش کی ہمت نہ ہوگی اور ان کی تعداد جتنی ہے اتنی ہی رہے گی۔"

ابوسفیان نے اس شرط کی سب سے اہم ضرورت اور اہمیت یہ بیان کی تھی کہ:

"اس شرط کی موجودگی میں ہمارا یہ معاہدہ خود پکار پکار کر کہے گا کہ مسلمانوں نے یہ معاہدہ ہم سے دب کر کیا ہے اور ہماری سخت سے سخت شرائط بھی قبول کی ہیں۔"

ابوسفیان کی تمام دلیلیں بظاہر درست تھیں لیکن اس کی نظر اُس دُور رس نقصان تک نہ پہنچ سکی جو اس شرط کی وجہ سے مستقبل میں مشرکین کو پہنچا اور جس کی طرف اپنی ذہانت کے باعث خالد بن ولید نے واضح اشارہ بھی کیا تھا۔

خالد نے اس شرط کی مخالفت میں کہا تھا کہ:

"سردار ابوسفیان۔ آپ اس شرط کو معاہدہ میں رکھ کر خود اپنے لیے ایک مستقل دردِ سر پیدا کر رہے ہیں یہ تو ایک عذاب ہے کہ اگر ہم میں سے ایک شخص مسلمان ہو کر مدینہ چلا جاتا ہے تو ہمارا صرف ایک شخص کم ہوگا لیکن ہم نے اگر اسے مدینہ سے زبردستی واپس منگوا کر قید خانے میں ڈال دیا تو وہ ہمارے دوسرے قیدیوں میں اسلام پھیلانے اور انہیں ان کے اصل مذہب سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح یہ ایک بیماری کی طرح پھیلے گا اور ہم اسے قابو نہ کر سکیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم جسے مدینہ سے واپس بلوا کر یہاں قید میں ڈالیں گے اس کے عزیز و اقارب یہاں موجود ہوں گے اور وہ جب یہ دیکھیں گے کہ ان کے ایک رشتہ دار کو آپ سخت سزائیں دے رہے ہیں تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ کیا وہ آپ کے مخالف نہ ہو جائیں گے۔"

مگر ابوسفیان نے خالد بن ولید کی بات نہ مانی جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑا۔

یہی وہ باتیں تھیں جن کا ذکر سورہ فتح میں "فتحِ مبین" کے تحت کیا گیا ہے۔ معاہدہ کی وہی شرط جسے مسلمان اپنی سبکی خیال کرتے تھے اور جس کی وجہ سے اپنا پلڑا ہلکا محسوس کرتے تھے، اور دوسری طرف خالد نے بھی اپنی سوچ کے مطابق اسے مشرکین کے حق میں برا خیال کیا تھا، اس شرط نے تو پہلے ہی قدم پر اپنا رنگ دکھا دیا تھا۔

یہ ایک اتنی بڑی تاریخی حقیقت ہے جو نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوراندیشی پر سند ہے بلکہ سورہ فتح کی عملی تفسیر بھی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صلح نامہ حدیبیہ ترتیب پا رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام اکابرین جو اس وقت تک مسلمان ہو چکے تھے، موجود ہیں۔

مشرکینِ مکہ کا نمائندہ سہیل بن عمرو ہے جسے معاہدہ پر ابوسفیان اور مشرکینِ مکہ کی طرف سے دستخط کرنا ہیں۔ وہ خاموشی سے حضرت علیؓ کو معاہدہ تحریر کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ حضرت علیؓ معاہدہ تحریر کر کے سہیل بن عمرو کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

سہیل بن عمرو پہلی ہی سطر پڑھتا ہے تو اس کا منہ غصہ سے سرخ ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ نے معاہدہ کا پہلا جملہ ابتدائیہ کے طور پر لکھا تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

سہیل نے برا سا منہ بنا کر کہا:

"میں نہیں جانتا کہ رحمٰن کون ہے۔ وہی "باسمک اللّٰھم" لکھا جائے جو ہم ہمیشہ سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔"

چونکہ اس میں کوئی کلمۂ شرک نہیں تھا اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب علی مرتضیٰؓ کو حکم دیا

کہ بسم اللہ کی جگہ وہ کلمہ لکھ دیا جائے جو سہیل بن عمرو کہہ رہا ہے۔

پس حضرت علیؓ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ باسمک اللّٰھم لکھ دیا۔

حضرت علیؓ صلح نامہ لکھ رہے تھے اور سہیل بن عمرو ان کے ساتھ لگا بیٹھا تھا اور جھک جھک کے لکھی جانے والی تحریر کو دیکھ رہا تھا۔

اثنائے تحریر میں جناب علیؓ نے ایک مقام پر "محمد رسول اللہ" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھا تو سہیل نے پھر اعتراض کیا اور بولا:

"اگر ہم آپؐ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو پھر آپؐ سے جنگ کیوں کرتے۔ اصل جھگڑا تو اسی بات کا ہے۔ اس لیے آپ اپنا نام محمدؐ بن عبداللہ لکھائیے"۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں اللہ کا رسولؐ بھی ہوں اور عبداللہؓ کا بیٹا بھی ہوں۔ میرے لیے دونوں خطاب صحیح ہیں"۔

پھر آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

"رسولؐ اللہ کی جگہ ابنؐ عبداللہؓ لکھ دو"۔

جناب علی مرتضیٰؓ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میں آپؐ کو رسولؐ اللہ تسلیم کرتا ہوں۔ پھر اس تحریر میں لکھے ہوئے ان الفاظ کو اپنے قلم سے کس طرح کاٹ دوں؟"

اس پر آپؐ نے حضرت علیؓ سے قلم لے کر ان الفاظ کو خود ہی قلمزد کر دیا۔

چونکہ صلح نامہ حدیبیہ تاریخ اسلام کا سب سے اہم صلح نامہ ہے اس لیے ہم اسے ایک بار پھر یہاں درج کر رہے ہیں تاکہ ہر مسلمان بچہ و جوان، بوڑھا اور مرد و زن اسے حفظ کر لیں اور وقت ضرورت اس کا حوالہ دے سکیں۔

صلح نامہ حدیبیہ

یہ صلحنامہ (معاہدہ) محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا ہے۔

انہوں نے یہ سمجھوتہ کیا ہے کہ:

۱۔ فریقین دس برس تک جنگ بندی اور صلح رکھیں گے اور سب امن و امان سے رہیں گے۔ کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا۔

۲۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ قریش مکہ میں سے اگر کوئی شخص حلقہ بگوش اسلام ہو کر مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر محمدؐ کے اصحابؓ میں سے کوئی فرد مدینہ چھوڑ کے قریش کے پاس آجائے گا تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

۴۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں گے۔ اگلے سال حج کے لیے آئیں اور صرف تین روز حرم میں قیام کریں۔ اس دوران قریش تین روز کے لیے مکہ سے نکل جائیں گے۔

۵۔ اگلے سال مسلمان آئیں تو ان کے پاس تلوار کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ ہو اور وہ بھی نیام میں ہو۔

۶۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، مسلمان جاتے وقت انہیں اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے۔

۷۔ قریش کے تجارتی قافلے مدینہ کے راستے سے گزریں تو انہیں امان حاصل ہوگی۔

جناب علی مرتضیٰؓ نے معاہدہ مکمل کرنے کے بعد قریش کے سفیر سہیل بن عمرو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"اسے اچھی طرح پڑھ لو۔ اگر کسی اور بات پر اعتراض ہو تو اسے اس میں درج کرا دو۔ دستخط ہو جانے کے بعد پھر اس میں ترمیم و تنسیخ نہ ہو سکے گی"۔

قریشی سفیر سہیل بن عمرو نے معاہدہ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔

ابھی اس نے معاہدہ کی تیسری شرط پڑھی تھی کہ سامنے کی طرف کسی کے بھاگنے کی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے فوراً نظر اٹھا کر دیکھا اور حواس باختہ ہو گیا۔

جس کے بھاگنے کی آواز سے تمام حاضرین اور خود سہیل بن عمرو چونک پڑا تھا وہ بھاگنے والا دراصل سہیل کا

اپنا فرزند ابوجندلؓ تھے۔

جنابِ ابوجندلؓ مسلمان ہو چکے تھے اور مشرکینِ مکہ نے انہیں سزا کے طور پر زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ ابوجندلؓ کی طرح کئی اور مسلمان بھی مشرکین کی قید میں تھے جو بُت پرستی چھوڑ کے اسلام لے آئے تھے اور ابوسفیانؓ کے حکم سے انہیں پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔

ابوجندلؓ، سہیل بن عمرو کے سب سے پیارے بیٹے تھے۔ جس وقت وہ اسلام لائے اور اس کی خبر سہیل کو ہوئی تو اس نے ان کو بہت سمجھایا۔

جب وہ نہ مانے تو سہیل نے انہیں سخت سزا کی دھمکی دی مگر اسلام کا چڑھا ہُوا نشہ ان کے سر سے نہ اُترنا تھا نہ اُترا۔

انہوں نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ سہیل نے انہیں ایک کمرے میں قید کر دیا اور اس پر پہرہ بٹھا دیا۔

کچھ ہی دن بعد اس بات کی خبر ابوسفیان کو ہو گئی۔ اس نے سہیل بن عمرو کو طلب کیا اور اس سے سخت الفاظ میں پوچھ گچھ کی۔

"سہیل!"

ابوسفیان نے غصے کو دباتے ہوئے کہا:

"کیا یہ درست ہے کہ تمہارا بیٹا بے دین ہو گیا ہے اور اس نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ کر مدینہ کے جادوگر کے دین کو اختیار کر لیا ہے؟"

"محترم قریش سردار ابوسفیان!"

سہیل نے جواب دیا:

"یہ ٹھیک ہے کہ میرا بیٹا بہک گیا ہے مگر وہ میرا بیٹا ہے۔ میں اسے سمجھا رہا ہوں میرا خیال ہے کہ وہ بہت جلد ہمارے دین پر واپس آ جائے گا۔"

"نہیں سہیل نہیں!"

ابوسفیان کرخت لہجے میں بولا:

"بیٹا تمہارا ہو یا میرا۔ جو دین سے پھرے گا اسے سخت سزا ملے گی۔ ہم نے دین سے پھرنے والے لوگوں کو زنجیریں پہنا دی ہیں۔ تم باپ ہو سہیل۔ تم بیٹے پر سختی نہیں کر سکتے اس لیے اسے فوراً ہمارے حوالے کر دو ہم اسے خود سزا دیں گے۔"

"محترم سردار"۔

سہیل بن عمرو گڑگڑایا:

"مجھ پر رحم کیجیے۔ میری خدمات کو دیکھیے۔ ابوجندلؓ میری اولاد ہے۔ میں نے اسے قید کر کے اس پہ سخت پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سہیل!"

ابوسفیان نے نفی میں سر ہلایا:

"جرم سب کا برابر۔ سزا بھی سب کو برابر ملے گی۔ ابوجندلؓ میرا مجرم نہیں۔ تمہارا مجرم نہیں بلکہ پوری قوم قریش کا مجرم ہے۔ اس نے ہمارے قدیم مذہب سے منہ موڑا ہے۔ اسے سخت سزا ملے گی۔"

پس—

ابوسفیان نے سہیل بن عمرو کی ایک نہ سنی اور ابوجندلؓ کو سہیل کے گھر سے زبردستی پکڑ بلوایا اور قید میں ڈال دیا۔

بت پرستی سے پھرنے والوں کی مشرکینِ مکہ نے بڑی سخت سزا مقرر کر رکھی تھی۔ انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا۔ ہفتوں کھانا نہ دیا جاتا اور دن میں تین چار مرتبہ ان پر کوڑے برسائے جاتے۔

گرفتاری کے بعد ابوجندلؓ کو بھی ایسے بیسیوں مظالم سے گزرنا پڑا۔ پہلے انہیں زنجیریں پہنائی گئیں۔ پھر بھوکا رکھا گیا۔ کوڑوں کی سزا معمول بن گئی۔

ابوجندلؓ صبر و شکر سے سب تکالیف برداشت کرتے رہے مگر اسلام نہ چھوڑا۔

جب ابوجندلؓ نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا وِرد نہ چھوڑا تو ابوسفیان کے حکم سے دوسرے قیدیوں کی طرح ان کے برہنہ جسم پر بھی کوڑے برسائے گئے۔ ان کا تمام جسم کوڑوں کے نشانات سے نیلا ہو گیا۔ جگہ جگہ سے خون ابل پڑا مگر نہ ان کا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد چھوٹا اور نہ کوڑے برسنا موقوف ہُوا۔

پھر جب ابوجندلؓ کو معلوم ہُوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ تشریف لائے ہیں اور مشرکینِ مکہ نے انہیں مقامِ حدیبیہ پر روک رکھا ہے تو وہ بے چین ہو گئے اور اس تدبیر میں لگ گئے کہ کسی طرح قید سے فرار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں پہنچ جائیں۔ مگر کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔

اسی طرح قریشِ مکہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صلح کی بات چیت چلتی رہی اور ابوجندلؓ قید سے فرار کی کوشش میں لگے رہے۔

ابوجندلؓ نے بعد میں بیان کیا کہ جن دنوں صلح حدیبیہ کی گفتگو ہو رہی تھی اور میں فرار کی تدبیریں کر رہا تھا

ان دنوں بھی مجھے کوڑوں کی سزا صبح و شام دی جاتی تھی۔ میرا پورا بدن نیلا پڑ گیا تھا اور جگہ جگہ زخم پیدا ہو گئے تھے مگر صلح کی گفتگو کے دوران جب مجھ پر کوڑوں کی بارش ہوتی تو مجھے تکلیف کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا بلکہ پہلے سے پڑے ہوئے نیل کے داغوں کی سوزش کچھ کم ہو جاتی تھی۔ پھر ایک دن مجھے فرار ہونے کا موقع مل ہی گیا۔

اس واقعہ کو ابو جندلؓ نے اس طرح بیان کیا ہے:

"وہ صلح حدیبیہ پر دستخط ہونے کا دن تھا۔ ہمارے قید خانے کا داروغہ بہت خوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ معاہدہ ہونے پر تمام قیدی آزاد کر دیے جائیں گے اور اس کی ذمے داریاں کم ہو جائیں گی۔

مگر مجھے کھانا دینے والے آدمی سے معلوم ہو گیا کہ معاہدہ کے بعد قید خانے کی سختیوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ یہ کھانا دینے والا خود بھی اندر سے مسلمان ہو گیا تھا اور تمام قیدیوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران ہمارے پیروں کی بیڑیاں کھول دی جاتی تھیں۔ اس دن کھانا دینے والے نے مجھے مشورہ دیا کہ:

"آج کسی وقت قید خانے سے فرار ہو جاؤ۔ کیونکہ داروغۂ زندان آج پورے دن کی چھٹی پر ہے"۔

چنانچہ اس کے واپس جاتے ہی میں ہاتھوں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے ساتھ قید خانے سے نکلا۔ اپنے ہاتھ چھپانے کے لیے میں نے اپنے اوپر ایک چادر ڈال لی تھی۔

کھانے کے دوران محافظ بھی ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قیدی اگر بھاگے گا تو جائے گا کہاں۔ مدینہ بہت دور تھا اور اسی لیے وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔

میں قید خانے سے چادر اوڑھے ہوئے نکلا۔ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کسی نے مجھ پر توجہ نہ کی۔ باہر آ کر میں نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ مجھے علم تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ پر موجود ہیں۔ اگر میں انؐ کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے ضرور بچا لیں گے۔ مگر سوال یہ تھا کہ مکہ سے حدیبیہ تک کا فاصلہ جو دس بارہ میل سے کم نہ تھا، میں کس طرح طے کروں؟

میرے ہاتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے اس لیے مجھے اپنے پکڑے جانے کا بھی خطرہ تھا مگر اللہ نے میری مدد کی۔

میں تقریباً نصف فاصلہ طے کر چکا تھا کہ مجھے ایک اونٹ گاڑی دکھائی دی جس کے ساتھ چار مسلح سوار تھے۔

سواروں نے مجھے تنہا سفر کرتے دیکھا تو ایک نے مجھ سے پوچھا:

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے جواب دیا کہ:

"میں حدیبیہ کے قریب ایک آبادی میں جا رہا ہوں۔ میں بیمار ہوں اور چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے"۔

انہوں نے مجھ پر رحم کھا کر گاڑی میں سوار کر لیا اور بتایا کہ وہ بھی حدیبیہ جا رہے ہیں اور مجھے وہاں تک پہنچا دیں گے"۔

اس طرح ابو جندلؓ مکہ سے فرار ہو کر حدیبیہ پہنچے اور اپنی زنجیروں کو چادر میں چھپائے ہوئے اسلامی فرودگاہ میں داخل ہوئے۔

ابو جندلؓ نے اپنی زنجیریں تو چھپا لیں مگر چہرہ نہ چھپا سکے۔ اگر انہیں صرف مسلمان دیکھتے تو بھی غنیمت تھا مگر جس وقت وہ خوشی خوشی اسلامی لشکر میں پہنچ کے ایک خیمہ میں داخل ہونا چاہ رہے تھے اسی وقت ان کے مشرک باپ سہیل بن عمرو کی نظر ان پر پڑ گئی۔

اس نے ابو جندلؓ کو اسلامی فرودگاہ میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔

حدیبیہ کا صلح نامہ اس کے ہاتھ میں تھا اور بیٹے کو دیکھ کر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جناب علی مرتضیٰؓ نے اس کی بگڑتی حالت دیکھی تو اسے جھنجھوڑا۔

"سہیل بن عمرو۔ کیا ہوا تمہیں۔ تم کانپ کیوں رہے ہو؟"

سہیل نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ پھر وہاں موجود تمام لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور معاہدہ کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولا:

"اے محمدؐ! معاہدہ کی شرط کے مطابق ابو جندلؓ وہ پہلا شخص ہے جسے آپ کو واپس کرنا ہوگا۔ ابھی اور اسی وقت!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعض دوسرے لوگوں کو یہ خبر مل چکی تھی کہ سہیل بن عمرو کا بیٹا ابوجندلؓ مسلمان ہو گیا ہے مگر اس وقت جو سہیل بن عمرو نے ابوجندلؓ کا ذکر کیا تو بات کسی کی سمجھ میں نہ آرہی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔

"اس معاہدہ سے ابوجندلؓ کا کیا تعلق؟"

جنابِ علی مرتضیٰؓ نے دریافت کیا:

"کہاں ہے ابوجندلؓ؟"

"اے علیؓ!"

سہیل بن عمرو چیخ کر بولا:

"ابوجندلؓ بے دین ہو چکا ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے!"

اس کے لہجے میں غصہ اور دکھ یک جا ہو گئے:

"اس جرم میں اسے زنجیریں پہنا کر قید میں ڈالا گیا ہے۔ ابھی ابھی وہ تمہارے خیموں میں داخل ہوا ہے یقیناً وہ مکہ سے فرار ہو کر تم لوگوں تک پناہ حاصل کرنے کے لیے پہنچا ہے مگر تم اسے پناہ نہیں دے سکتے۔ معاہدہ کے مطابق تمہیں ابوجندلؓ کو واپس کرنا ہوگا"۔

اس وقت سپہ سالارِ لشکرِ اسلام اور قائدِ حجاج صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"معاہدہ حدیبیہ کی دستاویز ابھی نامکمل ہے اور شرائط کی پابندی اس کی تحریر کے ختم اور مکمل ہونے پر لازم ہوگی"۔

مگر سہیل بن عمرو اکڑ گیا:

"میں معاہدہ پر اس وقت تک دستخط نہیں کروں گا جب تک ابوجندلؓ کو واپس میرے حوالے نہیں کیا جائے گا"۔

چونکہ معاہدہ کی تکمیل ضروری تھی ورنہ فوراً جنگ چھڑ جاتی اس لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجندلؓ کو بلوا بھیجا۔

وہ منظر بڑا دردناک اور صبر آزما تھا۔

ابوجندلؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پیش کیا گیا۔ ابوجندلؓ کی حالت بہت خستہ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پڑی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے اور چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور پیٹھ پر اس قدر دُرّے مارے گئے تھے کہ وہاں سے کُرتا تار تار ہو چکا تھا۔

ننگی پیٹھ اور شانوں پر دُرّوں کے نیلے نشان ابھرے ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

"اے ابوجندلؓ!"

جنابِ علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

"زیرِ تکمیل معاہدہ کے تحت مسلمان تمہیں پناہ نہیں دے سکتے۔ اس لیے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ تم اپنے باپ کے ساتھ مکہ واپس چلے جاؤ"۔

ابوجندلؓ نے اپنے جسم کے نیل دکھاتے ہوئے حضرت علیؓ اور تمام حاضرین کو مخاطب کیا:

"کیا پھر اس عذاب کے لیے کفار کے حوالے کر رہے ہو؟"

ابوجندلؓ کے اس جملے میں بڑا کرب تھا۔

ظلم و ستم کی ایک طویل داستان کی ترجمانی تھی۔

ایک گھٹی گھٹی فریاد تھی۔

ایک التجا تھی۔

وہاں موجود مسلمان تڑپ اٹھے مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا اور ابوجندلؓ کی تسلی کے لیے فرمایا:

"ابوجندلؓ! خدا تیری کشائش کے لیے کوئی سبیل نکال دے گا"۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان الفاظ نے ابوجندلؓ کے تنِ مردہ میں جیسے جان ڈال دی۔ ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

پھر جب وہ اپنی زنجیریں سنبھالتے باپ کے ساتھ مکہ کی طرف واپس چلے تو لوگوں نے دیکھا کہ ابوجندلؓ کے خشک ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ابنِ کثیر کی ایک روایت کے مطابق جنابِ عمرؓ نے بھی ابوجندلؓ کو حوصلہ دیا تھا!





اسلام اور نبیؐ اسلامی حکومت "سلطنتِ مدینہ" کی مخالفت صرف مشرکینِ مکہ ہی نہ کر رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ یہودی بھی شامل تھے۔ یہودی ہجرتِ مدینہ سے پہلے ہی مسلمانوں کے جان و مال کے دشمن اور مخالف ہو گئے تھے۔

یہود کی اسلام دشمنی کے چند موٹے موٹے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ یہود ایک زمانہ سے نبیِ آخرالزماں کے ظہور کے منتظر تھے۔ ان کے کاہنوں نے یہ بتایا تھا کہ نبیِ آخرالزماں کا ظہور ملک عرب میں ہوگا۔

اس پیش گوئی کی وجہ سے یہود دور دراز کے علاقوں سے ہجرت کر کے عرب میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

انہیں یہ یقین تھا کہ نبیؐ آخرالزماں بنی اسحاق یعنی حضرت موسیٰؑ کی اولاد ہی میں پیدا ہوگا مگر جب ہمارے حضور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے جو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد بنو ہاشم سے تھے تو یہود کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ دل ہی دل میں اسلام کے مخالف ہو گئے۔

اس صورت حال کے باوجود یہود، اسلام کی کھل کر مخالفت نہ کرتے تھے اس لیے کہ اسلام نے گزشتہ تمام پیغمبروں کی تصدیق کی تھی اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے۔

اس کے علاوہ جو احکامات قرآن میں نہ تھے ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ کتاب کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ ان کا یہ خیال تھا کہ نیا مذہب "اسلام" حضرت موسیٰؑ کے مذہب (یہودیت) کی سربلندی اور وقار کا باعث ہوگا لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ اسلام ایک منفرد حیثیت سے اُبھر رہا ہے اور اس کی تبلیغی صلاحیتیں یہودیت کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہی ہیں اس پر وہ اسلام دشمن ہو گئے!

۲۔ اسلام نے جہاں یہود کے صحیح عقائد کی تصدیق کی ہے وہاں ان کے بُرے عقائد کی پردہ دری بھی کی ہے۔ اس پر بھی یہودیوں نے اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔

۳۔ طلوعِ اسلام سے پہلے انصارِ مدینہ بُت پرست تھے اور یہودی اہلِ کتاب (توریت) تھے۔ یہودی دولت و ثروت میں بھی ممتاز تھے اس لیے انصارِ مدینہ، یہودیوں سے مرعوب رہتے تھے اور ان کے علم و فضل اور دولت و ثروت کے قائل تھے مگر اسلام لانے کے بعد انصارِ مدینہ نے یہودیوں کی عظمت و عزت کا جُوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔

۴۔ اسلام سے پہلے اوس اور خزرج کے دو بڑے قبیلے ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہتے تھے اور یہودی ان کی دشمنی کو ہوا دے کر اپنی چودھراہٹ کو قائم رکھے ہوئے تھے۔

اسلام نے ان دونوں قبیلوں کو شیر و شکر کر دیا اور یہودیوں کی چودھراہٹ ختم ہو گئی۔

۵۔ یہودی سُود خور تھے۔ وہ عربوں کو سُود پر قرض دے کر انہیں دبائے رکھتے تھے اسلام نے سُود کو حرام قرار دے دیا۔ اس سے یہودیوں کا پورا اقتصادی نظام ہل کے رہ گیا۔ اس سے بھی اسلام کے خلاف ان کی مخاصمت میں بے حد شدت آ گئی تھی۔

۶۔ یہودیوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے جھوٹ موٹ اسلام قبول کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد وہ "مرتد" ہو جاتے تھے۔ صرف

یہ تاثر دینے کے لیے کہ اسلام اگر سچا دین ہوتا تو وہ اسے چھوڑ کر "مرتد" کیوں ہوں!

۷۔ ایک مرتبہ یہودیوں نے اوس و خزرج کے درمیان پھوٹ ڈلوا دی اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خبر ہوگئی اور آپؐ نے دونوں قبیلوں میں صلح کرادی۔ اس وجہ سے یہودی اور زیادہ جل گئے۔

ایسی اور بہت سی وجوہات تھیں جن کے باعث یہودی مسلمانوں کے سخت دشمن ہوگئے تھے۔ دل کا غبار نکالنے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایذا رسانی کے لیے انہوں نے معمول بنا رکھا تھا کہ وہ آپؐ کو "السلام علیکم" کے بجائے "السام علیکم" کہتے تھے جس کے معنی ہیں "تجھ کو موت آئے"۔

حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو فرمایا:

"کم بختو! تم کو موت آئے"۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

"نرمی سے کام لو عائشہؓ!"

حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا:

"آپؐ نے سنا نہیں وہ کیا کہتے ہیں؟"

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں بتایا:

"میں بھی انہیں جواب میں صرف "علیک" کہتا ہوں"۔ (یعنی تم کو بھی!)

یہودیوں کی مخالفت جب زیادہ بڑھ گئی تو مسلمانوں کو ان کے خلاف تلوار اٹھانا پڑی۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی مصالحانہ پالیسی کے تحت یہود مدینہ کے ساتھ ایک صلح کا معاہدہ کر لیا تھا جسے میثاقِ مدینہ یا معاہدۂ یہود کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یوں تو مدینہ کے یہودی اسلام دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے لیکن جنگِ بدر جس میں مسلمانوں نے مشرکین کے خلاف شاندار کامیابی حاصل کی تھی، کے بعد مدینہ کے یہودی حسد کی آگ سے سلگ اٹھے تھے۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے آباد تھے ان میں بنو قینقاع سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ

بدطینت اور بد باطن تھے!

بنو قینقاع کا پیشہ زرگری تھا اس لیے مال و دولت ان کے پاس اتنا تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ اس قبیلے کو اپنی دلیری پر بھی بڑا ناز تھا چنانچہ اسی قبیلے نے معاہدۂ یہود کے خلاف مسلمانوں سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابن ہشام اور طبری نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے:

"بنو قینقاع وہ پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدے کو توڑا جو یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کیا تھا اور جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کے درمیانی عرصہ میں مسلمانوں سے جنگ کی"۔

اس جنگ کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

"ایک روز ایک انصار عورت یہودیوں کے بازار میں کوئی زیور خریدنے گئی۔ یہ عورت نقاب چہرے پر ڈالے ہوئے تھی۔

یہودی زرگر کے ایک حواری نے جو اس وقت دکان پر موجود تھا، انصار خاتون کا نقاب الٹ دیا اور بازار کے دوسرے یہودیوں نے اس کا مذاق اڑایا۔

اتفاق سے ایک انصاری اُدھر آنکلا۔ اس نے جو یہ ماجرا دیکھا تو اس کی غیرت اور حمیتِ اسلامی نے یہ گوارا نہ کیا اور وہ اس یہودی پر جس نے خاتون کا نقاب الٹا تھا، چڑھ دوڑا۔ اور اسے قتل کر دیا۔

اس کے جواب میں بازار بھر کے یہودیوں نے اس انصاری کو گھیر کر قتل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ فوراً موقعہ پر تشریف لائے اور مدینہ کی دولتِ مشترکہ کے صدر کی حیثیت سے آپؐ نے یہودیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا سے ڈرو۔ ایسا نہ ہو کہ بدر والوں کی طرح تم پر بھی عذابِ الٰہی نازل ہو جائے۔ اگر تم نے مسلمانوں کو ایذا رسانی سے ہاتھ نہ روکا اور صلح کے معاہدے پر عمل پیرا نہ رہے تو تمہارے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوگا جو مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہوا تھا"۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس تنبیہ پر متکبر یہود نے جواب دیا :

"ہم قریش نہیں ہیں۔ ہم سے معاملہ پڑا تو ہم بتا دیں گے کہ لڑائی کس کا نام ہے !"

یہود کے اس جواب کے بعد مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ان سے جنگ کرکے ان کی ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کا خاتمہ کیا جائے

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے ۲ھ ہجری مطابق اپریل ۶۲۴ء میں بنو قینقاع کا محاصرہ کر لیا۔

یہ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا۔

بنو قینقاع کی ساری شان دھری رہ گئی اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور معافی کے خواستگار ہوئے۔

اگرچہ وہ تمام یہودی قتل کے سزاوار تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سلول[1] کی پر زور سفارش پر ان کی جان بخشی فرما دی اور یہ ... فتنہ پرداز مدینہ بدر ہو کر ملک شام کے علاقہ اذرعات میں جا کے آباد ہو گئے۔"

مدینہ کے یہودی مسلمانوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ ایک یہودی جس کا نام کعب بن اشرف تھا، بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اس نے علمائے یہود کی ایک فوج کی فوج ملازم رکھی ہوئی تھی۔ یہ بے حد دولت مند شاعر بھی تھا اور مسلمانوں، خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سخت عداوت رکھتا تھا۔

میدانِ بدر میں مشرکین مکہ کی شکست سے اسے سخت صدمہ ہوا۔ یہ مدینہ سے مکہ گیا اور ابوسفیان سے بدر میں مرنے والوں کی تعزیت کی۔

یہی نہیں بلکہ اس نے مقتولینِ بدر (مشرکین) کا ایک پُر زور مرثیہ لکھا جس میں اس نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاف خوب ابھارا اور غیرت دلائی۔ اس مرثیہ میں اس نے مسلمانوں اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی (نعوذ باللہ) توہین بھی کی۔

۱۔ یہ بہت بڑا منافق تھا۔

پھر جب وہاں سے مدینہ واپس آیا تو دیدہ دلیری کی حد کر دی۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ہجو لکھی جسے یہ مجمع عام میں پڑھتا تھا۔ وہ عشقیہ اشعار میں مسلمان خواتین کے نام بھی لکھتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے حضورؐ کے قتل کی سازش کی۔

ان تمام باتوں کو آخر مدینہ کی دولتِ مشترکہ (اسمبلی) میں رکھا گیا اور فیصلہ ہوا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ مسلمہ بن انصاریؓ نے ۳ھ ہجری کو ربیع الاول میں شاتم رسولؐ، کعب بن اشرف کو ختم کرکے مدینہ کی فضا کو اس کی گندی باتوں اور بے ہودہ اشعار سے پاک کر دیا۔

بنو قینقاع کے بعد مدینہ میں یہود کے دو قبیلے رہ گئے تھے :

۱۔ بنو نضیر

۲۔ بنو قریظہ

میثاقِ مدینہ کے مطابق انہیں جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی طرف سے جنگ کرنا تھی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

چنانچہ اُحد کے فوراً بعد حضورؐ نے دونوں قبائل سے تجدیدِ عہد کے لیے کہا۔ بنو قریظہ نے تجدید عہد کر لیا مگر بنو نضیر نے انکار کر دیا۔

بنو نضیر کا قبیلہ مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر آباد تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے دس صحابہ کرامؓ جن میں جنابِ ابوبکرؓ، جناب عمرؓ اور جنابِ علی مرتضیٰؓ شیرِ خدا بھی تھے، قبیلہ بنو نضیر میں تشریف لے گئے تاکہ ان سے قبیلہ بنو عامر کے ان دو آدمیوں کے خون بہا کے سلسلے میں گفتگو کر سکیں جنہیں عمرو بن امیہ نے شبہ میں قتل کر دیا تھا۔

قبیلہ بنو عامر کے حضورؐ کے علاوہ بنو نضیر بھی حلیف تھے مگر بنو نضیر کے ایک یہودی نے حضورؐ پر ایک پتھر اٹھا کر آپؐ کو قتل کرنے کا قصد کیا۔ اس کی خبر خدا کی طرف سے حضورؐ کو پہنچا دی گئی اور آپؐ وہاں سے اٹھ کے آ گئے۔

آپؐ کے آنے کے بعد فوراً ہی آپؐ کے صحابہ کرامؓ بھی وہاں سے اٹھ کے آ گئے۔ اس طرح یہود کا وار خالی گیا۔

اس ذلیل حرکت کے بعد بنو نضیر نے حضورؐ کے ساتھ ایک اور ذلیل اور کمینی حرکت کی۔ وہ حرکت یہ تھی کہ بنو نضیر نے حضور اکرمؐ کو پیغام بھیجا کہ :

"آپؐ اپنے تیس علما کے ساتھ مناظرہ کے لیے تشریف لائیں۔ اگر آپؐ کے علما نے ہمارے عالموں کو قائل کر لیا تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔"

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس کے لیے آمادہ ہو گئے۔

ادھر بنو نضیر نے یہ کیا کہ اپنے تیس آدمیوں کو خنجروں اور برچھوں سے مسلح کر دیا۔ انہوں نے لمبی لمبی عباؤں کے اندر اسلحہ چھپا لیا اور مناظرے کے بہانے مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔

مگر اللہ تعالیٰ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ کو بچانا منظور تھا۔ چنانچہ بنو نضیر کی ایک عورت کو اس سازش کا علم ہو گیا۔ اس عورت کا بھائی انصاری تھا اس نے فوراً اپنے بھائی کو اس سازش کی اطلاع کرائی اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس اطلاع کے موصول ہونے پر مناظرہ کا ارادہ تبدیل کر دیا۔

بنو نضیر ہر روز ایک نہ ایک سازش کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو ایک تو ہر وقت مشرکینِ مکہ کے مقابلہ کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ دوسری طرف انہیں بنو نضیر کی سازشوں کا سامنا تھا۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ ان آستین کے سانپوں سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ فیصلہ کر کے آپؐ نے بنو نضیر کو محمد بن مسلمہؓ کے ذریعے جنگ کا پیغام بھیجا:

"تم نے باہمی معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے ہمارے شہر (مدینہ) سے نکل جاؤ۔ ورنہ دس روز بعد تم میں سے جو شخص مدینہ کی حدود میں دیکھا گیا اسے قتل کر دیا جائے گا۔"

بنو نضیر نے مدینہ چھوڑنے کے بجائے مقابلہ پہ کمر باندھی۔ دراصل انہیں عبداللہ بن ابی (منافق) نے شہ دی تھی کہ مسلمان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے۔ اس شہ پہ اکڑ کر بنو نضیر نے خود کو قلعہ بند کر لیا۔

انہوں نے بنو قریظہ کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی جنگ کے لیے تیار ہو کر نکلیں مگر بنو قریظہ نے جواب میں ان کو کہلوا بھیجا کہ:

"ہم مسلمانوں سے معاہدہ کر چکے ہیں اس لیے کھلم کھلا تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں ہماری اخلاقی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔"

مگر ظاہر ہے جنگ میں زبانی ہمدردی کام نہیں آتی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنو نضیر کا سخت محاصرہ کر لیا اور صرف پندرہ دن کے محاصرے کے بعد وہ اپنے مال و متاع کے ساتھ مدینہ چھوڑ کے خیبر کے نواح میں جا آباد ہوئے۔

یہودیوں کی زمینیں مہاجروں میں تقسیم کر دی گئیں۔ دو غریب انصار ابو دجانہؓ اور سہل بن حنیفؓ کو اس زمین سے حصہ دیا گیا۔

اب مدینہ میں یہودیوں کا آخری قبیلہ بنو قریظہ رہ گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس قبیلہ کے ساتھ بہت رعایت برتتے تھے۔ ان سے خون بہا بھی کم لیا جاتا تھا۔

اس کے برعکس بنو قریظہ نے جنگِ احزاب میں مشرکینِ مکہ سے گٹھ جوڑ کیا اور ان مکانوں پہ حملہ کرنے کی کوشش کی جہاں مسلمانوں نے اپنی خواتین اور بچوں کو رکھا تھا۔

اُن کی ان حرکتوں سے مسلمان بہت دل برداشتہ تھے اور آخر مشرکینِ مکہ کے واپس جانے کے بعد حضورؐ نے مدینہ کو اس قبیلے کی نجاست سے بھی پاک کر دیا۔ اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

ان واقعات کے بعد ہی صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔

تکمیلِ معاہدہ کے وقت مشرکینِ مکہ کے سفیر اور نمائندے سہیل بن عمرو کا بیٹا ابو جندلؓ معہ زنجیروں کے مکہ سے بھاگ کر مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

ابو جندلؓ کا باپ اس وقت تک معاہدے پر دستخط کرنے پر تیار نہ ہوا جب تک ابو جندلؓ کو اسے واپس لے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔

ابو جندلؓ کی مکہ واپسی نے قریشِ مکہ کے حلیف قبائل میں ایک نئے قسم کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خالد بن ولید نے صلح حدیبیہ کی اس شرط پر شدید نکتہ چینی کی تھی جس کے تحت اگر کوئی مشرک مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند تھے۔

چنانچہ ابو جندلؓ کی واپسی سے مکہ والوں میں ایک بار پھر باہمی اختلاف پیدا ہوا اور ابو سفیان کو مجبور ہو کر مجلسِ مشورت طلب کرنا پڑی۔

اس مجلس میں ایک بار پھر خالد بن ولید نے معاہدہ کی مذکورہ بالا شق کی شدت سے مخالفت کی اور دلیل دیتے ہوئے کہا:

"بڑے بڑے قبیلے قریشِ مکہ کے حلیف ہیں۔ اگر قبیلہ میں سے ایک دو آدمی مسلمان ہو کر مدینہ یا مسلمانوں

کے پاس چلے جاتے ہیں تو اس سے ہماری تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی لیکن اگر ہم اپنے بے دین ہو جانے والے آدمی کے لیے بار بار مسلمانوں سے اس کی واپسی کا تقاضہ کرتے ہیں تو ہو سکتا ہے کسی وقت مسلمان اس کی واپسی سے انکار کر دیں اور ہمیں محض ایک "بے دین" کے لیے جنگ کا بازار گرم کرنا پڑے۔

ظاہر ہے کہ جنگ کی صورت میں ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں آدمی قتل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مکہ اور مدینہ میں قائم کردہ امن و آشتی کی فضا ایک بار پھر درہم برہم ہو سکتی ہے۔

میرا خیال ہے بلکہ میرا یقین ہے کہ ایک بے دین بھگوڑے کے لیے جنگ چھیڑ لینا کسی طرح بھی عقلمندی نہیں ہوگی کیونکہ جنگ کا انجام کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لیے بھاگنے والوں کی واپسی پر ہمیں زیادہ زور نہیں دینا چاہیے اگر ہم اسے واپس لے آئے اور ہم نے اسے زندان میں رکھا تو وہ دوسرے قیدیوں میں ہمارے خلاف اور مسلمانوں کی موافقت میں تبلیغ کرے گا اور ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا"۔

خالد بن ولید کا یہ انتباہ بالکل درست تھا مگر سہیل بن عمرو نے خالد کی ایک نہ سنی اور صاف الفاظ میں ابو سفیان سے کہا:

"اگر سردار ابو سفیان میرے بے دین بیٹے کو اس خوف سے قید خانہ میں نہیں رکھنا چاہتے کہ وہ قیدیوں میں اسلام پھیلائے گا تو اسے میرے حوالے کر دیں۔
میں یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا بیٹا، باپ دادا کے مذہب کو چھوڑ دے اور ان کے احترام کے بجائے انہیں گالیاں دے اور پھر اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔
یہ میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ میں اسے اپنی قید میں رکھوں گا اور اسے مار مار کر کچومر نکال دوں گا، خواہ وہ مر ہی کیوں نہ جائے"!

سہیل بن عمرو کی وجہ سے ابو سفیان، ابو جندلؓ کو نہ چھوڑ سکا۔ حالانکہ خالد کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ چنانچہ اس مجلسِ مشورت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ابو جندلؓ کو پھر قید میں ڈال دیا گیا۔

خالد بن ولید کا کہنا درست ہوا۔ ابو جندلؓ جس قید خانہ میں تھے وہاں کے قیدی ایک ایک کر کے مسلمان ہونے لگے۔ صرف قیدی ہی نہیں بلکہ قیدیوں کی دیکھ بھال اور حفاظت پر مامور سپاہی بھی ابو جندلؓ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہونا شروع ہو گئے اور مجبور ہو کے ابو سفیان کو انہیں بھی قیدی بنا کے زنجیروں میں جکڑنا پڑا۔

سہیل بن عمرو مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا۔ اسے اپنے بیٹے پر بھی ترس نہیں آتا تھا اس لیے وہ کسی

دوسرے مسلمان پر ترس کیوں کھاتا۔

چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود اشجعی کا بھتیجا ابنِ حاتم اپنے کسی عزیز کی بیماری کا بہانہ کر کے مدینہ چلا گیا ہے تو اس نے ایک فتنہ برپا کر دیا۔

اس نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ:

"میرا بیٹا ابو جندلؓ مدینہ بھاگ گیا تھا تو میں اسے راستے ہی سے واپس لے آیا ہوں اور اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اب بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود کا بھتیجا ابنِ حاتم مسلمان ہو کر مدینہ گیا ہے مگر ابو سفیان اسے واپس نہیں بلواتے"۔

اس غلط تشہیر سے ابو سفیان کی بدنامی ہونے لگی۔ اس نے سہیل کو بلوا کر اسے بتایا کہ:

"ابنِ حاتم میری اجازت سے اپنی بیمار منگیتر کو دیکھنے گیا ہے اور ایک ماہ بعد لوٹ آئے گا"۔

مگر سہیل بن عمرو کی ایک ہی ضد تھی کہ:

"ابنِ حاتم کو فوراً واپس بلوایا جائے"۔

ابو سفیان نے دیکھا کہ سہیل بن عمرو اسے تمام قبائل میں بدنام کر کے رکھ دے گا تو اس نے نعیم بن مسعود پر زور دیا کہ وہ ابنِ حاتم کو فوراً مدینہ سے بلوا لے۔

ابو سفیان کے اس مطالبہ پر نعیم بن مسعود کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے ابو سفیان کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

نعیم بن مسعود نے کہا:

"سردار ابو سفیان! تم نے ابنِ حاتم کو خود ایک ماہ کے لیے مدینہ جانے کی اجازت دی تھی اس لیے ایک ماہ سے قبل اسے مدینہ سے واپس نہیں بلایا جا سکتا"!

آخر بات اتنی بڑھی کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت کچھ لوگ درمیان میں پڑے جن میں خالد بن ولید بھی تھے۔ ان تمام سرداروں نے نعیم بن مسعود کو مجبور کیا کہ جنگ کے بجائے صلح کا راستہ اختیار کریں اور ابنِ حاتم کو واپس بلوا لیں۔

سرداروں کے مجبور کرنے پر نعیم نے ابنِ حاتم کو مدینہ سے بلوا لیا۔

ابنِ حاتم بڑی بے دلی سے واپس آیا تھا مگر مکہ میں داخل ہوتے ہی اس کا مقابلہ ابو سفیان کے آدمیوں سے ہو گیا اور ان میں سے ایک اس کے ہاتھوں مارا گیا۔

پھر ابنِ حاتم کو گرفتار کر کے ابو سفیان کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابنِ حاتم کا معاملہ ابو جندلؓ سے زیادہ اہمیت

رکھتا تھا۔

ابنِ حاتم ایک طرف تو بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود کا بھتیجا تھا۔ دوسرے اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اقبال بھی نہیں کیا تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ اس نے مدینہ جانے کے لیے ابوسفیان سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ابوسفیان نے ایک مرتبہ پھر مجلسِ مشورت منعقد کی۔ اس مرتبہ مجلس میں ہر قبیلہ کے دو دو نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ دراصل مدینہ منورہ کی نئی اسلامی مملکت کے اصولوں کی نقل تھی۔

ابوسفیان کو بتایا گیا تھا کہ رسولِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو کہ مدینہ کی دولت مشترکہ کے صدر بھی ہیں ہر معاملہ میں اپنے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے ہیں۔ پس اس نے آپؐ کی نقل میں مجلسِ مشورت منعقد کرنا شروع کر دی تھی۔ حالانکہ وہ ہر مجلس میں صرف اپنی مرضی کے فیصلے کراتا تھا اور اگر کوئی مخالفت کرتا تو اس کی بات یہ کہہ کر رد کر دی جاتی کہ اس کا خیال قریش کے اجتماعی مفاد کے خلاف ہے۔

مگر ــــ

اس مجلسِ مشورت میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی اور ابوسفیان کے خیالات کی سب سے زیادہ مخالفت خالد بن ولید نے کی۔

ادھر قبیلہ بنو غطفان کی طرف سے نمائندگی کرنے کے لیے ابنِ حاتم کے چچا نعیم بن مسعود اشجعی آئے تھے۔ ان کو اس بات پر سب سے زیادہ غصہ تھا کہ ابوسفیان نے ابنِ حاتم کو مدینہ جانے کی اجازت دینے کے بعد پھر مقررہ وقت سے پہلے واپس بلوانے پر انہیں مجبور کیا۔ پھر جب وہ واپس آیا تو اس پر راستے میں قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

چنانچہ جب ابوسفیان نے یہ مسئلہ پیش کیا اور ابنِ حاتم کے ہاتھوں مارے جانے والے ایک آدمی کا خون بہا قبیلہ بنو غطفان سے طلب کیا تو نعیم بن مسعود نے بڑے سخت الفاظ میں ابوسفیان کو اس کے موقف پر لتاڑا۔

نعیم بن مسعود نے کہا:

"میرے بھتیجے ابنِ حاتم پر جتنے الزام لگائے گئے ہیں وہ سب کے سب غلط ہیں۔ بے تکے ہیں اور بے بنیاد ہیں۔

ابنِ حاتم بے شک مدینہ گیا مگر بھاگ کے نہیں بلکہ قریش کے سردار ابوسفیان سے باقاعدہ اجازت لے کر

گیا تھا۔

اس پر یہ الزام بھی غلط ہے کہ وہ وہاں جا کر مسلمان ہو گیا ہے۔ ابنِ حاتم میرا بھتیجا ہے۔ اس کے والدین کی وفات کے بعد میں نے اس کی پرورش کی ہے۔ اس کے ظاہر اور باطن کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ اس نے مذہب تبدیل نہیں کیا تو اسے بے دین کیسے کہا جا سکتا ہے۔

ابنِ حاتم پر یہ الزام بھی درست نہیں ہے کہ وہ بیماری کا بہانہ کر کے مدینہ گیا تھا اور یہ کہ اس نے وہاں جا کر شادی کر لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابنِ حاتم کی منگنی اس کی خالہ زاد نوحنا سے بچپن میں ہو گئی تھی اور وہ منگنی اب تک قائم ہے۔ نہ نوحنا کے والدین نے اور نہ ابنِ حاتم کی طرف سے میں نے یہ منگنی منسوخ کی ہے۔

جب ابنِ حاتم کو مدینہ سے پیغام ملا کہ اس کی منگیتر سخت بیمار ہے تو وہ سخت بے چین ہوا اور یہ ایک فطری امر تھا۔

میں اگر اسے مدینہ جانے کی اجازت نہ دیتا تو اس پر ظلم کرتا اور جانے کی اجازت دیتا تو سردارِ قریش کی توہین کرتا۔

ان حالات میں میں نے بہتر یہی خیال کیا کہ سردارِ قریش سے باقاعدہ اس کی اجازت حاصل کی جائے۔ پس میں نے ابنِ حاتم کو سردار سے اجازت لینے کے لیے بھیجا اور سردار نے اسے ایک ماہ کے لیے مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔

پھر اس پر مدینہ بھاگ جانے کا الزام کیوں؟

یہی نہیں بلکہ جب سردار ابوسفیان نے مجھے پیغام بھجوایا کہ انہوں نے ابنِ حاتم نے اجازت نامہ منسوخ کر دیا ہے اس لیے اسے فی الفور مدینہ سے طلب کیا جائے تو میں نے سردار کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور فوراً ابنِ حاتم کو واپس بلوا لیا۔

مگر ابنِ حاتم کی واپسی پر حالات نے ایک عجیب رخ اختیار کیا۔ ابنِ حاتم کا بیان ہے کہ وہ مدینہ سے واپس آتے ہوئے اپنے قبیلہ جانے والے راستے پر ہو لیا جہاں اسے تین مسلح سواروں نے گھیر لیا اور حکم دیا کہ وہ اپنے قبیلے جانے کے بجائے سردار ابوسفیان کے سامنے پیش ہو۔

اس بات پر ابنِ حاتم نے سرکشی اختیار کی۔ اس نے گھیرنے والوں سے کہا کہ وہ مدینہ سردارِ قریش سے اجازت لے کر گیا تھا اور مدینہ سے واپس اپنے چچا کے حکم پر آیا ہے اس لیے پہلے چچا کے پاس جائے گا۔ اس کے بعد سردارِ قریش کے سامنے پیش ہو گا۔

بس اسی پر بات بڑھ گئی اور تینوں سواروں نے تنہا ابنِ حاتم پر حملہ کر دیا۔ ابنِ حاتم نے نہ صرف انہیں مار کر

بھگا دیا بلکہ ان میں سے ایک اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس صورتِ حال میں ابنِ حاتم کو قاتل کیسے کہا جاسکتا ہے! اس نے تلوار اپنی حفاظت میں اٹھائی تھی۔ اگر وہ مقابلہ نہ کرتا تو خود مارا جاتا۔"

خالد بن ولید جو اس مجلس کے ایک سرگرم رُکن تھے۔ انہوں نے نعیم بن مسعود اشجعی کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"میں مسلسل اس بات کی مخالفت کرتا رہا ہوں کہ معاہدہ حدیبیہ کی یہ شرط ہمارے لیے کسی طرح مفید نہیں کہ مسلمان ہو کر مدینہ چلے جانے والے اہلِ مکہ کو مدینہ سے واپس منگوایا جائے۔ ایسا ہی ایک مسئلہ اسوقت درپیش ہے۔

پھر یہ مسئلہ تو زیادہ واضح ہے۔ ابنِ حاتم مسلمان نہیں ہوا۔ اس کی تصدیق اس کے چچا کر رہے ہیں۔ جو ایک معتبر شخصیت ہیں۔

ابنِ حاتم بھاگ کے مدینہ نہیں گیا کیونکہ خود قریش کے سردار ابو سفیان نے اسے ایک ماہ کے لیے مدینہ جانے کی اجازت دی تھی۔

ابنِ حاتم اپنے چچا کا حکم پاتے ہی مدینہ سے فوراً مکہ کی طرف واپس چل پڑا۔ اس نے کوئی حیلہ بہانہ نہیں کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اسے اپنے قبیلے میں جانے سے کیوں روکا گیا؟

اسے ایک غلط حکم ماننے پر مجبور کیوں کیا گیا؟

پھر تین سواروں کا ایک اکیلے جوان پر حملہ کس اصول سے جائز ہے؟

میرے خیال میں اس نوجوان کو شاباش دینی چاہیے جس نے اکیلے تین مسلح سواروں کا مقابلہ کیا اور ایک کو قتل کر کے دو کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ کیا ایک ایسا بہادر اور جری جوان لشکرِ قریش کے لیے ایک اچھا انتخاب نہ ہوگا!

میں سردارِ قریش سے سفارش کرتا ہوں کہ ابنِ حاتم کو فوراً رہا کیا جائے اور اسے لشکرِ قریش میں کسی چھوٹے سردار کا عہدہ دیا جائے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ابنِ حاتم کسی کی بیماری کا بہانہ کر کے اپنی منگیتر سے ملاقات کے لیے مدینہ گیا تھا تو یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے اور اسے حق ہے کہ وہ اپنی منگیتر سے خواہ ملاقات کرے یا اس سے شادی کر لے۔ ہمیں اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

آخر میں ایک بار پھر میں معاہدہ سے اس شرط کو حذف کرنے کی پُر زور اپیل کرتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمان ہو کر مدینہ فرار ہو جانے والے اہلِ مکہ کو واپس طلب کیا جائے گا"۔

خالد بن ولید کی اس مدلّل تقریر نے ابو سفیان کو مجبور کر دیا کہ وہ ابنِ حاتم کو معذرت کے ساتھ رہا کر دے۔

آخر ابو سفیان نے کہا:

"میں بحیثیت سردارِ قریشِ مکہ، ابنِ حاتم کو رہا کرنے کا حکم دیتا ہوں اور بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود سے معذرت کرتے ہوئے ابنِ حاتم کو لشکرِ قریش میں شامل کرنے کا حکم بھی دیتا ہوں"۔

اس کے جواب میں نعیم بن مسعود نے کہا:

"میں سردارِ قریش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جہاں تک ابنِ حاتم کا لشکرِ قریش میں شامل ہونے کا سوال ہے تو اس کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ پہلے ہی سے لشکرِ قریش میں شامل ہے کیونکہ بنو غطفان، بنو قریش کے حلیف ہیں اور میں آج سے ابنِ حاتم کو بنو غطفان کے لشکر میں شامل کر رہا ہوں"۔

اس فیصلے کا سہیل بن عمرو کو بہت افسوس ہُوا۔

وہ کٹّر مشرک تھا اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے بیٹے ابو جندلؓ نے بت پرستی سے منہ موڑ کر اپنے بزرگوں کے مذہب کی سخت توہین کی تھی جس کی سزا اس کے نزدیک کم از کم موت تھی۔

لیکن اسے اپنے ان شدت پسند خیالات پر پچھتانا پڑا جب اہلِ مکہ نے علی الاعلان صلح نامہ حدیبیہ کی اس شرط کی مخالفت شروع کر دی اور سردار ابو سفیان پر زور دیا کہ وہ مکہ سے بھاگ کر جانے والے مسلمانوں کو مدینہ سے واپس بلوانے والی شرط کو منسوخ کرائے۔

مشرکینِ مکہ کے خیالات میں یہ تبدیلی صرف ابو جندلؓ کے مدینہ سے واپس بلانے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔

ابو جندلؓ کو جب مکہ واپس لا کر پھر قید میں ڈالا گیا تو انہوں نے قیدیوں میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی اور تبلیغ بھی اس شخص سے شروع کی جو ابو جندلؓ کی حفاظت پر مامور تھا۔

ہمارے مذہب اسلام میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر خوبیاں رکھی ہیں کہ ذرا سی کوشش سے دوسرا شخص فوراً مسلمان اور اسلام کا قائل ہو جاتا ہے۔

یہی حال ابو جندلؓ کے محافظ کا ہُوا۔ وہ تھوڑی سی تبلیغ سے اسلام لے آیا۔ قید خانے کے حکام کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے یہ خبر ابو سفیان کو پہنچائی۔ ابو سفیان نے مسلمان ہو جانے والے محافظ کو بھی بے دین

قرار دے کر اسے ابوجندلؓ کے ساتھ ہی زنجیروں میں جکڑ دیا۔

مگر ___

اللہ کا دین تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا تھا۔ یہ دراصل اسلام کے اصول تھے جو ہر ایک پر اثر کر جاتے تھے۔

چنانچہ، ابوجندلؓ پر مامور ہر محافظ دو تین دن کے بعد مسلمان ہو جاتا اور ابوسفیان کو اسے بھی قیدی بنانا پڑتا۔

رفتہ رفتہ قید خانے میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ اس بات نے مشرکین اور خاص کر ابوسفیان کو ہلا کے رکھ دیا۔

ابوجندلؓ کی تبلیغ سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا لیکن ابوسفیان جیسا ضدی انسان اس بات کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس کے وقار کی گرتی ہوئی دیوار مکہ کے عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

اُدھر قید خانہ میں نئے مسلمان ہونے والے افراد جب ابوجندلؓ سے دریافت کرتے کہ:

"اے ابوجندلؓ! یہ تو بتاؤ کہ وہ کونسا خوش نصیب دن ہوگا جب ہم قید و بند سے آزاد ہو کر بے روک ٹوک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہوں گے؟"

تو ایسے موقع پر ابوجندلؓ انہیں ایک ہی جواب دیتے:

"میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اے ابوجندلؓ! اللہ تمہاری کشائش کے لیے کوئی صورت ضرور پیدا کر دے گا۔

میرا ایمان ہے کہ رسولؐ کا فرمان جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ وہ وقت آئے گا اور ضرور آئے گا جب ہم کھلے بندوں اللہ کی عبادت کر سکیں گے۔"

نبی اور رسول خدا کے سچے بندے ہوتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا کوئی لفظ جھوٹا ثابت نہیں ہوتا۔

چنانچہ وہ وقت آ گیا جب خدا نے قید و بند کی تکالیف اٹھانے والوں کی گلوخلاصی کی صورت پیدا کر دی۔

یہ صورت جس طرح پیدا ہوئی اس کا تذکرہ تاریخ میں اس طرح کیا گیا ہے:

"ابونصیر نامی ایک شخص جو مسلمان ہونے کی پاداش میں قید کی زندگی بسر کر رہا تھا، وہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ پہنچا۔

ابوسفیان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے دو آدمی مدینہ بھیجے۔ انھوں نے مدینہ پہنچ کے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ابونصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صلح نامہ حدیبیہ کا پاس تھا چنانچہ آپؐ نے ابونصیر کو مکہ سے آنے والوں کے حوالے کر دیا۔

ابونصیر نے اس وقت بہت واویلا کیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صلح نامے کی توقیر منظور تھی اس لیے ابونصیر کو واپس کر دیا۔

ابوسفیان کے دونوں آدمی ابونصیر کو لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ جب وہ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابونصیر نے جو پہلے سے تاک میں تھا، موقع پاتے ہی ان میں سے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ دوسرا یہ حال دیکھ کے الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔

ابونصیر پھر مدینہ پہنچے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اطہر میں عرض کیا:

"اے خدا کے رسولؐ! آپ نے مجھے مکہ بھیج کر صلح نامے کی شرط پوری کر دی۔ میں ایک محافظ کو ختم کر کے واپس آ گیا ہوں۔ اب آپؐ مجھے واپس نہ بھیجیے گا۔"

صورتِ حال بڑی دلچسپ مگر گھمبیر ہو گئی تھی۔

حضورؐ نے فرمایا:

"عجب لڑائی بھڑکانے والا شخص ہے۔ اگر کچھ لوگ اور ہوتے۔"

حضورؐ تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے مگر ابونصیرؓ سمجھ گئے کہ رسولِ خداؐ کا ان کا مدینہ میں رہنا منظور نہیں۔

ابونصیرؓ نے فوراً مدینہ چھوڑ دیا اور ساحلِ شام پر عیص کے مقام پر جا کر آباد ہو گئے۔

ان کے عیص میں آباد ہونے کی خبر جب مکہ کے زندانیوں کو ہوئی تو ان کے جیسے گلوخلاصی کے دن آ گئے۔ وہ قید خانہ سے فرار ہوتے اور ابونصیر کے پاس جا کر آباد ہو جاتے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سچ کر دکھائی

اور قیدیوں کی کشائش کا راستہ کھول دیا"۔

عیص میں آباد ہونے والوں کی تعداد جب ستّر کے قریب ہوگئی تو انہوں نے مشرکینِ مکہ کے ان قافلوں پر حملے شروع کر دیے جو تجارتی سامان لے کر شام اور عراق کو جاتے تھے۔

چند ہی دنوں بعد مکہ کے تاجروں کی شمالی علاقوں سے تجارت ٹھپ ہو کے رہ گئی۔ اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں نے مکہ سے مسلمان افراد کے مدینہ بھاگ جانے والوں کو واپس طلب کرنے کی شرط کیوں رکھی تھی۔

اس شرط نے تو ان کا دیوالہ نکال کے رکھ دیا تھا۔



ملکِ شام کا تجارتی راستہ مخدوش ہو جانے سے مشرکینِ مکہ کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

عیص میں آباد مسلمانوں کا تعلق چونکہ مدینہ سے نہ تھا اس لیے ابوسفیان ان کی واپسی یا ان کے خلاف کارروائی کا مطالبہ بھی نہ کر سکتا تھا۔

اس صورتِ حال کے تحت ابوسفیان کو پھر ایک مجلسِ مشورت بلانا پڑی جس میں خالد بن ولید نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"میری نظریں ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہیں"۔

خالد بن ولید نے گرجدار آواز میں کہا:

"مجھے اندازہ تھا کہ ایک دن یہ صورتِ حال ضرور پیدا ہوگی۔ آپ نے میری باتوں پر توجہ نہیں دی۔ ابھی ہے کہ ملک شام کا راستہ بند ہوا ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل قریب میں مدینہ کی چھوٹی سی یہ بات پھیل کر پورے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور . . . . "

"خالد بن ولید۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو"۔

ابوسفیان نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی:

"تم ہمارے ساتھی ہو۔ ہمارے حلیف ہو اور مسلمانوں کی کھلے الفاظ میں تعریف کر رہے ہو۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"اے سردارِ قریش!"

خالد بن ولید نے جواب میں کہا:

"میں مسلمانوں کی تعریف نہیں کر رہا۔ میں تو ان کے سردار محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذہانت کی داد دے رہا ہوں۔

اس شخص کی ذہانت کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے مدینہ سے ایک ایک کر کے تمام یہودی قبائل کو نکال باہر کیا۔

اس کے بعد صلح نامہ حدیبیہ کا معاہدہ کر کے اپنے آپ کو منوا لیا اور اب وہ وقت دور نہیں جب اس کے قدم مدینہ سے مکہ کی طرف اٹھیں گے اور ہمیں مکہ اسے نذر کرنا پڑے ۔۔۔۔"

ابوسفیان نے خالد کی بات پھر کاٹ دی:

"خالد بن ولید!"

وہ بپھر کر بولا:

"تمہاری تلخ و تند باتیں ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ ہم ایک عذاب میں مبتلا ہیں اسی لیے ہم نے یہ مجلس منعقد کی تھی مگر ۔۔۔۔"

اس نے خالد کو کڑی نظروں سے دیکھا:

"مگر تم ہمارا عذاب کم کرنے کی کوئی تدبیر بتانے کے بجائے ہمارے کرب اور اذیت میں مزید اضافہ کر رہے ہو"۔

"سچ بات مجھے بھی اور آپ کو بھی کڑوی لگتی ہے"۔

خالد نے مسکراتے ہوئے کہا:

"قریشِ مکہ کے لیے اس عذاب سے نجات کی ایک ہی صورت ہے!"

"وہ کیا؟" ابوسفیان نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ آپ اپنے چند سرداروں کے ساتھ مدینہ کے بادشاہ کے پاس تشریف لے جائیں اور ان سے درخواست کریں کہ صلح حدیبیہ کی اس شرط کو منسوخ کیا جائے جس کے تحت مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جانے والے کو مکہ واپس بھیجنے پر انہیں پابند کیا گیا تھا"۔

خالد نے ذرا رک کر مزید کہا:

"نیز ان سے یہ درخواست بھی کی جائے کہ عیص میں آباد ہونے والے مسلمانوں کو مدینہ بلا لیا جائے تاکہ مکہ کے تجارتی قافلے ان کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں"۔

ابوسفیان خود بھی دل سے یہی چاہتا تھا مگر قریش کا سردار ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوری زبان سے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"خالد!"

اس نے بردباری سے کہا:

"ہم تمہاری رائے سے اتفاق کرتے ہیں مگر مدینہ بھیجے جانے والے وفد کی سربراہی میرے بجائے تم کرو گے!"

"مجھے سردار کے حکم کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں"۔

خالد نے جواب دیا:

"لیکن میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا گنہ گار ہوں۔ جنگِ احد میں درّے کی طرف سے میں نے مسلمانوں پر یلغار کر کے ان کو شدید نقصان پہنچایا تھا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔

پھر جنگِ خندق میں بھی میں نے لشکرِ مدینہ کو دن رات پریشان کیے رکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں نے ان کے لگ بھگ نصف لشکر کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا۔

ان باتوں کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ سے سخت ناراض ہوں گے۔ اگر میں وفد کا سردار ہو کر گیا تو ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ الٹا نکلے اور وفد کو ناکام واپس آنا پڑے"۔

ابوسفیان نے خالد بن ولید کی اس رائے سے بھی اتفاق کیا اور ایک وفد ترتیب دے کر حضورؐ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا۔

اس نے خود بھی وفد کی سربراہی سے گریز کیا۔



مکی وفد مدینہ پہنچا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد کو خوش آمدید کہا اور اس کی ہر بات غور اور توجہ سے سنی۔ وفد نے آپؐ سے دو درخواستیں کیں:

1. یہ کہ صلح حدیبیہ کی اس شرط کو منسوخ کر دیا جائے کہ اگر کوئی مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ بھاگ آئے تو مدینہ والے اسے مکہ بھیجنے کے ذمہ دار اور پابند ہوں گے لیکن

اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا جائے تو اسے مکہ والے واپس نہیں کریں گے۔

یہ وہی شرط تھی جسے ہادیِ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دُور اندیشی، سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کے تحت قبول کیا تھا اور بعض مسلمانوں نے اسے اپنی توہین سمجھ کر اس پر اعتراض کیا تھا اور یہ شرط انہیں بہت شاق گزری تھی۔

ہر مسلمان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف مسلمانوں ہی کے لیے باعثِ رحمت نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیںؐ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ پھر بھلا آپؐ کسی کو تکلیف میں کیسے دیکھ سکتے تھے۔

چنانچہ، آپؐ نے وفد کی یہ درخواست منظور کر لی اور اس شرط کو منسوخ تصور کر لیا گیا۔

وفد کی دوسری درخواست بھی اسی سے متعلق تھی۔

وفد نے درخواست کی کہ شام کے راستہ میں عیص کے مقام پر مکہ سے بھاگے ہوئے جو مسلمان آباد ہیں وہ اہلِ مکہ کے قافلوں کو حملہ کر کے لوٹ لیتے ہیں۔ انہیں وہاں سے مدینہ بلوا لیا جائے تاکہ اہلِ مکہ کے قافلے بغیر کسی خطرے کے شام جا سکیں۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد کی یہ درخواست بھی قبول فرمائی اور عیص میں مقیم آوارہ وطن مسلمانوں (ابو بصیرؓ، ابو جندلؓ اور ان کے ساتھی) کو مدینہ بلوا لیا۔

مشرکینِ مکہ نے یہ درخواست گزار وفد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور نہیں بھیجا تھا[1] بلکہ ابو سفیان نے اپنی شکست کا برملا اعتراف کیا تھا۔

جنگِ خندق (احزاب) کے بعد ہی مشرکینِ مکہ کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا تھا مگر ابو سفیان اپنے زعم میں اکڑا پھرتا تھا۔ اب اس کا یہ زعم بھی ختم ہو گیا۔

اس وفد کے آنے سے وہ مسلمان بہت شرمندہ اور خجل ہوئے جنہوں نے صلح حدیبیہ کی شرائط کو اعتراض کی نظر سے دیکھا تھا اور ان کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں عام مسلمان ہی نہیں بلکہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔

اگرچہ یہ لوگ اپنی غلطی تسلیم کر کے توبہ و استغفار کر چکے تھے لیکن اب رسولِ خدا کے فرمان کو خدا نے اپنی وحی کی شکل میں عملی جامہ پہنا کے پیش کر دیا تھا کہ صلح حدیبیہ واقعی فتحِ مبین ہے!

۱۔ یہ بھی فرار ہو کر ابو بصیرؓ کے پاس چلے گئے تھے!

صلح حدیبیہ کے نتیجے میں مسلمانوں کو دو تحفے اور عطا ہوئے:

۱۔ فتحِ خیبر

۲۔ خالدؓ بن ولید کا ایمان لانا

فتحِ خیبر ہمارے موضوع (خالدؓ بن ولید) سے باہر ہے اس لیے اس سے قطعِ نظر کرتے ہوئے ہم خالدؓ بن ولید کے ایمان لانے کا حال بیان کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بے شمار لکھا گیا ہے مگر خالدؓ بن ولید کے ابھی وہ تمام جنگی کارنامے باقی ہیں جنہیں انہوں نے بحیثیت ایک مسلمان جرنل کے انجام دیا۔ اس لیے ہم ان کے ایمان لانے کے سلسلے میں خود ان کا بیان لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

جہاں تک تاریخ کا سوال ہے تو مؤرخین اس بارے میں بہت اختلاف کا شکار ہیں کہ خالدؓ بن ولید نے کس سنِ ہجری میں اسلام قبول کیا۔ بعض نے ۸ھ اور ۷ھ لکھا ہے تو بعض مؤرخین ۵ھ اور ۶ھ بتاتے ہیں۔

آیئے اس مسئلہ کو ہم پہلے تاریخی شہادتوں سے جانچتے ہیں:

۱۔ طبقاتِ ابنِ سعد نے خود خالدؓ بن ولید کا قول نقل کیا ہے:

"ہم دونوں (خالدؓ اور عمروؓ بن العاص) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یکم صفر ۸ھ کو حاضر ہوئے۔"

۲۔ بلاذری کہتے ہیں:

"عمروؓ بن العاص شاہِ حبشہ نجاشیؓ کے پاس سے مسلمان ہو کر لوٹے۔ راستہ میں انہیں عثمان بن طلحہ اور خالد بن ولید ملے جو رسولِ کریمؐ کے پاس مدینہ جا رہے تھے۔ چنانچہ یہ تینوں صفر ۸ھ میں رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔"

۳۔ ابنِ قتیبہ لکھتے ہیں:

"حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت عثمانؓ بن طلحہ ۸ھ میں اسلام میں داخل ہوئے۔"

۴۔ طبری نے بھی ۸ھ لکھا ہے۔

ابنِ عساکر، واقدی کا قول نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ہمارے نزدیک یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ حضرت خالدؓ غزوۂ خیبر[1] میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ عمروؓ بن العاص اور عثمانؓ بن ابی طلحہ، یہ تینوں فتح مکہ سے قبل ۸ھ میں اسلام لائے تھے۔"

ابنِ کثیر اور ابو الفداء بھی ۸ھ بتاتے ہیں۔

جن کتابوں میں خالدؓ کے بھائی ولیدؓ بن ولید کے اسلام لانے کا ذکر ہے ان میں یہ مذکور ہے کہ عمرۃ القضاء کے دوران حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولیدؓ بن ولید سے کہا:

"افسوس خالدؓ ہمارے پاس نہیں آئے۔ اگر وہ آتے تو ہم بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے۔ خالدؓ جیسے شخص کو تو اسلام قبول کرنے میں کوئی تأمل نہیں ہونا چاہیے۔"

تمام عقلی اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خالدؓ بن ولید ۸ ہجری میں آغوشِ اسلام میں آئے۔

ہماری اس رائے کی تائید بستانی کی دائرۃ المعارف، ڈاکٹر حسن ابراہیم کی کتاب عمروؓ بن العاص اور گبن کی تاریخ زوالِ روما سے بھی ہوتی ہے۔

اب ہم خالدؓ بن ولید ہی کی زبان سے ان کے اسلام لانے کا ایمان افروز واقعہ درج کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"جب خدائے تعالیٰ نے مجھ پر اپنا فضل نازل کرنا چاہا تو اس نے میرے دل میں اسلام کی محبت پیدا کر دی اور مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہر جنگ میں لڑا لیکن ہمیشہ ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا اور اسلام کی شان و شوکت مٹانے میں ہم کامیاب نہ ہو سکے۔

آہستہ آہستہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ میں ایک غلط راستے پر کھڑا ہوں۔ کوئی غیبی طاقت بزور میرے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ غزوۂ خیبر ۷ھ میں ہوا تھا۔

کے لیے جگہ پیدا کر رہی تھی۔

جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لائے تو میں مکہ سے نکل گیا اور جب تک حضورؐ مکہ میں رہے میں وہاں داخل نہ ہوا۔

میرے بھائی ولیدؓ بن ولید جو مسلمان ہو چکے تھے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔

حضورؐ نے مجھے طلب فرمایا مگر میں وہاں کہاں تھا۔ اس پر میرے بھائیؓ نے مجھے یہ خط لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے تعجب ہے کہ تم اسلام سے اس قدر برگشتہ کیوں ہو۔ حالانکہ جس عقل کے تم مالک ہو، اسلام کے حقیقی نور سے بے بہرہ نہیں رہ سکتی۔ رسولؐ اللہ نے تمہارے بارے میں مجھ سے دریافت فرمایا اور پوچھا:

"خالد کہاں ہے؟"

میں نے عرض کیا:

"خالد کو اللہ ہی لائے تو آئے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"خالد جیسا شخص کبھی اسلام کی حقیقت سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرکین سے لڑتا تو بہتر ہوتا۔"

اے برادر! تم بہت دنوں تک گمراہی میں رہے ہو۔ حقیقت کو پہچانو اور سیدھے راستے پر آجاؤ۔"

خالد کہتے ہیں:

"یہ پڑھ کر میرے دل پر پڑے ہوئے تاریک پردے ہٹ گئے اور مجھے اسلام سے رغبت ہو گئی۔

سب سے زیادہ خوشی مجھے اس گفتگو سے ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے بارے میں میرے بھائی سے کی تھی۔

آخر میں نے مکہ سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

انہی دنوں میں نے یہ خواب بھی دیکھا کہ میں ایک ویران، چٹیل اور تنگ جگہ میں ہوں لیکن خدائے تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور میں وہاں سے نکل کر ایک فراخ اور سرسبز و شاداب میدان میں آ گیا۔

اس دوران رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کی متحدہ طاقت، جو خیبر میں جمع تھی، کو شکست دے کر پارہ پارہ کر دیا تھا اور ان کا شہرہ تمام عرب و عجم میں ہو گیا تھا۔

جب میں نے مدینہ جانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لیں تو ایک دن میں صفوان بن امیہ سے ملنے گیا۔ میں نے اس سے کہا:

"اے ابو وہب! تم دیکھ رہے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرب اور عجم پر غالب آ رہے ہیں۔ اگر ہم انؐ کے پاس جا کر انؐ کی اطاعت کر لیں تو جو شرف ان کو حاصل ہونے والا ہے اس میں ہم بھی حصہ دار ہو جائیں گے"۔

صفوان بن امیہ میری بات سن کر سخت برافروختہ ہوا اور بولا:

"اگر تمام دنیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قبول کر لے اور میرے سوا ہر شخص مسلمان ہو جائے تب بھی میں انؐ پر ایمان نہیں لاؤں گا"۔

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ صفوان کا باپ اور بھائی جنگِ بدر میں مارے گئے تھے اور ان دونوں کے غم نے اسے دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اب اسے نیک و بد کی تمیز نہ رہ گئی تھی۔

پھر میں عکرمہ بن ابوجہل سے ملا اور وہی بات اس سے بھی کہی جو صفوان سے کہہ چکا تھا۔

اس نے بھی مجھے اسی قسم کا جواب دیا جیسا صفوان بن امیہ نے دیا تھا۔ تب میں نے اس سے درخواست کی:

"اے عکرمہ! میری تم سے درخواست ہے کہ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اسے تم اپنے تک ہی محدود رکھنا اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا ورنہ اس سے اختلاف اور بڑھے گا"۔

عکرمہ بن ابوجہل نے مجھے اطمینان دلایا:

"اے خالد بن ولید! تم مطمئن رہو۔ میں تمہاری باتوں کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں اس سے قریش میں انتشار پیدا ہو گا اور تلواریں بھی کھنچ سکتی ہیں"۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں تھا مگر میں بلاوجہ لڑائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ خواہ کوئی ساتھ دے یا نہ دے میں اسلام ضرور قبول کروں گا۔

یہ فیصلہ میں نے اسی وقت کر لیا تھا جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ڈیڑھ ہزار صحابہؓ کے ساتھ حدیبیہ آئے تھے۔ انہوںؐ نے وہاں میرے سامنے بڑے دلیرانہ انداز میں باجماعت نماز ادا کی تھی۔ انہوںؐ نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلے ایک حصہ نے نماز ادا کی اور دوسرا حصہ اسلحہ لیے پہرہ دیتا رہا۔ پھر دوسرے حصہ نے نماز ادا کی۔

میں نے سوچا کہ وہ شخص جو اپنے دین کے معاملہ میں اس قدر سخت ہو کہ جنگ کے میدان میں بھی فرض کی ادائیگی پر قائم رہتا ہو اس کے دین میں کس قدر خوبیاں ہوں گی۔

انہی خیالات کے تحت میں مدینہ جانا چاہتا تھا مگر یہ بھی چاہتا تھا کہ کوئی ساتھی مل جائے تو کیا اچھا ہو؟

صفوان اور عکرمہ کے بعد میں نے عثمان بن طلحہ سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ میں اس سے ملنے جا رہا تھا کہ ایک خیال نے میرے قدم روک لیے۔ وہ خیال یہ تھا کہ عثمان کا باپ طلحہ، اس کا چچا عثمان اور چار بھائی مسافع، جلاس، حارس اور کلاب جنگِ احد میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔ اس سے اس صورتِ حال میں یہ بات کہنے کا مطلب ہے کہ میں اس کی دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں۔

چنانچہ میں اس سے اس دن ملنے نہ گیا لیکن میرا دل بے چین رہا۔ آخر مجھے بات کہنے ہی بن پڑی۔ میں نے ذرا بات بنا کر اس سے کہا:

"اے میرے پیارے دوست عثمان بن طلحہ! ہماری مثال اس لومڑی جیسی ہے جو بھٹ میں چھپی بیٹھی ہو لیکن اگر بھٹ میں پانی ڈال دیا جائے تو اسے باہر نکلنا ہی پڑتا ہے۔

مجھے نظر آ رہا ہے کہ مسلمان ہم پر غالب آ جائیں گے۔ پھر کیوں نہ ہم پہلے ہی اسلام قبول کر لیں۔"

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب عثمان بن طلحہ نے میری بات کی پوری پوری تائید کی اور اسلام لانے پہ آمادہ ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے اس سے مدینہ چلنے کو کہا۔ وہ اس پر بھی تیار ہو گیا اور طے یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح ہم دونوں ایک مقررہ مقام پر ملیں گے۔ جو پہلے پہنچ جائے وہ دوسرے کا انتظار کرے۔

اگلے دن ہم دونوں مقررہ جگہ اکٹھے ہوئے اور مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب ہم ہدہ کے مقام پر پہنچے تو مجھے عمروؓ بن العاص ملے۔ وہ حبشہ سے واپس آ رہے تھے۔

عمروؓ بن العاص نے علیک سلیک کے بعد پوچھا:

"ابو سلیمان۔ کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں اپنے دل کی کیفیت چھپا نہ سکا اور جواب دیا:

"اللہ کی قسم۔ مجھ پہ یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور میں مسلمان ہونے کے لیے مدینہ جا رہا ہوں۔"

عمروؓ بن العاص میری طرف دیکھ کے مسکرائے اور بولے:

"میں خود بھی مسلمان ہونے کے ارادے سے حبشہ سے آ رہا ہوں۔"

پس ہم تینوں مدینہ روانہ ہوئے۔

جب ہم مدینہ پہنچے تو دوپہر کا وقت تھا۔ ہم نے اپنے اونٹ بٹھائے اور رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی تیاری کرنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی ہمارے آنے کی اطلاع ہو گئی تھی۔

آپؐ نے اسی وقت فرمایا:

"مسلمانو! مکہ نے اپنے جگر گوشے نکال کر تمہارے سامنے ڈال دیے ہیں۔"

میں نے نئے کپڑے پہنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں چلا۔ راستہ میں میرے بھائی ولیدؓ بن ولید ملے جو میرے مدینہ آنے کی خبر سن کر بھاگے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور کہا:

"جلدی چلو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمہارے آنے سے بہت مسرور ہیں اور انتظار فرما رہے ہیں۔"

چنانچہ ہم سب تیز تیز قدم اٹھاتے حضورِ اقدس میں پہنچے۔ میں آپؐ کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ آپؐ مسکرا رہے ہیں۔

"السلام علیکم!" میں نے قریب پہنچ کے عرض کیا۔

آپؐ نے بڑی خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیا۔

میں نے کہا:

"حضورؐ! میں گواہی دیتا ہوں کہ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت فرمائی۔ مجھے یہ امید تھی کہ تمہاری عقل بالآخر سیدھے راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرے گی۔"

میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! میں آپؐ کے خلاف کئی جنگیں لڑ چکا ہوں۔ آپؐ اللہ سے میرے اس گناہ کی معافی کے لیے دعا فرمایئے!"

آپؐ نے فرمایا:

"اسلام پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔"

میں نے کہا:

"کیا واقعی؟"

آپؐ نے فرمایا:

"ہاں!"

اس کے بعد آپؐ نے دعا فرمائی:

"اے اللہ! خالدؓ کی تمام لغزشوں کو جو اس سے تیرے دین کی مخالفت میں سرزد ہوئیں، انہیں معاف فرما!"

میرے بعد عمروؓ بن العاص اور عثمانؓ بن طلحہ آگے بڑھے اور انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی۔

ہم صفر ۸ھ میں مدینہ پہنچے تھے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس دن سے میں نے اسلام قبول کیا اس دن سے رسول اللہؐ میرے اور دوسرے صحابہؓ کے درمیان کوئی فرق نہ کرتے تھے اور ہمیشہ مجھے دوسرے صحابہؓ کے ساتھ شریک فرماتے تھے۔

رہنے کے لیے مجھے حضورؐ نے اپنے ان مکانوں میں سے ایک مکان عطا فرمایا، جو انہیں حارثہ بن نعمان نے پیش کیے تھے!"

عمروؓ بن العاص اور عثمانؓ بن طلحہ بھی مکہ کے نامور اشخاص تھے مگر حضورؐ نے انہیں اپنا کوئی مکان نہیں دیا۔

خالدؓ کی درخواست پر آنحضرتؐ نے اسی وقت ان کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت فرمائی۔ حضورؐ کو خالدؓ کے اسلام لانے کی خوشی بھی بہت ہوئی۔

یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ خالدؓ بن ولید بغیر کسی لالچ یا خوف کے اسلام قبول کرنے آئے تھے اور ان کا اسلام قبول کرنا خود حضور پاکؐ کی خواہش تھی۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خالدؓ بن ولید جیسے ذہین اور عقلمند انسان نے اسلام قبول کرنے میں اس قدر تاخیر کیوں کی؟

بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے روزِ اوّل ہی سے مساوات کا نعرہ بلند کیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔ یعنی اللہ کی نظر میں وہ شخص ہی عظیم اور بڑا ہے جو جس قدر متقی اور پرہیزگار ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی خاندان یا قبیلہ یا قوم سے ہو۔

قریش چونکہ کلید بردارِ کعبہ تھے اور ان کو دوسرے تمام قبائل اپنے سے بہتر و برتر سمجھتے تھے اس لیے وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ دوسرے قبائل بھی قریش کے برابر سمجھے جائیں۔ اور ان کے اقتدار میں شامل ہو جائیں اس لیے قریش نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔

پھر جنگ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے۔ اس سے وہ اور زیادہ برافروختہ ہو گئے تھے۔ میدانِ بدر میں خالدؓ کے چچا اور چچازاد بھائی بھی قتل ہوئے تھے!

چنانچہ جب خالدؓ بن ولید نے عکرمہ بن ابوجہل کے سامنے اسلام پیش کیا تو اس نے بڑی حیرانگی سے پوچھا تھا:

"کیا تم صابی (بے دین) ہو گئے ہو؟"

"نہیں۔"

خالدؓ نے جواب دیا تھا:

"میں صابی نہیں مسلمان ہوا ہوں!"

تب عکرمہ نے کہا:

"خدا کی قسم۔ چاہے سارے قریش اسلام لے آتے مگر مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔"

"کیوں؟"

خالد نے دریافت کیا تھا:

"میں کیوں نہ اسلام لے آؤں؟"

"خالد!"

عکرمہ نے جواب میں کہا تھا:

"تمہیں وہ وقت یاد نہیں جب بدر میں تمہارے چچا اور چچازاد بھائی قتل ہوئے تھے۔ کم از کم تمہیں تو اسلام نہیں لانا چاہیے تھا۔

کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ قریش، مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور اس اہم موقع پر تم ان سے علیحدگی اختیار کرنے کا سوچ رہے ہو!"

چونکہ خالدؓ بن ولید پر اسلام کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ دین ان کے دل میں راسخ ہو چکا تھا اس لیے وہ عکرمہ کی اشتعال انگیز باتوں میں نہیں آئے۔

"یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں عکرمہ۔"

انہوں نے صاف الفاظ میں کہا:

"میں ایسی حمیت کا قائل نہیں ہوں جو مجھے اصل روشنی سے محروم رکھے۔ جس وقت اسلام میری سمجھ میں آیا میں مسلمان ہو گیا۔"

عکرمہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح خالدؓ بن ولید کو واپس دینِ بتاں پر لے آئیں لیکن عکرمہ کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

خالدؓ بن ولید کو اللہ تعالٰی نے فہم و فراست بڑی وافر مقدار میں عطا کی تھی۔ وہ کج بحثی کے نہیں بلکہ صاف بات کے قائل تھے۔

عکرمہ کو جب یقین ہوگیا کہ خالدؓ بن ولید قریشِ مکہ کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں تو وہ ناکام واپس ہوگیا۔

صاف ظاہر ہے کہ خالدؓ نے بڑے غور و فکر کے بعد اسلام قبول کیا تھا اور اب وہ کسی قیمت پر اس سے ہٹنے والے نہیں تھے!



قبیلہ غطفان کے سردار نعیم بن مسعود اشجعی اور قریش کے سردار ابوسفیان کے درمیان ابنِ حاتم کے مسئلہ پر کافی بحث و مباحثہ بلکہ اختلاف پیدا ہوچکا تھا۔

ابوسفیان کو بھی یہ علم ہوگیا تھا کہ قریشِ مکہ میں اب وہ دم خم نہیں رہ گیا ہے کہ جس کے زور پر وہ اب مسلمانوں کے مقابلہ پر آسکیں اس لیے اس نے رویہ نرم کر لیا تھا اور جب ایک موقع پر اس کی نعیم بن مسعود سے دُو بدُو گفتگو ہوئی اور نعیم نے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو ابوسفیان جیسا بد دماغ آدمی نعیم کی باتوں کو مصلحتاً درگزر کر گیا۔

دراصل قریشِ مکہ کو بنو غطفان کی ضرورت تھی اور وہ فی الحال کسی قیمت پر ان سے بگاڑ یا دشمنی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اسی دوران اہلِ مکہ کے قافلے شام کے راستے میں ابو نعیر کے آدمیوں کے ہاتھوں لُوٹے جانے لگے تو گھبرا کر ابوسفیان نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صلح حدیبیہ کی اس شق کی تنسیخ کی درخواست کی جس کے تحت مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جانے والوں کو واپس مکہ لایا جاسکتا تھا۔

اس شرط کی منسوخی سے مکہ میں قید وہ تمام مسلمان آزاد ہوگئے جنھیں ابوسفیان نے اسلام لانے کے جرم میں زندانوں میں ڈال رکھا تھا۔ ابنِ حاتم اس سے بھی پہلے آزاد ہوگیا تھا کیونکہ اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔

نعیم بن مسعود نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ جس وقت چاہے مدینہ جاسکتا ہے مگر ابنِ حاتم

نے اس اجازت سے انکار کر دیا۔

"چچا جان!"

اس نے نعیم بن مسعود سے کہا:

"میں ایک بار اس اجازت کی سزا بھگت چکا ہوں۔ آپ اس وقت کا تصور نہیں کر سکتے جب مجھے آپ کے حکم پر ایک دم مدینہ سے واپس آنا پڑا تھا۔

میں چاہتا تو وہاں شادی کر کے بھی واپس آ سکتا تھا مگر میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں وہاں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا ذرا سا بھی اندیشہ ہو۔"

"یہ تمہاری سعادت مندی ہے بیٹے!"

نعیم بن مسعود نے کہا:

"مگر اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ ابوسفیان کی عقل ٹھکانے آ چکی ہے۔ اس نے اہلِ مکہ کے شام جانے والے قافلوں کو محفوظ کرنے کے لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے درخواست کی تھی کہ وہ عیص کے مقام پر آباد ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کو مدینہ بلوا لیں۔ اب تم چاہو تو مدینہ جا کر اپنی منگیتر سے شادی کر سکتے ہو۔"

"شکریہ چچا جان!"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا!"

"کیوں؟"

نعیم بن مسعود نے حیرت سے پوچھا:

"کیوں شادی نہیں کرنا چاہتے؟"

"چچا جان!"

ابنِ حاتم نے ایک عزم سے کہا:

"میں نے خالو اور خالہ کو اطلاع بھیجدی ہے کہ میں اب بارات لے کر ہی مدینہ آؤں گا اور بارات اس وقت مدینہ جائے گی جب میں اور میرے چچا باقاعدہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں گے۔ اس کے بعد چچا میری بارات کے ساتھ مدینہ پہنچیں گے۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے ابنِ حاتم!"

نعیم بن مسعود نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"آثار تو ایسے ہی پیدا ہو رہے ہیں اور اسلام بڑی تیزی سے جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں پھیل رہا ہے۔

کچھ عجب نہیں کہ مکہ بھی حلقۂ اسلام میں آ جائے۔ پھر تو ہم تم سب کے سب مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے مکہ آ جا سکتے ہیں۔"

اس طرح ابنِ حاتم اور نوحنا کا ملاپ ہوتے ہوتے رہ گیا اور دو محبت بھرے دلوں کے ملن کی بات مستقبل پر جا پڑی۔

ابنِ حاتم نے نوحنا کو ایک خاتون کے ذریعے جو مکہ سے مدینہ جا رہی تھی، یہ اطمینان دلا دیا تھا حالات تیزی سے اسلام کی موافقت میں بدل رہے ہیں اور حالات کے صحیح کروٹ لیتے ہی وہ بارات لے کر دھوم دھام سے اسے بیاہنے مکہ سے مدینہ آئے گا۔

صلح حدیبیہ سے اہلِ مکہ کو فوری طور پر متعدد فائدے ہوئے تھے جن میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کا شام و عراق سے تجارتی واسطہ پھر سے قائم ہو گیا۔

اس تجارت میں ابوبصیر کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے تعطل پیدا ہوا تھا مگر ابوسفیان نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں ایک وفد بھیج کر ابوبصیر کی زیادتیوں کا ہمیشہ کے لیے تدارک کر دیا تھا۔ حضورؐ نے ابوبصیر کو مدینہ بلوا لیا تھا اور مکہ کا شام و عراق سے تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ یہ اہلِ مکہ کا بہت بڑا فائدہ تھا۔

مگر—

ابوسفیان چونکہ دل سے حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور اسلام کا سخت دشمن تھا اس لیے اس پر خدا کی طرف سے مار پڑا کرتی تھی۔

ابوبصیر کا جھگڑا ختم ہوا تو ثمامہ بن اُثال نے ایک بکھیڑا کھڑا کر دیا۔

ثمامہ بن اُثال بنو حنیفہ کا سردار تھا۔ وہ صلح حدیبیہ تک حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا سخت دشمن تھا۔ مگر صلح حدیبیہ کے بعد خالدؓ بن ولید، عمروؓ بن العاص اور عثمانؓ بن طلحہ جیسے عظیم سردارانِ قریش کے مسلمان ہو جانے اور ان کے مدینہ ہجرت کر جانے کی وجہ سے ابوسفیان کے اور بہت سے حلیف سرداروں میں بڑا اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمان ان قبیلوں میں جاتے اور درپردہ اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس در پردہ تبلیغ سے بنو حنیفہ کا سردار ثمامہ بن اثال معہ اپنے قبیلے کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

قریش ایک عرصہ سے قحط سالی میں مبتلا تھے۔ بنو حنیفہ غلہ پیدا کرنے والے علاقہ میں آباد تھے اور قریش خاص کر قریشِ مکہ کو غلہ فراہم کرتے تھے۔

جب ثمامہ بن اثال نے قریشِ مکہ کو غلہ بھیجنا بند کر دیا تو قریش دُہرے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ایک تو قحط، دوسرے بنو حنیفہ کا اک دم غلہ بند کر دینا۔

مکہ میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مردار جانوروں کی گلی سڑی لاشیں تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔

پھر جب حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو گئی تو ابو سفیان کی ساری اکڑ فوں ختم ہو گئی۔ کہاں تو وہ حضورؐ کو قتل کرانے کی ہر سازش میں پیش پیش رہتا تھا اور کہاں ایک سوالی بن کر مکہ سے مدینہ پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ابو سفیان بڑا زبان دان اور لسّان تھا۔ اس نے اپنا مدعا بیان کرنے میں اپنی ان صفات سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی مصیبت بیان کرنے کے بجائے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا:

"آپؐ کی قوم (قریش) قحط سالی سے ہلاک ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ قحط سالی دُور ہو۔"

حسنِ طلب کے یہ جملے عربی لسانی اور زبان دانی کا شاہکار ہیں۔

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کی چال اچھی طرح سمجھتے تھے مگر آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا تھا۔ قریش ہوں یا غیرِ قریش۔ عربی ہو یا عجمی۔ آپؐ ہر ایک کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ پھر ان کی تکلیف پر آپؐ کا جی کیوں نہ کڑھتا۔

آپؐ نے فوراً دعا کے لیے اپنے ہاتھ بلند فرما دیے اور ابو سفیان پر ثابت کر دیا کہ آپؐ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہیں۔

سورۂ سبا میں قرآنِ حکیم نے ارشادِ ربانی فرمایا:

"ہم نے آپؐ کو تمام عالم کے لیے خوشخبری دینے والا اور خدا کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔

چنانچہ جب آپؐ کو یہودیوں اور مشرکینِ مکہ کی طرف سے کسی قدر اطمینان حاصل ہوا تو آپؐ نے فوراً اس کام کی طرف توجہ دی جس کے لیے آپؐ کو اس عالمِ امکان میں بھیجا گیا تھا۔

بس — آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان تمام والیوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں کے نام خطوط بھیجنے کا سلسلہ شروع فرمایا جن کی سرحدیں ممالکِ حجاز سے متصل تھیں۔

ان والیانِ ریاست اور کجکلاہانِ سلطنت میں؛

قیصرِ روم

شہنشاہِ ایران

عزیزِ مصر

شاہِ حبشہ (نجاشی)

رؤسائے یمامہ

والیِ حدودِ شام حارث غسانی

اور والیِ بصرہ شرجیل بن عمر شامل تھے!

آپؐ نے اُس دور کی ان سلطنتوں کے فرمانرواؤں کو خطوط کے ذریعے دعوتِ اسلام دی تاکہ نہ صرف وہ خود مشرف بہ اسلام ہوں بلکہ اپنی رعایا کو بھی دعوتِ حق سے روشناس کرائیں۔

چونکہ ہمارا موضوع خالدؓ بن ولید ہیں اس لیے ہم ان بادشاہوں اور جنگوں کا ترتیب سے ذکر کریں گے جن سے خالدؓ بن ولید کو براہِ راست سابقہ پڑا تھا۔

خالدؓ بن ولید بحیثیت ایک مسلمان جنرل کے سب سے پہلے ہمیں جنگِ موتہ میں دکھائی دیتے ہیں، اس لیے ہم اس کی روداد آپ کے نظر گزار کرتے ہیں۔

موتہ!

شام کی ریاست بلقا کا ایک قصبہ تھا۔ آجکل یہ شرقِ اردن کا ایک ساحلی قصبہ ہے۔ اس ریاست کا صدر مقام بصرہ تھا اور بصرہ کا حاکم شرجیل بن عمرو غسانی تھا اور وہ شہنشاہِ روم کا ماتحت تھا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیگر بادشاہوں کے علاوہ شرجیل کے پاس بھی ایک نامہ روانہ کیا تھا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔

دعوتِ اسلام کا یہ خط لے کر حارث بن عمیرؓ والیِ بصرہ کے دربار میں گئے!

حارث بن عمیرؓ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نامہ مبارک والیِ بصرہ شرجیل بن عمرو غسانی کو پیش کیا تو

اس بد ذات نے خط پڑھتے ہی قاصدِ رسولؐ حارث بن عمیرؓ کے قتل کا حکم دے دیا اور حارثؓ کو موتہ کے مقام پہ شہید کر دیا گیا۔

شرجیل کا یہ اقدام بین الاقوامی آدابِ سفارت کے قطعی خلاف تھا کیونکہ دنیا کا کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے سفیر کو قتل نہیں کر سکتا۔

اس وقت تک خیبر کے یہودیوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں جاری تھیں اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔

پھر جب اللہ کے حکم سے خیبر فتح ہو گیا، یہودیوں کی مرکزیت ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی مشرکینِ مکہ کے کئی بڑے بڑے سردار آغوشِ اسلام میں آ گئے جن میں خالدؓ بن ولید سرِفہرست تھے، اس وقت حضورِ اکرمؐ نے شرجیل بن عمرو کی اس ناپاک جسارت پر اسے سرزنش کے لیے تین ہزار مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکر موتہ کی طرف روانہ فرمایا۔

لشکرِ اسلام کے سپہ سالار زیدؓ بن حارثہ تھے اور لشکر میں عبداللہؓ بن رواحہ، جعفر طیارؓ اور خالدؓ بن ولید جیسے بہادر، شہسوار اور شمشیرزن عام سواروں کی طرح شامل تھے۔

جب لشکر چلنے کے لیے تیار ہُوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ:

"اگر دورانِ جنگ زیدؓ بن حارثہ شہید ہوں تو جعفر طیارؓ امیرِ لشکر ہوں گے اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں"۔

مجاہدینِ اسلام کی یہ مختصر سی جماعت جب حدودِ شام کے قریب پہنچی تو حاکمِ بصرہ شرجیل بن عمرو کے جاسوسوں نے اسے مسلمانوں کے لشکر کی آمد کی خبر دی۔

شرجیل نے یہ اطلاع پاتے ہی قیصرِ روم کے لشکر سے رابطہ قائم کیا جو اُس وقت مشارف کے مقام پر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔

جب مسلمانوں کو قیصرِ روم ہرقل کے لشکر کا حال معلوم ہوا تو زیدؓ بن حارثہ نے سردارانِ فوج سے فوری طور پر مشورہ کیا۔

خود اُن کی رائے یہ تھی کہ وہ شرجیل کی گوشمالی کے لیے بھیجے گئے ہیں نہ کہ قیصرِ روم سے جنگ کے لیے۔ زیدؓ بن حارثہ نے سرداروں کو یہ بھی بتایا کہ ان کے جاسوسوں نے رومی لشکر کی تعداد ڈیڑھ سے دو لاکھ کے درمیان بتائی ہے۔ اور یہ بھی خبر ملی ہے کہ یہ وہی لشکر ہے کہ جس نے چند دن پہلے شاہِ ایران کو شکست دیکر مار بھگایا تھا!

زیدؓ بن حارثہ نے صاف الفاظ میں کہا:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے لشکرِ اسلام کا سالار اس وجہ سے بنایا تھا کہ میں بصرہ پہنچ کر شرجیل کو اس بات کی سزا دوں کہ اس نے قاصدِ رسولؐ کو بلا وجہ شہید کر دیا ہے لیکن اس وقت صورتِ حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ شرجیل اس وقت تنہا نہیں بلکہ اس کی پشت پر قیصرِ روم کا دو لاکھ کا لشکر موجود ہے۔ ہماری تعداد صرف تین ہزار ہے۔ میرے خیال میں تین ہزار کا دو لاکھ سے جنگ کرنا خودکشی کے برابر ہے اسلیے میں چاہتا ہوں کہ حالات سے دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مطلع کر کے وہاں سے تازہ احکامات حاصل کروں"۔

مجاہدینِ اسلام پہلی بار اپنے ملک سے باہر نکل کے اغیار سے جنگ کرنے آئے تھے اس لیے وہ بہت پُرجوش اور پُرامید تھے۔ انہیں اپنی شجاعت پر بھی ناز تھا۔

انہوں نے جب دیکھا کہ زیدؓ بن حارثہ جنگ سے ہچکچا رہے ہیں تو وہ بے قابو ہو گئے۔ ان میں عبداللہؓ بن رواحہ سب سے زیادہ پُرجوش مجاہد تھے۔ انہوں نے زیدؓ بن حارثہ کی باتوں کا جواب صرف دو جملوں میں دیا۔

انہوں نے کہا:

"ہمارا اصل مقصد شہادت ہے جو ہر صورت میں ممکن ہے لہٰذا ہمیں لڑنا چاہیے"۔

دوسرے مجاہدوں نے انہیں اتنا پُرجوش دیکھا تو وہ بھی ان کی تائید میں بولنے لگے آخرکار فیصلہ جنگ کا ٹھہرا۔ حالانکہ یہ فیصلہ ہوش کا نہیں جوش کا تھا۔

مجاہدینِ اسلام جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت سے اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر یہ فیصلہ کر ڈالا۔

چنانچہ جنگ شروع ہو گئی۔

ایک طرف دو لاکھ کا لشکرِ جرار جو شہنشاہِ ایران کو شکست دے چکا تھا۔ دوسری طرف صرف تین ہزار مجاہدینِ اسلام۔

یہ صرف ان کا جذبہ تھا جو وہ اتنے بڑے لشکر کے سامنے جم کر لڑ رہے تھے۔ بے شک انہوں نے رومیوں ...ن کر دیا ... ان کے چھکے چھڑا دیے لیکن تا بہ کے۔ آخر زیدؓ بن حارثہ نے مردانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت ...ش کیا۔

ان کی شہادت پر حضرت جعفر طیارؓ نے سردارِ فوج کی حیثیت سے علم سنبھالا اور لڑنے لگے۔ لڑتے لڑتے ان کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو آپ نے فوراً علم بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ بایاں ہاتھ بھی قطع ہو گیا تو علم کو سینے کے ساتھ

دبا لیا مگر اسے گرنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

شہادت کے وقت ان کے جسم پر نوّے زخم تھے۔ جعفر طیارؓ نے صرف ۲۵ سال کی عمر میں شہادت حاصل کی تھی۔

روایت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا کہ خون میں رنگے ہوئے دو پر لگائے فرشتوں کے جلو میں اڑ رہے ہیں۔

حضرت جعفر طیارؓ کو اسی وجہ سے ذوالجناحین یعنی دو پروں والا اور طیار یعنی اڑنے والا کہتے ہیں۔

حضرت جعفر طیارؓ کے بعد قیادت عبداللہؓ بن رواحہ نے سنبھالی اور لڑتے لڑتے وہ بھی شہید ہو گئے۔
ان کے بعد اسلامی علم، حضرت ثابتؓ بن ارقم نے اٹھا لیا اور کہا:

"اے مسلمانو۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق اب تم کسی مسلمان کو اپنا سردار مقرر کر لو"۔

ثابتؓ بن ارقم کے اس خطاب پر لوگوں نے شور مچا دیا کہ ہم تم کو ہی اپنا سردار مقرر کرتے ہیں لیکن انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا:

"میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ کسی اور کو سردار مقرر کر لو"۔

مسلمان اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے۔ دشمن کے مقابلے میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی جو انہیں پیس کے رکھ سکتا تھا۔

آخر سب کی نظریں خالدؓ بن ولید پر آ کر جم گئیں اور انہیں امیرِ لشکر بننے پر مجبور ہونا پڑا۔

ادھر تو میدانِ موتہ میں رومی لشکر اور مجاہدینِ اسلام دست و گریباں تھے اور اُدھر رسولِ خدا، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدِ نبویؐ میں تشریف فرما، کھلی آنکھوں سے میدانِ موتہ کی جنگ دیکھ رہے تھے اور اپنے پاس موجود صحابہؓ کو الفاظ کی آنکھوں سے دکھا رہے تھے۔

جس وقت زیدؓ بن حارثہ شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

"زیدؓ شہید ہوئے اور جعفر طیارؓ نے علمِ اسلامی سنبھالا ہے۔ وہ بڑی بہادری سے دشمن کی یلغار کو روک رہے ہیں اور اپنے لشکر کے سامنے سینہ سپر ہیں"۔

کچھ دیر بعد ارشاد ہوا:

"اب جعفر طیارؓ کا دایاں ہاتھ قلم ہوا۔ انہوں نے علم اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب ان کا بایاں ہاتھ بھی قلم ہوا اور انہوں نے علم کو اپنے سینے کے ساتھ دبا کر بلند کر رکھا ہے۔ اور اب جعفر طیارؓ شہید ہوئے اور علم عبداللہؓ بن رواحہ کے ہاتھ میں آیا۔

علم سنبھالتے ہی عبداللہؓ بن رواحہ نے دشمن پر بھرپور حملہ کیا ہے مگر وہ بھی شہید ہو گئے ہیں۔
ان کی شہادت پر علمِ اسلامی کو سرنگوں نہیں ہونے دیا گیا بلکہ آگے بڑھ کر ثابتؓ بن ارقم نے اسے سنبھال لیا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں:

"اے مسلمانو! کسی مسلمان کو اپنا سردار بنا لو"۔

جواب میں صدا آئی ہے کہ:

"ہم تم کو ہی اپنا سپہ سالار تسلیم کرتے ہیں"۔

ثابتؓ بن ارقم انکار کرتے ہیں کہ:

"میں اس کا اہل نہیں ہوں"۔

بالآخر سب کی نظریں خالدؓ بن ولید پر آ جمیں اور انہیں سردار تسلیم کر لیا گیا"۔

بعض لوگ اس بات پر اعتراض کرتے ہیں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو عالم الغیب تھے اور نہ انہیں اس قسم کا بظاہر کوئی معجزہ دیا گیا تھا پھر آپؐ نے مدینہ میں بیٹھے بیٹھے میدانِ موتہ کا نقشہ الفاظ میں کیسے کھینچ دیا؟

عرض یہ ہے کہ ہم صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کو تو کشف و کرامات کا حامل تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کبھی ہوا میں اڑتے تو کبھی دریا کی موجوں پر نماز ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ بیک وقت اپنے حجرے اور مسجدِ نبویؐ میں دکھائی دیتے ہیں۔ مستقبل کی باتیں بیان کرتے ہیں جیسے (نعوذ باللہ) زمان و مکان انہی کے قبضے میں ہو مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اس بات پر بھی شبہ کرتے ہیں کہ آپؐ مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر میدانِ موتہ کا نقشہ کس طرح کھینچ سکتے ہیں۔

مقامِ افسوس ہے کہ انسان کا بنایا ہوا سیارہ تو آسمان کی بلندیوں میں پہنچ کے پاکستان کے چپہ چپہ کی تصویریں امریکہ پہنچا سکتا ہے مگر رسولِ خدا، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں میں انہیں وہ طاقت نظر نہیں آتی جو کون و مکاں کے پار ہو جاتی تھی۔

وہ نبیؐ اور وہ پاک ہستیؐ جس کے حضور قاصدِ الٰہی دست بستہ کھڑا ہوتا تھا اس کی طاقتوں کا صحیح اندازہ

لگانا ایسے مشکوک اذہان کے بس سے باہر ہے۔

خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ آمدم برسرِ مطلب!

خالدؓ بن ولید ایک ایسے کمزور لشکر کے سپہ سالار مقرر ہوئے جس کی کل تعداد اب تین ہزار بھی نہ رہی تھی، اس کے مقابلہ میں دشمن اپنے دو لاکھ کے قریب لشکر کے ساتھ موجود تھا۔

دشمن کو اپنی قوت و طاقت پر کامل بھروسہ تھا۔ یہی لشکر کچھ دن پہلے ایرانیوں پر فتح پا چکا تھا اور اپنی کامرانی کے نشہ میں چور تھا۔

اس کا ایک ہی منتہائے مقصود تھا کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ ان کا ایک بھی فرد باقی نہ رہے۔

اس وقت خالدؓ بن ولید نے اپنی تمام حربی صلاحیتوں سے کام لیا اور لشکر کو متوقع تباہی سے بچانے اور اسے دشمن کے نرغے سے نکال لانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

خالدؓ نے یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا؟

اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

"جس روز خالدؓ بن ولید کو سردار منتخب کیا گیا اس دن تو وہ سوائے اپنی شمشیر زنی اور شہسواری کے اور کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ وہ دن بھر جی توڑ کے لڑتے رہے اور کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح لڑتے ہوئے شام کر دیں۔

اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے اور تمام دن کی شدید لڑائی کے بعد جب اندھیرا پھیلا تو جنگ رک گئی۔ اور دونوں لشکر اپنی اپنی خیمہ گاہ کو واپس ہوئے۔

اب خالدؓ بن ولید کو اپنی جنگی حکمتِ عملی ترتیب دینے کا موقع ملا۔ انہیں کسی طرف سے کمک آنے کی توقع نہ تھی اس لیے لشکر کی طاقت میں کوئی اضافہ کرنا ممکن نہ تھا لیکن اس ذہین جنرل نے اپنی اسی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ جب دوسرے دن دونوں فوجیں مقابل ہوئیں تو دشمن کو یوں محسوس ہوا جیسے آج اس کے سامنے گزشتہ روز والی فوج نہیں بلکہ بالکل نئی فوج اس کے مقابلہ پہ لڑنے کو آ گئی ہے۔

اس سے دشمن پر ایک نفسیاتی دباؤ پڑا۔ وہ یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا کہ مسلمانوں کو کمک پہنچی ہے تبھی آج وہ اتنے طمطراق سے صف آرا ہوئے ہیں۔

خالدؓ بن ولید نے اپنی پرانی فوج کو ایک رات ہی کے اندر اندر نئی فوج میں کیسے تبدیل کر دیا؟

اس کا راز یہ ہے کہ خالدؓ نے مقدمہ کو ساقہ کی جگہ اور ساقہ کو مقدمہ کی جگہ تبدیل کر دیا تھا۔

مقدمہ وہ فوج کہلاتی ہے جو لشکر کے آگے رہتی ہے۔ اسے ہراول بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ساقہ وہ فوج کہلاتی ہے جو فوج کے پیچھے ہوتی ہے تاکہ دشمن عقب سے حملہ نہ کر سکے۔

دوسری تبدیلی خالدؓ بن ولید نے یہ کی کہ انہوں نے لشکر کے دونوں بازو یعنی میمنہ اور میسرہ بھی ایک دوسرے سے تبدیل کر دیے۔ اب دائیں بازو کی فوج بائیں بازو پہ تھی اور بائیں بازو کی فوج دائیں بازو پہ۔

چنانچہ ــــ دوسرے دن جب جنگ شروع ہوئی تو دشمن کو اپنے سامنے ایک بالکل نیا لشکر دکھائی دیا۔ جس لشکر سے وہ کل لڑے تھے وہ اس وقت ان کے سامنے موجود نہ تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن پہ اس جنگی چال کا نفسیاتی اثر ایسا پڑا کہ وہ گزشتہ روز جیسی جنگ نہ کر سکے اور ان کے جوش و خروش میں نمایاں کمی آ گئی۔ برخلاف اس کے مسلمان کل سے بھی زیادہ جوش و جذبہ سے لڑے۔

اس طرح خالدؓ بن ولید نے وقتی طور پہ لشکر کو تباہی سے بچا لیا اور دشمن کو مرعوب کر کے انہوں نے بڑے قرینے سے اپنے سپاہیوں کو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے دشمن کے نرغے سے سلامتی کے ساتھ نکال لائے۔

اب دونوں لشکر علیحدہ علیحدہ تھے اور مسلمان ایک متوقع تباہی و بربادی سے بچ گئے تھے۔"

خالدؓ بن ولید نے اس نازک موقع پہ جو تدابیر اختیار کیں وہ ہر قائد اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا عظیم الشان

کارنامہ سرانجام دینے کے لیے جنگی مہارت، سوجھ بوجھ، عقل مندی، وسعتِ نظر اور اللہ پاک پہ کامل بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر خالدؓ سے اس وقت ذرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو پورے کا پورا لشکر موت کے گھاٹ اتر جاتا۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو جن مشکلات اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا اندازہ خالدؓ بن ولید کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ:

"موتہ کی جنگ میں میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں اور کوئی تلوار اگر میرے ہاتھ میں صحیح و سلامت رہی تو وہ یمنی تلوار تھی۔"

اندازہ کیجیے کہ جس جنگ میں سردارِ فوج کو خود لڑنا پڑے اور اس کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں اس پہ کیسے بڑے لشکر نے حملہ کیا ہوگا اور وہ سردار کس قدر دلیر، جنگجو، فنونِ حرب سے آشنا اور جان ہتھیلی پہ لیے ہوئے ہوگا۔

اس جنگ کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ:

"جس وقت یہ معرکہ ہو رہا تھا اور مسلمانوں کے سردار یکے بعد دیگرے شہید ہو رہے تھے اس وقت اللہ تعالیٰ، مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ماجرا دکھا رہا تھا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ سے سرداروں کی شہادت کا حال بیان فرما رہے تھے۔

جب خالدؓ بن ولید نے علم ہاتھ میں لیا تو آپؐ نے فرمایا:

"..... ان کے بعد خالد بن ولید نے علم ہاتھ میں لیا۔ وہ مقرر کردہ قائدین میں سے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو قائد بنا لیا ہے۔

اے اللہ! وہ تیری تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔ اب تو ہی اس کی مدد فرما!"

اس دن سے خالدؓ کا لقب "سیف اللہ" پڑ گیا۔

ایک دوسری جگہ اس طرح لکھا ہے کہ:

"ادھر مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ کی شہادت کی خبر دی اور فرمایا:

"علم کو سَیفٌ مِّن سُیُوفِ اللّٰہ یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے سنبھالا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں فتح دی۔"

خالدؓ بھی اسی دن سے سیف اللہ کہلاتے ہیں۔"

سچی بات یہ ہے کہ خالدؓ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیے ہوئے لقب کے پورے پورے مستحق تھے کیونکہ انہوں نے انتہائی نازک موقع پہ مسلمانوں کے لشکر کو تباہی سے بچایا۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیے ہوئے اس لقب میں جو جامعیت ہے وہ کسی عام انسان کی بیان کردہ تعریف میں ممکن نہیں۔

اس صورتِ حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کی حالت اس قدر قابلِ رحم تھی تو رومیوں نے آگے بڑھ کر، جبکہ مسلمان پیچھے ہٹ رہے تھے، انہیں روکا کیوں نہیں؟ انہیں مسلمانوں کا تعاقب کرنے سے کس چیز نے باز رکھا؟

اس کی دو وجوہات تھیں:

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خالدؓ بن ولید نے رومیوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ مسلمان لشکر رومیوں سے مرعوب ہے بلکہ وہ آخری وقت تک جارحانہ جنگ کرتے رہے اس لیے رومیوں نے ان کے پیچھے ہٹنے کو ایک جنگی چال تصور کیا اور تعاقب کی جرأت نہ کی۔

دوسری ممکنہ وجہ یہ ہے کہ موتہ کے میدان میں ایک طرف جنگلات کا سلسلہ تھا اور یہ جنگلات مسلمانوں کی پشت پہ تھے۔

جب اسلامی لشکر جنگلات کی طرف پسپا ہوا تو رومیوں نے ان کا تعاقب اس لیے بھی نہ کیا کہ ان کا دو لاکھ کا لشکر اور اس کا بھاری ساز و سامان جنگل میں گھس کر کہیں بے بس نہ ہو جائے اور اسلامی لشکر ان پہ چھپ چھپ کر حملے نہ شروع کر دے۔

رومیوں کو یہ شک بھی تھا کہ کہیں مسلمانوں نے جنگل میں اپنی فوج نہ چھپا رکھی ہو اور تعاقب کی صورت میں یہ پوشیدہ فوج ان پہ حملہ نہ کر دے!





بلاشبہ تین ہزار کے مختصر لشکر کو ڈیڑھ دو لاکھ رومیوں کے نرغے سے صحیح وسلامت نکال لانا خالدؓ بن ولید کا ایک ایسا عظیم کارنامہ تھا جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ بھی ان کی جنگی مہارت کی ایک روشن دلیل ہے کہ خالدؓ بن ولید کے لشکر کی قیادت سنبھالنے سے لے کر اسے دشمنوں سے بچا کر نکال لے جانے کے عرصہ تک میدانِ موتہ میں صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔

بعض مؤرخوں نے جوشِ عقیدت میں یہ بات لکھ دی ہے کہ خالدؓ بن ولید نے صرف تین ہزار مسلمان مجاہدین کے لشکر سے ڈیڑھ دو لاکھ کے رومی لشکر کو شکست دے دی تھی۔

میرے خیال میں یہ بات قطعی ناقابلِ فہم ہے۔ اس لیے کہ ایک تو تین ہزار سے دو لاکھ کا مقابلہ جبکہ رومی لشکر مسلمان لشکر کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھا، اسے شکستِ فاش سے دوچار کرنا قطعی ناممکن ہے۔ جس مؤرخ نے بھی ایسا لکھا ہے اس نے غلطی کی ہے۔

اس خیال کے برعکس یہ خیال بھی غلط ہے کہ مسلمان لشکر موتہ کے میدان سے منہ چھپا کر اور شکست کھا کر مدینہ واپس آیا تھا۔

جس طرح موتہ میں مسلمانوں نے فتح حاصل نہ کی تھی اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان موتہ سے میدان چھوڑ کر بھی نہ بھاگے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مدینہ میں افواہ پھیل گئی تھی کہ خالدؓ بن ولید مسلمان لشکر کے ساتھ میدانِ موتہ سے بھاگ کر آرہے ہیں۔

اس افواہ کے نتیجے میں یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا کہ مسلمان لشکر اور سالارِ لشکر خالدؓ بن ولید کے مدینہ واپس آنے پر ایک طرف سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صحابہ کرامؓ کے ساتھ لشکر کے استقبال کو نکلے تھے اور دوسری طرف بعض لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ لشکر میدان سے بھاگ کے آیا ہے اس پر مٹی پھینکنا شروع کر دی تھی اور انہوں نے یہ آوازیں لگائی تھیں:

"تم بھگوڑے ہو"۔

"تم اللہ کے راستے سے بھاگ کے آئے ہو"۔

اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان لوگوں کو منع کیا اور فرمایا تھا:

"یہ بھگوڑے نہیں ہیں۔ انشاءاللہ دوبارہ جہاد پر جائیں گے"۔

جنگِ موتہ کے سلسلے میں ابنِ برہان الدین نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہی صحیح اور درست ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جنگِ موتہ میں مسلمانوں کو اس لحاظ سے فتح حاصل ہوئی تھی کہ اس موقعہ پر صرف تین ہزار مسلمانوں کے مقابلہ پر دو لاکھ رومی سپاہ موجود تھی۔ اس عظیم لشکر کی میدان میں موجودگی میں مسلمانوں کے زندہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی اور یہ نظر آرہا تھا کہ تین ہزار مجاہدوں میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جا سکے گا لیکن خالدؓ بن ولید نے بے پناہ شجاعت اور اپنی جنگی صلاحیت کی وجہ سے بغیر کسی بڑے نقصان کے مسلمانوں کو ہلاکت سے بچا لیا۔

یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو "سیف اللہ" کا خطاب دیا اور ان کی اور ان کے لشکر کی ہمت افزائی فرمائی۔

اب لشکرِ اسلام کے سالارِ اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نظر ایک بار پھر مکہ کی طرف اٹھی۔ اگرچہ اہلِ مکہ اور ابوسفیان میں مسلمانوں سے مقابلہ کی قطعی طاقت نہ رہی تھی لیکن "مکہ" تمام عرب قبائل کی روحانیت اور طاقت کا مرکز تھا اس لیے ابوسفیان جب تک مکہ پر قابض تھا اس کی سرداری اور طاقت برقرار تھی اور وہ اہلِ مکہ کا حاکم تھا۔

مکہ، مدینہ والوں کو بھی اسی قدر محترم اور عزیز تھا جس قدر اہلِ مکہ کے لیے۔ اگرچہ مکہ اور خانہ کعبہ میں بت پرستی ہوتی تھی اور صرف خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے لیکن مسلمان مکہ کا اس لیے احترام کرتے تھے کہ وہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا تعمیر کردہ، اس دنیا میں دینِ اسلام کی نشانی اور خدا کا پہلا گھر کعبہ موجود تھا۔

مدینہ والوں کے مکہ سے پیار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مدینہ میں بے شمار مہاجر آباد تھے جن کا اصل وطن مکہ تھا اور ان کی یادیں وہاں سے منسلک تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے راستے میں صلح نامہ حدیبیہ حائل تھا۔

صلح نامہ کی وہ شرط تو ختم کر دی گئی تھی جس کے تحت اگر کوئی مکی مسلمان مکہ چھوڑ کے مدینہ چلا جاتا تو اسے واپس مکہ بھیجنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذمے داری تھی؟ اور اس شرط کو خود ابوسفیان کی درخواست پر ختم کیا گیا تھا۔

ابنِ حاتم نے اس شرط کے منسوخ ہونے سے پہلے ہی مدینہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ابوسفیان کے سلوک نے اسے اہلِ مکہ سے پوری طرح باغی کر دیا تھا اور اب اس کے لیے مکہ کی ہوا اور فضا میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے نعیم بن مسعود کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

"چچا جان!"

ابنِ حاتم نے پرعزم لہجے میں کہا:

"میں اب مکہ میں ایک لمحہ نہیں ٹھہر سکتا۔ آپ مجھے مدینہ جانے کی اجازت دے دیجیے"۔

نعیم بن مسعود مسکرا اٹھے۔ انہیں گمان گزرا کہ شاید ابنِ حاتم اپنی منگیتر کی وجہ سے مکہ چھوڑ کر اس طرح مدینہ چاہتا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنی منگیتر کی یاد بہت ستا رہی ہے"۔

انہوں نے ابنِ حاتم کو چھیڑا:

"مگر یہ بتاؤ کہ اگر میری مصلحتیں تمہیں مدینہ جانے سے روکیں تو تم کیا کرو گے؟"

"چچا جان!"

ابنِ حاتم کا لہجہ ایک دم کرخت ہو گیا مگر فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کے چچا نعیم بن مسعود نے اس کے لیے ابوسفیان سے بڑی سخت باتیں کی تھیں اور قریش اور بنو غطفان کے درمیان جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ سخت لہجے میں صرف "چچا جان" ہی کہہ سکا۔ اس

سے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

نعیم بن مسعود نے بھی بھتیجے کے لہجے کی سختی محسوس کر لی تھی۔ پھر جب ابنِ حاتم آگے کچھ کہنے کے بجائے خاموش رہا تو انہوں نے کہا:

"ابنِ حاتم۔ تمہیں مجھ پر غصہ آ رہا ہے"۔

ان کے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی:

"میں تمہارے دل کی کیفیت سے واقف ہوں۔ ماشاءاللہ تم جوان ہو۔ پھر ــــ"

"چچا جان!"

ابنِ حاتم نے احتجاج کیا مگر اب اس کے لہجے میں سختی کے بجائے ملائمت تھی اور اس کا انداز التجائیہ تھا۔

اس نے مزید کہا:

"میرے دل میں سوائے ابوسفیان سے نفرت کے اور کچھ نہیں ہے اور یہی نفرت مجھے مکہ سے مدینہ لے جا رہی ہے"۔

"ٹھیک ہے تمہیں ابوسفیان سے نفرت کرنی ہی چاہیے"۔

نعیم بن مسعود نے ملائم لہجے میں کہا:

"اس نے تمہارے ساتھ نہ صرف غیر مہذب رویہ اختیار کیا بلکہ تمہیں قتل کرانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن تمہارے مکہ میں نہ رہنے یا مدینہ چلے جانے سے اس پر تو کوئی اثر نہ پڑے گا۔ ہاں اگر تم کسی اور وجہ سے مدینہ جانا چاہتے ہو تو ــــ"

نعیم خاموش ہو گئے مگر ان کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

ابنِ حاتم اس وقت تک اپنے غصہ و جذبات پر قابو پا چکا تھا۔ بولا:

"چچا جان! آپ نے کہا کہ میرے مدینہ جانے سے ابوسفیان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس پر یا مجھ پر کوئی اثر نہ پڑے گا لیکن اس کا اثر آپ پر ضرور پڑے گا"۔

"مجھ پر؟"

نعیم نے گھبرا کر اسے دیکھا:

"وہ کیسے؟"

"اثر یوں پڑے گا چچا جان!"

ابنِ حاتم نے وضاحت کی:

"کہ مجھے ابوسفیان سے سخت نفرت ہوگئی ہے۔ میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ مجھے نظر آ گیا تو شاید میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکوں اور تلوار کھینچ لوں"۔

"ابنِ حاتم! مجھے تمہاری نادانی پہ ہنسی آتی ہے"۔

نعیم بن مسعود بولے:

"تم ابوسفیان کی چالاکیوں اور کینہ پروری کو ضرور جانتے ہو مگر اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو۔ ابوسفیان دنیائے عرب کے ان چند شمشیر زنوں میں شمار ہوتا ہے جن کا مقابلہ کوئی کہنہ مشق ہی کر سکتا ہے"۔

ذرا رک کر انہوں نے کہا:

"میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس کے مقابلہ پہ کبھی مت آنا"۔

"میرا یہ مقصد ہرگز نہیں چچا جان"۔

ابنِ حاتم نے کہا:

"میں کب کہتا ہوں کہ میں ابوسفیان جیسا پرانا اور تجربہ کار شمشیر زن ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ میرا اس کا کبھی سامنا ہو گیا تو شاید جنگ کی نوبت آ جائے"۔

"اس جنگ سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے قبیلے سے باہر جانا بند کر دو"۔

نعیم نے اسے بڑا صائب مشورہ دیا:

"نہ تم قریش کے علاقے میں جاؤ گے اور نہ تمہارا ابوسفیان سے سامنا ہو گا"۔

ابنِ حاتم کو یہ پابندی شاید قبول نہ تھی۔

"چچا جان یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔

اس نے جلدی سے کہا:

"آئندہ ماہ عکاظ کا میلہ ہے۔ میں اس میں ضرور شریک ہوں گا"۔

اس بات کا خیال رہے کہ عرب کے مختلف قبائل مکہ کے ارد گرد بلکہ دور دور تک آباد تھے اور ہر قبیلہ کا دوسرے قبیلے سے کم از کم چار چھ میل کا فاصلہ ہوتا تھا۔

لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لیے وہ ایک دوسرے کے علاقے میں بہت کم جاتے تھے۔ صرف عکاظ کا میلہ عربوں کا وہ مشترکہ میلہ یا تہوار تھا جس میں ہر قبیلے کی شرکت ضروری ہوتی تھی۔

عکاظ کا بازار یا میلے کا میدان مکہ سے بہت قریب تھا۔ وہاں سال کے ایک دن تمام قبیلے جمع ہوتے تھے۔ درجنوں کھیل تماشے اور مقابلے منعقد ہوتے تھے۔ مقابلوں میں دو مقابلے بڑی اہمیت کے حامل تھے:

۱۔ گھڑ سواری

۲۔ شعر و شاعری

شعر و شاعری کے مقابلہ میں فی البدیہہ شعر کہنے والے شاعر شرکت کرتے تھے کیونکہ انہیں مقابلہ میں بیٹھے شاعر کو فوراً ہی شعر کا جواب شعر میں دینا ہوتا تھا۔ ہر شاعر اپنے قبیلے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔

یہ میلہ یوں تو بہت مشہور تھا اور عرب قبائل خوشی خوشی اس میں شرکت کرتے تھے لیکن ان مقابلوں میں اکثر تلخی اس وقت پیدا ہو جاتی تھی جب کوئی شاعر، مقابل شاعر کے قبیلے کی کسی حسینہ یا محبوبہ کی تعریف اس کا نام لے لے کر کرنے لگتا تھا یا پھر گھڑ دوڑ میں بے ایمانی کی جاتی۔

عربوں کی یہ قبائلی جنگ اگر ایک بار بھڑک اٹھتی تو سال دو سال تو کوئی بات نہ تھی۔ ایک جنگ تو مسلسل پچاس سال تک ہوتی رہی تھی جس میں کئی ہزار عرب مارے گئے تھے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے قبیلے صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے تھے۔

عکاظ کا نام سن کر نعیم بن مسعود چونکے۔

"تم نے اچھا یاد دلایا ابنِ حاتم"۔

انہوں نے کہا:

"اس سال تو ہم عکاظ کے میلے میں بڑی شان سے شریک ہوں گے۔ ہمارے قبیلے کے شاعر نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ اس مرتبہ وہ میلے میں دوسرے شاعروں کا دو بدو اور فی البدیہہ مقابلہ کرے گا"۔

انہوں نے ابنِ حاتم کے شانے پہ ہاتھ رکھا اور کہا:

"اس کے علاوہ اس نے اپنے قبیلے بنو غطفان کا ایسا شاندار قصیدہ تیار کیا ہے جسے سن کے قریش کے شعراء کھسیانے ہو جائیں گے"۔

"ابنِ حاتم خوش ہو گیا۔ بولا:

"یہ تو آپ نے بڑی خوشخبری سنائی چچا جان۔ پھر تو اس سال میں ضرور عکاظ کے میلے میں جاؤں گا"۔

ابنِ حاتم کا انداز بڑا فیصلہ کن تھا لیکن نعیم بن مسعود نے اسے پابند کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اسے مخاطب کر کے کہا:

"دیکھو ابنِ حاتم۔ میں تمہیں صرف ایک شرط پر عکاظ جانے کی اجازت دوں گا"۔

"فرمائیے چچا جان!"

ابنِ حاتم نے خوش دلی سے جواب میں کہا:

"میں آپ کی شرط حکم سمجھ کر پوری کر دوں گا۔"

"شرط یہی ہے بیٹے!"

نعیم بن مسعود نے محبت سے کہا:

"کہ اگر تمہارا اور ابوسفیان کا آمنا سامنا ہو جائے تو تم فوراً دوسری سمت نکل جاؤ گے۔ ورنہ سمجھ رکھو کہ ابوسفیان نے میری بھی بہت توہین کی ہے۔ اگر وہ تم سے الجھ پڑا تو میں بھی خاموش نہ رہ سکوں گا اور پھر ایک ایسی خوفناک جنگ شروع ہو جائے گی جس کے خاتمہ کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

ابنِ حاتم نے دیکھا کہ نعیم بن مسعود کی پتلیاں بدل گئی ہیں اور ہونٹ پھڑکنے لگے ہیں۔ یہ نعیم بن مسعود کے انتہائی غصے کی علامت تھی۔

پس اس نے چچا کو یقین دلایا:

"آپ بالکل مطمئن رہیے چچا جان! میں آپ کی اس شرط کو حکم سمجھ کر ابوسفیان کا قطعی سامنا نہیں کروں گا اور اگر اتفاقیہ سامنا ہو گیا تو اپنے اوپر پورا قابو رکھوں گا۔ اگر اس نے کوئی الٹی سیدھی بات کہی تو میں سر جھکا کر دوسری طرف نکل جاؤں گا۔"

"شاباش ابنِ حاتم۔"

نعیم بن مسعود اس کے جواب سے بہت خوش ہوئے:

"تم نے میرا دل خوش کر دیا۔"

انہوں نے کہا۔ پھر ذرا رک کر بولے:

"اچھا سنو۔ میں نے تمہارے لیے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

پھر ان کی خاموشی اس قدر طول کھینچ گئی کہ ابنِ حاتم کو بولنا پڑا۔

ابنِ حاتم نے کہا:

"چچا جان۔ آپ نے میرے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کیا ہے۔ کیا اس فیصلے سے آپ مجھے آگاہ نہیں کریں گے؟"

"ابنِ حاتم!"

نعیم ٹھنڈی سانس لے کر بولے:

"میں تمہیں اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔ میری دلی خواہش تھی کہ تمہاری اور نوحنا کی شادی دھوم دھام سے ہو اور ہمارا پورا قبیلہ اس میں بھرپور حصہ لے مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ابتک اس کی اجازت حاصل نہیں کر سکا کہ میں اپنے اور اپنے قبیلے کے مسلمان ہونے کا اعلان کر دوں اور اپنے پورے قبیلے کے ساتھ مدینہ منتقل ہو جاؤں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ـــ"

وہ پل بھر کو رکے۔

ابنِ حاتم ان کو امید و بیم کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کہ تم فوراً مدینہ جاؤ اور نوحنا سے شادی کر لو۔" وہ بالآخر کہہ گئے۔

"چچا جان!"

ابنِ حاتم خوش ہو گیا مگر پھر اس خیال سے افسردہ ہو گیا کہ اس کا محبت کرنے والا چچا اس شادی میں شریک نہ ہو سکے گا۔

"چچا جان!"

اب کے اس کی آواز میں اداسی تھی:

"مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا ہے جیسے میرا باپ زندہ ہو گیا ہو۔ مجھے علم نہیں تھا کہ آپ مجھ سے اسقدر محبت کرتے ہیں۔ پس میں آپ کی شرکت کے بغیر شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اب حالات اس قدر تبدیل ہو چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ کو اپنے مسلمان ہونے کے اعلان کی اجازت دیدیں گے۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ آپ کو مدینہ منتقل ہونے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی اس لیے کہ ابوسفیان آپ کی مخالفت مول لینے کی غلطی نہیں کرے گا۔"

"ابوسفیان کے دل کا حال صرف وہی جانتا ہے۔"

نعیم بن مسعود مسکرا اٹھے:

"وہ بڑا گہرا آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاید اس وقت وہ میری مخالفت نہ کرے مگر بچھو ڈنک مارنے سے تو نہیں چوکتا۔ یہ تو اس کی فطرت ہے۔"

"تو پھر آپ مجھے اجازت دیجیے چچا جان!"

ابنِ حاتم نے سینہ تان کر کہا:

"کہ یہ کام میں سرانجام دوں!"

"کونسا کام؟"

نعیم بن مسعود گھبرا گئے:

"تم کونسا کام کرنا چاہتے ہو ابنِ حاتم"۔

"یہی کام چچا جان!"

ابنِ حاتم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

"کہ میں مدینہ جا کر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ آؤں کہ میں اور آپ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

نعیم بن مسعود سوچ میں ڈوب گئے۔

"دیکھو ابنِ حاتم!"

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا:

"تم اگر مدینہ جانا چاہتے ہو تو شوق سے چلے جاؤ۔ تم وہاں جا کے شادی بھی کر سکتے ہو مگر جہاں تک میرے مسلمان ہونے کا معاملہ ہے تو یہ میرے اور میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ایک معاہدہ ہے اور یہ معاہدہ اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب میرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اسے ختم کریں گے۔ میں اس سلسلے میں ان سے کوئی درخواست نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے چچا جان"۔

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"آپ اپنا معاہدہ نہیں توڑ سکتے تو نہ توڑیے مگر میں تو عہد کر سکتا ہوں!"

"کیسا عہد۔ کس کا عہد؟"

نعیم بن مسعود الجھ کر بولے:

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو ابنِ حاتم!"

"اچھا تو سنیئے کہ میں کیا عہد کر رہا ہوں!"

ابنِ حاتم نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا:

"میں عہد کرتا ہوں کہ مکہ میں رہوں یا مدینہ میں مگر نوجوان سے میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک مکہ کا ہر مسلمان بھی اسی طرح سر اٹھا کر نہ چل سکے جس طرح مدینہ کے مسلمان چلتے ہیں۔"

نعیم بن مسعود اپنے بھتیجے کا عہد سن کر حیران رہ گئے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ وہ ایک ایسا نوجوان ہے جسے ایک لڑکی سے محبت ہے اور شاید لڑکی کو بھی اس سے محبت ہو۔ پھر یہ کہ وہ دونوں شادی کر سکتے ہیں، کوئی مجبوری بھی درمیان میں حائل نہیں، پھر بھی یہ نوجوان اسلام کی سربلندی کا خواہش مند ہے اور اپنی تمام خواہشات کو اس وقت تک طاقِ نسیاں پر رکھنا چاہتا ہے جب تک مکہ میں پوری طرح اسلام پھیل نہ جائے۔

ظاہر ہے کہ مکہ میں اس وقت تک کوئی مسلمان سر اٹھا کے نہیں چل سکتا جب تک مکہ کے لوگ بت پرستی چھوڑ کے اسلام کو سینے سے نہ لگا لیں اور یہ بات تب ہی ممکن ہو سکتی ہے جب مسلمانوں کا مکہ پر قبضہ ہو جائے۔

آخر نعیم بن مسعود مسکرائے۔

"شاباش ہے تم پر ابنِ حاتم"۔

انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا:

"اگر عرب کے تمام نوجوان تمہارے جیسے دل و دماغ کے مالک ہو جائیں تو پھر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔"

اسی شام ابنِ حاتم نے رختِ سفر باندھا اور عازمِ مدینہ ہوا۔

نعیم بن مسعود نے اسے چلتے وقت بتایا تھا کہ وہ مدینہ پہنچتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر میں شامل ہو جائے گا۔

"میرا مشورہ ہے ابنِ حاتم!"

نعیم بن مسعود نے کہا تھا:۔

"کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے خالدؓ بن ولید سے ملنا اور اگر ضرورت پڑے تو انہیں میرا حوالہ بھی دے دینا تاکہ تمہیں لشکرِ اسلام میں نہ صرف شامل کر لیا جائے بلکہ تمہیں کوئی اچھا عہدہ بھی مل سکے"۔

چچا کی اس ہدایت کے تحت ابنِ حاتم مدینہ میں داخل ہوتے ہی سیدھا خالدؓ بن ولید کے پاس پہنچا اور سلام کے بعد عرض کیا:

"اے سردار۔ میں بنو غطفان کے سردار نعیم بن مسعود اشجعی کا بھتیجا ابنِ حاتم ہوں۔ میں ابھی ابھی مکہ سے یہاں پہنچا ہوں۔ میرے چچا نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا

سلام پیش کروں۔"

"وعلیکم السلام اے ابنِ مسعود!"

خالدؓ بن ولید نے پہلے نعیم بن مسعود کے سلام کا جواب دیا پھر ابنِ حاتم سے مخاطب ہوئے:

"اے ابنِ مسعود کے قاصد اور بھتیجے! کیا نام بتایا تم نے اپنا؟"

"خادم کو ابنِ حاتم کہتے ہیں اے محترم سردار۔" اس نے بڑے ادب سے خالدؓ بن ولید کے سوال کا جواب دیا۔

"بہت خوب ابنِ حاتم!"

خالدؓ خوش دلی سے بولے:

"نعیم بن مسعود میرے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ تم ان کے بھتیجے ہو اس لیے میرے بھی بھتیجے ہوئے ب میں تمہیں بھتیجا ہی کہہ کر مخاطب کروں گا۔"

"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے سردارِ محترم!" اس نے بڑے عجز سے کہا۔

"اچھا بھتیجے!"

خالدؓ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا:

"یہ تو بتاؤ کہ ہمارے دوست نے کیا پیغام دیا ہے؟"

"محترم سردار۔"

ابنِ حاتم نے ادب سے جواب دیا:

"چچا نے آپ کو صرف سلام بھیجا ہے۔ ہاں میں ضرور ایک عرض لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

"بھئی ابنِ حاتم!"

خالدؓ بن ولید نے کہا:

"یہ عرض معروض سب تکلف کی باتیں ہیں۔ صاف صاف بتاؤ کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے اور تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے سردارِ محترم!"

ابنِ حاتم نے جلدی سے کہا:

"میں دراصل آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارے بھتیجے میں وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو۔" خالدؓ بن ولید بدستور مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے بولے:

"میں تمہیں بھتیجا کہہ چکا ہوں۔ تم جو چاہتے ہو صاف صاف کہہ ڈالو۔ میں تمہاری خواہش پوری کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔"

"سردارِ محترم!"

ابنِ حاتم نے سر جھکا کر عرض کیا:

"میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے لشکرِ اسلام میں داخل کرا دیں۔"

خالدؓ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے بھتیجے!"

انہوں نے جواب میں کہا:

"میں تمہیں مرحبا اور خوش آمدید کہتا ہوں۔ لشکرِ اسلام کو تم جیسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے۔ تم ج سے اپنے آپ کو 'اسلامی لشکر' میں شامل سمجھو۔"

ابنِ حاتم بے انتہا خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ لشکر میں شامل ہونے کے لیے شاید اس کا امتحان جائے گا مگر اسے فوراً ہی قبولیت حاصل ہو گئی۔

اس نے بڑی مسرت سے کہا:

"سردارِ محترم۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے میری ایک بہت بڑی تمنا پوری کر دی۔"

"اچھا بھتیجے۔ اب ایک بات بتاؤ۔"

خالدؓ نے ابنِ حاتم کو پاس بٹھا کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا:

"کبھی تم نے کسی کو قتل ہوتے دیکھا ہے؟"

"جی سردار۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا:

"میں نے کئی آدمیوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے بلکہ ــــ" وہ کہتے کہتے ایکدم رک گیا۔

"رک کیوں گئے بھتیجے؟"

خالدؓ نے دلچسپی سے پوچھا

"تم کچھ کہہ رہے تھے!"

"سردارِ محترم!" ابنِ حاتم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا:

"میں نے کئی آدمیوں کو قتل ہوتے اور قتل کرتے بھی دیکھا ہے۔ میں نے کئی لڑائیاں دیکھی ہیں اور میں ــــ میں خود بھی ایک لڑائی لڑ چکا ہوں"۔

"اچھا۔ تو ہمارا بھتیجا لڑائی لڑ بھی چکا ہے"۔

خالدؓ کی دلچسپی اور بڑھ گئی:

"کسی سے مار پیٹ ہوئی تھی یا کُشتی لڑے تھے؟"

"نہیں سردارِ محترم! ایسی بات نہیں ہے"۔

ابنِ حاتم نے سنبھل کر کہا:

"دراصل ابوسفیان کے تین سواروں نے مجھ پر ایک دم حملہ کر دیا تھا۔ پھر مجھے بھی مجبوراً ان سے لڑنا پڑا تھا"۔

"اچھا۔ تو تم ابوسفیان کے سواروں سے دُو بدُو لڑ چکے ہو"۔

خالدؓ نے پہلو بدل کے پوچھا:

"یہ کب کا واقعہ ہے اور اس کا کیا نتیجہ نکلا تھا؟"

خالدؓ بن ولید کے دریافت کرنے پر ابنِ حاتم نے اس واقعہ کی پوری تفصیل بیان کر دی۔

اس وقت خالدؓ بن ولید کو یاد آیا کہ وہ یہ واقعہ پہلے بھی سُن چکے ہیں۔ پھر انہوں نے ابنِ حاتم کو اس کی بہادری پر داد دی اور فی الحال اسے چار سواروں کا سردار مقرر کر دیا۔

"سردارِ محترم!"

ابنِ حاتم نے ایک اور درخواست پیش کی:

"میرے خالو اور خالہ مدینہ میں رہتے ہیں۔ میں ان سے کچھ دیر کے لیے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں سے لوٹ کر میں یہیں فوجی خیموں میں آملتا ہوں گا"۔

"ٹھیک ہے!"

خالدؓ بن ولید نے اسے اجازت دیدی:

"تم اپنے عزیزوں کے پاس جا سکتے ہو"۔

پھر ایک سردار کو بلا کر اسے حکم دیا:

"اس نوجوان کو اچھی طرح پہچان لو۔ اس کا تعلق بنو غطفان سے ہے اور یہ سردار نعیم بن مسعود کا بھتیجا ہے۔ اس لیے میرا بھی بھتیجا ہے۔ ہم نے اسے چار سواروں کا سردار مقرر کیا ہے۔ ابھی یہ واپس آتا ہے تو تم اسے ضروری باتیں سمجھا دینا"۔

"مجھے جانے کی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے سردارِ محترم!"

ابنِ حاتم نے خالدؓ بن ولید سے کہا:

"جانے سے پہلے میں سردار سے ضروری ہدایات لینا چاہتا ہوں۔ آپ سردار سے کہہ دیجیے کہ وہ مجھے آگاہ کر دیں"۔

اور خالدؓ بن ولید نے ابنِ حاتم کو سردار کے حوالے کر دیا۔

شام کے وقت ابنِ حاتم نے خالہ کے گھر کا رُخ کیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خالہ سے صاف صاف کہہ دے گا کہ اس نے یہ قسم کھائی ہے کہ جب تک مکہ کا ہر مسلمان مدینہ کے مسلمانوں کی طرح سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں ہو جاتا وہ نوحنا سے شادی نہیں کرے گا۔

ابنِ حاتم کو نوحنا اور خالہ خالو کا بہت خیال تھا لیکن اس نے جو قسم کھائی تھی اسے کسی قیمت پر وہ توڑنے پر آمادہ نہ تھا۔

ابنِ حاتم نے خالہ کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ نوحنا نے کھولا۔ وہ ابنِ حاتم کو اپنے سامنے دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔

ابنِ حاتم اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تم ـــ!"

نوحنا نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا:

"تم ابنِ حاتم ہی ہو نا ـــ!"

"ہاں ہاں۔ میں ابنِ حاتم ہی ہوں"۔

"میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟"

"نہیں نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے مسکرا کر کہا:

"تم خواب نہیں دیکھ رہی ہو بلکہ کُھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہو"۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا"۔

"لو۔"

ابنِ حاتم نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا:

"میرا ہاتھ چھو کر یقین کر لو۔"

"یقین تو آگیا ہے مگر ـــــ"

"دروازے پر ہی کھڑا رکھو گی۔"

اس نے سرگوشی میں کہا:

"اندر آنے کو نہیں کہو گی نوحنا!"

نوحنا جیسے خواب سے چونک پڑی۔

"آؤ۔"

وہ جلدی سے سامنے سے ہٹ گئی:

"اندر آ جاؤ ابنِ حاتم!"

ابنِ حاتم گھر میں داخل ہوا۔ نوحنا آگے اور ابنِ حاتم پیچھے تھا۔ اسی وقت کمرے سے نوحنا کی ماں کی آواز سنائی دی:

"کون آیا ہے بیٹی نوحنا؟"

"ابنِ حاتم آئے ہیں ماں!"

اس وقت نوحنا اور ابنِ حاتم برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ نوحنا کی ماں بیٹی کی آواز سن کے برآمدے میں نکل آئیں اور اب منہ کھولے حیران نظروں سے نوحنا اور ابنِ حاتم کو دیکھ رہی تھیں۔

قریب جا کر ابنِ حاتم نے انہیں سلام کیا اور انہوں نے اسے گلے لگا کر دعائیں دیں۔

"بیٹے!"

انہوں نے محبت سے کہا:

"آنے کی اطلاع تو دی ہوتی!"

"بس ایک دم چلا آگیا خالہ۔"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"اطلاع دینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"

سب اندر جا کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ نوحنا جلدی سے خشک میوے اور شربت کا گلاس ابنِ حاتم

لیے لے آئی۔

نوحنا کے والد باہر گئے ہوئے تھے وہ بھی واپس آگئے اور اب دوبارہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ نوحنا کی ماں نے بات شروع کی:

"کتنے روز کے لیے آئے ہو بیٹا؟"

"میں ہمیشہ کے لیے آگیا ہوں خالہ جان!"

اس کے جواب پر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ نوحنا کا رنگ تو گلاب کی طرح دمکنے لگا۔ خالہ کو شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں سن نہیں پائی بیٹا!"

انہوں نے تصدیق کے لیے کہا:

"کیا کہا تھا تم نے؟"

"خالہ جان!"

ابنِ حاتم نے ذرا وضاحت سے جواب دیا:

"میں نے کہا ہے کہ میں فی الحال مدینہ میں ہی رہوں گا۔ یہاں سے کب اور کدھر جاؤں گا اس کا مجھے علم نہیں۔"

نوحنا کی ماں نے اپنے شوہر کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ اب تم پوچھو۔

"بیٹے ابنِ حاتم!"

انہوں نے دھیمی آواز میں دریافت کیا:

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم مدینہ میں رہو گے مگر تمہاری دوسری بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"خالو جان!"

ابنِ حاتم نے صاف الفاظ میں کہا:

"میں نے لشکرِ اسلام میں شمولیت کر لی ہے۔ اب میرا کہیں رہنا نہ رہنا میری فوج کے ساتھ ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوا بیٹا۔"

خالو نے مسرت بھرے لہجے میں کہا:

"لشکر کی نوکری بڑی عزت کی نوکری ہوتی ہے۔ عزت کے ساتھ اس میں ثواب بھی ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا خالو جان!"

ابنِ حاتم نے کہا:

"جب تک زندہ رہے غازی کہلائے اور اگر راہِ خدا میں مارا جائے تو شہید"۔

یہ کہتے ہوئے ابنِ حاتم نے نوحنا کی طرف دیکھا جس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے تو کوئی بات نہ کہی البتہ خالہ چپ نہ رہ سکیں۔

"خدا تمہیں زندہ سلامت رکھے بیٹے!"

انہوں نے فوراً کہا:

"میں تمہیں لشکر کی نوکری سے منع نہیں کرتی لیکن اگر کوئی دوسری نوکری مل جاتی تو زیادہ بہتر تھا"۔

"وہ کیوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے خالہ جان"۔

ابنِ حاتم کو ذرا افسوس ہوا:

"لشکرِ اسلام میں کسے جگہ ملتی ہے۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے نوکری بھی ملی اور ساتھ میں ابتدا ہی سے سرداری بھی!"

"وہ کیسے بیٹے!"

خالو نے دریافت کیا:

"کیا تم مکہ میں نوکر ہوئے تھے؟"

"نہیں خالو جان! مکہ میں تو سب مشرک رہتے ہیں!"

ابنِ حاتم نے بتایا:

"میرے لیے چچا نعیم نے اسلامی لشکر کے ایک بڑے سردار خالدؓ بن ولید سے سفارش کی ہے۔ میں سیدھا ان کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مجھے نوکر بھی رکھا اور ساتھ ہی چار سو اروں کا سردار بھی مقرر کر دیا"۔

"خدا مبارک کرے!"

یہ الفاظ ایک دم نوحنا کی زبان سے جیسے پھسل پڑے۔ پھر اس نے فوراً سر جھکا لیا۔

نوحنا کی ماں اور باپ دونوں نے حیران نظروں سے نوحنا کی طرف دیکھا۔ حیرت تو ابنِ حاتم کو بھی ہوئی لیکن اسے خوشی بھی ہوئی کیونکہ ایسے وقت میں صرف ایک بہادر اور اسلام دوست لڑکی ہی اسے مبارک دے سکتی تھی۔

ابنِ حاتم نے براہِ راست اسے مخاطب کیا:

"نوحنا۔ مجھے تمہاری مبارک باد کی بہت خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اس خبر پہ تم رو پڑو گی مگر تم نے ایک باہمت لڑکی ہونے کا ثبوت دیا ہے!"

نوحنا کی ماں کھڑی ہو گئیں۔

"چلو۔ ہم تم دوسرے کمرے میں چلتے ہیں"۔

انہوں نے اپنے شوہر سے کہا:

"نوحنا خود ہی پوچھ لے گی کہ اب ابنِ حاتم کب تک اسے بیاہ کر لے جائے گا"۔

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

نوحنا کے والدہ کے آخری جملے میں بڑی تلخی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے اس ایک جملے میں اپنے دل کی پوری گھٹن اور اس کرب کو سمو دیا تھا جو ایک جوان لڑکی کی ماں پہ طاری ہوتا ہے۔

نوحنا نے سوچا' ابنِ حاتم کو اس کی ماں کی بات ضرور ناگوار گزری ہوگی۔ اس لیے اس نے فوراً اس کا توڑ کیا۔

"ابنِ حاتم۔ میں اپنی والدہ کی طرف سے معافی مانگتی ہوں"۔

اس نے جلدی سے کہا:

"وہ دراصل ان دنوں بہت پریشان رہتی ہیں۔ دوسری طرف بابا دن رات کے بیمار رہیں۔ ماں کا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے اسی لیے"۔

"مجھے اس کا پوری طرح احساس ہے نوحنا"۔

ابنِ حاتم نے ایک ہلکی سی سانس لے کر جواب دیا:

"انہیں یہی کہنا چاہیے تھا۔ آخر وہ تمہیں کب تک بٹھائے رکھیں۔ میری تقدیر ایسی کہ یہاں سے واپسی پہ مجھے ابوسفیان کے آدمیوں نے گھیر لیا۔ وہ تو میرے قتل پہ آمادہ تھے۔ ان میں سے ایک آدمی میرے ہاتھ سے مارا بھی گیا۔

تمہیں کہاں تک بتاؤں نوحنا! کیا کیا نہ گزرا مجھ پر مگر میں اپنے وعدے پہ قائم ہوں۔ بشرطِ زندگی شادی صرف تم سے کروں گا"۔

نوحنا بڑے حوصلے سے اس کی بات سنتی رہی۔ بیچ میں بالکل نہ بولی مگر ابنِ حاتم کے خاموش ہوتے ہی وہ جیسے پھٹ پڑی:

"ابنِ حاتم آخر کب تک۔ میرے بوڑھے ماں باپ کب تک تمہارا انتظار کریں گے۔ ان کی آنکھیں کسی وقت بھی بند ہو سکتی ہیں۔ پھر میرا کیا ہوگا۔ میں کہاں جاؤں گی؟"

ابنِ حاتم نوحنا کی باتوں سے پریشان ہو گیا۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ آخر وہ کب تک اس کا

انتظار کرے۔ ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ دو مہینے مگر یہاں تو سال پر سال گزرتے چلے جا رہے تھے اور انتظار تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہا تھا۔

اب ابنِ حاتم کو افسوس ہوا کہ اس نے جذبات میں آ کر یہ قسم کیوں کھالی کہ جب تک مکہ میں مسلمان سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں ہو جاتے وہ شادی نہیں کرے گا۔

مکہ پر مشرکین کا قبضہ ہے، کعبۃ اللہ کے اندر ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے ہیں۔ مدینہ کے علاوہ تمام عرب ان بتوں کی پوجا کرتا ہے۔ اگر کسی نے کعبہ سے بُت ہٹانے کی کوشش کی تو پورا عرب مدینہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا۔

"نوحنا!"

ابنِ حاتم نے مضمحل آواز میں کہا:

"میں نے تم سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس وعدہ پر قائم ہوں۔ یقین کرو میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا!"

"میرے یقین کرنے سے کیا ہوتا ہے!"

نوحنا تیز لہجے میں بولی:

"اب تک تم پر یہاں آنے جانے کی پابندی تھی۔ اب تم یہاں آ گئے ہو۔ اللہ نے تمہیں ملازمت بھی دے دی ہے۔ تمہیں مدینہ ہی میں رہنا ہے۔ پھر کون سی وجہ ہے یا کونسی بات ہے جو تمہیں شادی سے روک رہی ہے"۔

ابنِ حاتم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ آخر اس نے نوحنا کو تسلی دینے کے لیے کہا:

"پریشان نہ ہو نوحنا۔ اس وقت تو میں جا رہا ہوں۔ میں اپنے سردار سے بات کروں گا۔ دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ پھر میں ایسا کمینہ بھی نہیں کہ تمہیں اتنا عرصہ سہارا دے کر بات ختم کر دوں۔ کل تک میرا اور انتظار کر لو۔ خدا نے چاہا تو کوئی صورت نکل آئے گی"۔

دراصل ابنِ حاتم میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ نوحنا کو یہ بتا سکتا کہ اس نے جوش میں آ کر ایک قسم کھالی ہے۔

ابنِ حاتم نے نوحنا کو امید دلائی تو وہ خوش ہو گئی

"دیکھو ابنِ حاتم!" وہ فوراً بولی: "مجھے دھوکہ نہ دینا۔ کل ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی"۔

"ہاں ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ضرور آؤں گا"۔

ابنِ حاتم چلنے کو تیار ہوا!

"دیکھو تم خالو اور خالہ کو ذرا سنبھال لینا۔ انہیں بڑا صدمہ ہے"

"تم جاؤ۔ میں انہیں سمجھا لوں گی"۔

اتنا کہہ کر نوحنا تو کمرے کی طرف چلی اور ابنِ حاتم موقع دیکھ کر دروازے کی طرف بڑھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ابنِ حاتم کا دماغ سخت پریشان تھا۔ جب تک وہ نوحنا سے دور تھا اسے کوئی زیادہ فکر نہ تھی لیکن اب نوحنا کا معصوم چہرہ اور خالہ خالو کی ابتر حالت نے اس کا سکون چھین لیا تھا۔

اسی فکر میں ڈوبا ہوا وہ مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں پہنچا۔

اسے جن چار سواروں کی سرداری دی گئی تھی، ان ہی کے خیمے میں اسے رہنے کو کہا گیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو خالدؓ بن ولید سے کہہ کر اپنی خالہ کے گھر بھی رہ سکتا تھا مگر اس بارے میں وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ وہاں کسی صورت نہ رہے گا اس لیے کہ اس کا فی الحال نوحنا سے شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

ابنِ حاتم کی اپنے چاروں سپاہیوں سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اگرچہ وہ خالہ کے گھر جانے سے پہلے سرسری طور پر ان سے مل چکا تھا مگر اسے پوری ملاقات تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں کے حالات اس وقت تک کچھ زیادہ بہتر نہ تھے۔ نہ ان کے پاس پوری طرح اسلحہ تھا اور نہ ضروری سامان۔

ابنِ حاتم کو جس خیمہ میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا اس میں پہلے ہی چار آدمی رہتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے ہی وہ خیمہ ناکافی تھا مگر مجبوری کا نام صبر ہے۔ پھر یہ کہ یہ لشکرِ اسلام تھا۔ اس کے ہر سپاہی اور ہر افسر کو تمام انتظامات خود اپنے طور پر کرنے پڑتے تھے۔ ہر سپاہی کے پاس اپنا لباس اور اپنا اسلحہ تھا۔ یہ خیمہ بھی مدینہ کے ایک رئیس نے اسلامی لشکر کو عطیہ کے طور پر دیا تھا ورنہ اب تک یہ حال تھا کہ لشکرِ اسلام کے جیالے خیمہ گاہ میں رہنے کے بجائے یا تو اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے یا انہوں نے مخیّر لوگوں کے پاس اپنے قیام و طعام کا انتظام کر رکھا تھا۔

ابنِ حاتم اپنے خیمہ پر پہنچا تو اس کے سپاہیوں نے اسے سلام کیا۔ چونکہ وہ افسردہ تھا اس لیے اس کے

ساتھیوں کو بھی فکر لگ گئی۔

ابنِ حاتم سلام کا جواب دینے کے بعد خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کے تین ماتحت ادھیڑ عمر کے تھے اور ایک اس کا ہم سن تھا۔

پس ابنِ حاتم کے ہم عمر نے اس سے کہا:

"سردار۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ کی کوئی مدد تو نہیں کر سکتے لیکن اگر آپ اپنے دل کا حال ہم سے بیان کریں تو آپ کا دل بھی ہلکا ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی آپ کو اچھا اور مناسب مشورہ بھی دے سکے۔"

غمگین اور افسردہ آدمی کو اگر ذرا بھی سہارا مل جائے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ ابنِ حاتم بھی اپنے ساتھیوں کی ہمدردی سے بہت خوش ہوا۔

اس نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"میں دراصل ایک خاندانی جھگڑے میں الجھ گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورتِ حال میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔"

ابنِ حاتم کے سپاہیوں کے چہروں پر بھی رونق آ گئی۔ اسے پریشان دیکھ کر وہ بھی افسردہ ہو گئے تھے جب ابنِ حاتم نے انہیں محبت سے مخاطب کیا تو ان کے چہرے کھل اٹھے۔

"سردار۔"

اس کے ہم عمر نے کہا:

"میرا نام گمنام ہے۔ میرے ساتھیوں کے نام انعام، کام اور خوش نام ہیں۔ خوش نام چونکہ ہم میں سب سے بڑے ہیں اس لیے ہم نے ان کا ایک ایسا نام رکھا ہے جو دن بھر میں کئی بار بدلتا ہے ـــ آپ سمجھ گئے نا سردار۔"

ابنِ حاتم کو گمنام کی باتیں بہت دلچسپ محسوس ہوئیں اور اس کا غم بھی کچھ ہلکا ہو گیا۔ اس نے اسے مخاطب کر کے کہا:

"بھائی گمنام! تم بہت کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری باتیں سن کے میرا آدھا غم دور ہو گیا ہے مگر تم نے اپنے بزرگ ساتھی کا نام نہیں بتایا۔

اب تک تو ہم سنتے آئے تھے کہ آب و ہوا بدلتی ہے۔ موسم بدلتا ہے مگر یہ نہیں سنا تھا کہ نام بھی بدل جاتا ہے اور وہ بھی دن میں بار بار۔ ذرا مجھے بھی بتاؤ کہ وہ کون سا نام ہے جو دن میں کئی کئی بار

بدلتا ہے؟"

گمنام کی باتیں تو دلچسپ تھیں ہی مگر ابنِ حاتم نے اس کی جس انداز میں پذیرائی کی وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھا۔

اس کے چاروں ماتحت یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ ان کا نیا سردار پہلے سردار کے مقابلہ میں کافی خوش مزاج ہے۔

"سردار۔"

گمنام نے چہک کے جواب دیا:

"ہمارے برادرِ بزرگ کا نام صبح و شام ہے۔ جس وقت یہ ہمیں خوش دکھائی دیتے ہیں ہم انہیں "صبح بھائی" کہتے ہیں اور جس وقت ان کے چہرے سے غم ٹپکتا ہے اس وقت ان کا نام صبح سے تبدیل ہو کر شام ہو جاتا ہے۔"

"بہت خوب۔"

ابنِ حاتم نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

"یہ تو بہت دلچسپ نام ہے"۔

گمنام نے اس کی سرد آہ پر فوراً گرفت کی۔

"سردار"۔

اس نے آہ ختم ہونے سے پہلے کہا:

"جب آپ ہمیں اپنا ساتھی خیال کرتے ہیں تو پھر اپنے غم میں کیوں شریک نہیں کرتے۔ خدا کے لیے بتائیے آپ کو کیا غم ہے جس نے آپ کو بے چین کر رکھا ہے؟"

ابنِ حاتم سوچ میں پڑ گیا۔

اب وہ اسے کیسے بتاتا کہ اسے نوحنا سے محبت ہے اور یہ محبت آج کی نہیں بلکہ برسوں پرانی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ ایک قسم کی وجہ سے وہ نوحنا سے شادی نہیں کر سکتا، بظاہر کتنی بری بات تھی کہ ایک طرف تو اسے یہ دعویٰ تھا کہ اسے نوحنا سے دل و جان سے محبت ہے اور دوسری طرف اس سے شادی سے انکار۔ وہ حالات کے گرداب میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

"سردار۔ کیا آپ ہمیں اپنا ہمدرد نہیں سمجھتے؟" گمنام نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں ابنِ حاتم کو چھیڑا۔

ابنِ حاتم کو آخر بتانا ہی پڑا لیکن اس نے بہت سی باتیں چھپا کے صرف اتنا ہی بتایا۔

"میرے دوستو میرے ساتھیو! بات بہت چھوٹی سی ہے مگر میرے لیے بہت بڑی ہے۔ بات یہ ہے کہ کچھ سال پہلے میرا رشتہ میری خالہ زاد بہن سے ہوا تھا۔ میری مرضی بھی اس میں شامل تھی۔

پھر حالات کچھ ایسے ناموافق ہو گئے کہ مجھے مدینہ چھوڑ کے مکہ جانا پڑا اور رشتہ کی یہ بات حالات کی گرد میں دب گئی۔

اب میں پھر مدینہ واپس آیا ہوں تو خالہ اور خالو میرے سر ہیں کہ فوراً شادی کر دو۔ میں اسی وجہ سے پریشان ہوں"۔

"سردار، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے"۔

گمنام نے بہت زور دے کر کہا:

"آپ ہاں کیجیے۔ ہم لوگ سب انتظام کر لیں گے"۔

"گمنام بات ایسی نہیں ہے"۔

ابنِ حاتم نے اسے سمجھایا:

"شادی تو میں خود بھی کرنا چاہتا ہوں مگر ایک مشکل ہے"۔

"وہ کیا سردار؟"

"مشکل یہ ہے کہ میں نے اپنے چچا کے سامنے قسم کھائی ہے کہ جب تک اسلام کا بول بالا نہیں ہوتا اور مسلمان مکہ میں بھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں ہو جاتے میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا"۔

ابنِ حاتم نے الجھ کر کہا:

"اب بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

گمنام جلدی سے بولا:

"بس۔ اتنی سی بات ہے سردار"۔

"یہ اتنی سی بات ہے"۔

ابنِ حاتم دکھ سے بولا:

"اس بات نے تو میرے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے"۔

"اب آپ چاہتے یہ ہیں......"

گمنام نے اس کی باتیں سُنی ان سُنی کرتے ہوئے کہا: "کہ آپ کی قسم بھی نہ ٹوٹے اور خالہ خالو شادی

پر زور بھی نہ دیں"۔

"ہاں ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں"۔

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"مگر اس کی کوئی صورت سمجھ نہیں آتی"۔

"تو پھر سنیے میرے سردار!"

گمنام نے بڑے اعتماد سے کہا:

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے"۔

"کیا مطلب؟"

ابنِ حاتم نے اسے حیرت سے دیکھا:

"تمہارے پاس اس کا کوئی حل ہے؟"

"بالکل ہے سردار"۔

گمنام نے جواب دیا:

"آپ کل اپنے خالو اور خالہ کے پاس جائیے اور ان سے کہیے کہ آپ کی اپنی بیٹی کے ساتھ فوراً منگنی کر دیں۔ اس پر وہ فوراً آمادہ ہو جائیں گے۔ اگر آمادہ نہ ہوں تو آپ میرا نام بدل ڈالیے گا"۔

"منگنی!"

ابنِ حاتم زیرِ لب بڑبڑایا۔ نوحنا کو وہ اپنی منگیتر تو کہتا تھا۔ خاندان والے بھی نوحنا کو اس کی منگیتر ہی سمجھتے تھے مگر یہ سب زبانی کلامی باتیں تھیں۔ اس کی نوحنا کے ساتھ باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو اہم رسم تھی۔ عربوں میں بھی اس رسم کا رواج تھا۔

"گمنام!"

ابنِ حاتم مسکرایا اور بولا:

"تم نے تو میری مشکل آسان کر دی۔ میں تمہارا شکرگزار ہوں"۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں سردار"۔

گمنام نے کہا:

"دراصل یہ ترکیب میرے باپ نے میرے معاملے میں سوچی تھی۔ میری سسرال والے بھی شادی پر بہت زور دے رہے تھے۔ میرے باپ نے ان کے سامنے فوراً منگنی کی پیش کش کی اور وہ انکار نہ کر سکے"۔

پھر بھی کچھ ابنِ حاتم کے معاملے میں ہُوا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح نوحنا کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے باپ نے دروازہ کھولا تو ایک لمبے تڑنگے جوان کو کھڑے دیکھا۔

جوان نے ادب سے سلام کیا اور کہا:

"میں سردار ابنِ حاتم کا ماتحت ہوں"۔

نوحنا کے والد اب تک حیران نظروں سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس عالم میں نہ تو انہوں نے جوان کے سلام کا جواب دیا اور نہ اس کے دوسرے اظہار پر کچھ بولے۔

نوجوان نے انہیں حیران دیکھا تو وضاحت کے لیے کہا:

"آپ حیران نہ ہوں خالو جان۔ میں واقعی آپ کے بھانجے ابنِ حاتم کا ماتحت ہوں اور اس وقت اپنے سردار کا ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں"۔

خالو جان کے الفاظ میں نوحنا کے والد کو شاید اپنائیت محسوس ہوئی اور وہ جیسے ہوش میں آگئے۔ بولے:

"تم ابنِ حاتم کو جانتے ہو؟"

"خالو جان۔ جاننا کیسا۔ میں تو ان کا خادم ہوں۔ وہ میرے سردار ہیں اور ــــ"

"کیا نام ہے تمہارا بیٹے؟" انہوں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

جوان نے انکساری کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"چچا جان۔ میں ہوں تو گمنام مگر آپ مجھے کسی نام سے بھی پکار سکتے ہیں"۔

"خدا نہ کرے تم گمنام ہو"۔ نوحنا کے والد بڑے پیار سے بولے: "تم کہتے ہو کہ میرے بھانجے ابنِ حاتم کے ماتحت سوار ہو۔ پھر تم گمنام کیسے ہوئے۔ اپنا نام بتانے میں مجھ سے کیوں تکلف کر رہے ہو۔ میرے لیے تو جیسے ابنِ حاتم ویسے تم!"

پھر نوحنا کے والد نے پورا دروازہ کھول دیا اور کہا:

"اندر آجاؤ بیٹے۔ اطمینان سے بیٹھ کے بات کریں گے"۔

وہ گمنام کو دروازے کے برابر والے کمرے میں لے گئے جو دن میں مہمان خانہ کا کام دیتا تھا اور رات کو سونے کا کمرہ بن جاتا تھا۔

دونوں جا کے بیٹھے ہی تھے کہ نوحنا کی والدہ آگئیں اور داخل ہوتے ہوئے بولیں:

"یہ آپ کس سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے بھی تو بتایا ہوتا کچھ؟"

"تم بیٹھ جاؤ۔ پھر بتاتا ہوں سب کچھ"۔

نوحنا کے والد کے کہنے پر وہ ان کے ہی برابر بیٹھ گئیں۔

"یہ میری بیگم اور ابنِ حاتم کی خالہ ہیں"۔ انہوں نے گمنام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ ابنِ حاتم کے ماتحت ایک سوار ہیں اور ابنِ حاتم کا ایک ضروری پیغام لے کر آئے ہیں"۔

"اللہ سلامت رکھے تمہیں بیٹے!" نوحنا کی والدہ نے اسے دعا دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے دریافت کیا: "اے بیٹے تمہارا نام کیا ہے؟"

"گمنام ــــ" گمنام نے جواب میں کہا: "میں چچا جان کو بتا چکا ہوں کہ میں واقعی گمنام ہوں لیکن خالو جان ــــ"

"خدا نہ کرے تم گمنام ہو"۔ بڑی بی بات کاٹ کے بولیں: "تم میرے بھانجے ابنِ حاتم کے ماتحت ہو۔ کیا یہ نام کچھ کم ہے۔ اچھا بیٹے! ہم تمہارا نام نہیں پوچھتے۔ ہاں یہ بتاؤ ابنِ حاتم نے کیا پیغام بھیجا ہے"۔

ابنِ حاتم اور پیغام کی آواز نوحنا کے کان تک بھی پہنچ گئی تھی اور وہ بھاگی ہوئی دروازے کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

گمنام نے سنبھل کے کہنا شروع کیا:

"خالہ جان۔ پیغام یہ ہے کہ بس آپ تیاری کیجیے۔ آج شام سردار ابنِ حاتم چار آدمیوں کے ساتھ آپ کے گھر آرہے ہیں۔ کوئی زیادہ تیاری کی ضرورت نہیں۔ بس یہی کچھ میوے، کچھ پھل اور چار پانچ گلاس شربت ــــ"

بڑی بی اور بڑے میاں دونوں بدحواس ہو گئے۔

آخر بڑی بی سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے بات کاٹ دی:

"اے بیٹا۔ انتظام تو سب ہو جائے گا مگر یہ تو بتا کہ ابنِ حاتم کس لیے آرہے ہیں؟"

دروازے سے کان لگائے کھڑی نوحنا کے دل کی دھڑکن اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اس وقت گمنام کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی:

"خالہ جان۔ ہمارے سردار ابنِ حاتم اپنی شادی کی تاریخ طے کرنے آرہے ہیں۔ چار آدمی ان کے ساتھ ہوں گے۔ آخر کچھ مہمانداری تو کرنا ہی ہوگی"۔

خالہ اور خالو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور نوحنا کے سوکھے چمن میں تو جیسے بہار آگئی۔ خوشی کے مارے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔

گمنام کی آواز دوبارہ ابھری۔ وہ بڑے اعتماد سے کہہ رہا تھا:

"خالہ جان۔ ایک بات اور کہی ہے ابنِ حاتم نے ــــ"

"ہاں ہاں کہو بیٹے۔" بڑی بی خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔

گمنام نے بتایا:

"سردار ابنِ حاتم نے کہا ہے کہ وہ صرف شادی کی تاریخ ہی طے نہیں کریں گے بلکہ منگنی کی رسم ادا کر کے بات کو بالکل پکا کر دیں گے۔"

مثل مشہور ہے کہ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں!

سو شادی کی تاریخ اور منگنی کے نام ہی سے نوحنا اپنی جگہ اور اس کے والدین اپنی جگہ خوش ہو گئے۔

حالانکہ منگنی کی بات تو بہت پہلے ہو چکی تھی۔

منگنی دراصل "مانگنا" سے بنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکے والے لڑکی کو دیکھیں یا اسے پسند کریں اور اعلان کریں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے فلاں شخص کی بیٹی مانگی ہے۔

اسی طرح لڑکی والے، لڑکے کو دیکھیں، پسند کریں اور پھر اعلان کر دیں کہ انہوں نے فلاں فلاں کے لڑکے کو اپنی دامادی کے لیے مانگ لیا۔ بس اللہ اللہ خیر صلّا۔ اسی قسم کی منگنی ابنِ حاتم اور نوحنا کے والدین میں ان دونوں کے بچپن میں ہو گئی تھی۔

مگر سب جانتے ہیں کہ "منگنی" کی حیثیت نہ تو قانونی ہوتی ہے اور نہ مذہبی۔ اسے تو بس ایک اخلاقی فرض کہا جا سکتا ہے جسے لڑکی اور لڑکے کے والدین خود اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

نوحنا پہلے بھی ابنِ حاتم کی منگیتر تھی مگر اب ابنِ حاتم کے قاصد گمنام نے شادی کی تاریخ اور منگنی کو نوحنا کے والدین کے سامنے اس انداز سے پیش کیا تھا کہ وہ ایک نئی چیز بن گئی تھی بلکہ نوحنا اور اس کے والدین کو یقین ہو گیا تھا کہ ابنِ حاتم شادی کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔

گمنام یہ پیغام دے کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی نوحنا نے سب سے پہلے اپنی سہیلی کو بلا کر اسے خوش خبری سنائی کہ آج شام اس کی ابنِ حاتم کے ساتھ منگنی ہو رہی ہے۔

نوحنا نے تو ایک سہیلی کو اطلاع دی تھی مگر تھوڑی دیر میں اس کی تمام سہیلیوں تک یہ خبر پہنچ گئی اور اس کی سکھی سہیلیوں کا اس کے گھر تانتا بندھ گیا۔

دوسری طرف نوحنا کی والدہ نے چارپائی پر کھڑے ہو کر دیوار کے اُس پار ہمسائی کو خبر پہنچائی:

"اے سنتی ہو بہن ــــ"

اور بہن ہمسائی آواز سن کے فوراً دیوار کے پاس آ گئی۔

نوحنا کی ماں نے تعزیباً ہانپتے ہوئے کہا:

"اے بہن۔ آج ــ آج شام نوحنا کی منگنی ہے۔ تمہیں ضرور شریک ہونا ہے"۔

"اللہ مبارک کرے۔ اللہ مبارک کرے"۔ بی ہمسائی نے دو بار دعا دے کر اپنی کمالِ خوشی اور بے انتہا خلوص کا ثبوت دیا:

"میں ضرور آؤں گی بہن۔ نوحنا میری بیٹی ہے۔ میں آؤں گی۔ تمام بچوں کو بھی لاؤں گی"۔

نوحنا کی ماں چونکیں۔ انہوں نے نیوتا (بلاوا) صرف بی ہمسائی کو دیا تھا اور وہ معہ تمام بچوں کے وارد ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ اگر اس طرح پورے محلہ کی عورتیں معہ اپنے بچوں کے آن پہنچیں تو ان کے چھوٹے سے گھر میں تِل دھرنے کی جگہ نہ بچتی۔

احتیاط کے طور پر انہوں نے ڈرتے ڈرتے بی ہمسائی کو جتلایا:

"اے بہن! یہ تو منگنی ہے۔ لڑکے کے ساتھ چار آدمی آئیں گے اور سادگی سے منگنی کی رسم ادا ہو جائے گی پھر شادی پر میں انشاء اللہ خوب دھوم دھڑکا کروں گی۔ ایک ہی اولاد تو ہے میرے۔ نوحنا کے علاوہ اور کون بیٹھا ہے میرا۔ اس شان سے شادی ہو گی میری بیٹی کی کہ پورا محلہ دیکھتا رہ جائے گا"۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں بہن!" بی ہمسائی نے ہاں میں ہاں ملائی مگر ایک بات اور بھی کہہ دی۔ اس نے کہا: "شادی بیاہ ہی میں ماں باپ کے دل کے ارمان نکلتے ہیں۔ پھر تمہارے تو ایک ہی بیٹی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو منگنی پر بھی کرنا ہی پڑے گا"۔

نوحنا کی ماں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے تو ہمسائی کو سادگی کا درس دیا تھا مگر بی ہمسائی ایسی چالاک نکلی کہ اس نے سادگی کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیں۔ اور نوحنا کی والدہ کو آخر کہنا ہی پڑا:

"ٹھیک کہتی ہو بہن۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا"۔

اب انہیں بی ہمسائی کو اطلاع دینے کا افسوس ہو رہا تھا۔

بی ہمسائی رخصت کر کے واپس پہنچی ہی تھیں کہ محلے کی عورتوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد دوسری۔ دوسری کے بعد تیسری۔ جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلی آ رہی ہے اور نوحنا کی ماں سے مبارک باد دیتے نہیں بن رہی تھیں۔

ادھر نوحنا کی سہیلیوں نے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ جو سہیلی آتی اس کے ایک ہاتھ میں ڈھولک اور دوسرے

میں جھانجھر ہوتی اور وہ گھر میں داخل ہوتے ہی جھانجھر اور ڈفلی کے تال میل سے راگ بکھیرنا شروع کر دیتی۔

دوپہر ہوتے ہوتے تو یہ حال ہُوا کہ نوحنا کے والد کو گھر کے باہر عورتوں اور لڑکیوں کے بیٹھنے کا انتظام کرنا پڑا۔

نوحنا کے گھر عورتوں کا آنا تو کچھ ہو گیا مگر جو صبح کو آئیں تو انہوں نے وہیں شام کر دی۔ دن بھر جھانجھر جھنکتی اور ڈفلی بجتی رہی۔ سہیلیوں ہی نے دوپہر کا کھانا پکایا۔ پھر انہوں نے نوحنا کو دلہن بنانا شروع کیا۔ گمنام کہہ گیا تھا کہ شام کو صرف چار آدمی منگنی کے لیے آئیں گے۔

پس شام ہوئی تو ابنِ حاتم معہ اپنے چاروں ساتھیوں کے آ گیا۔ نوحنا کے والد نے بھی محلہ کے دو چار آدمیوں کو بلوا لیا تھا۔ عورتوں کو بلانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ بن بُلائے خود ہی آ موجود ہوئی تھیں۔

منگنی میں ہونا ہی کیا تھا! ابنِ حاتم کی انگلی میں ماں کا دیا ہُوا چاندی کا ایک چھلا پڑا ہُوا تھا۔ وہ اس نے یہ کہہ کے اندر بھجوا دیا کہ یہ ماں کی نشانی ہے۔ اسے نوحنا کی انگلی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

نوحنا کی ماں نے ابنِ حاتم کے لیے ایک رومال بھجوایا۔ اس کے بعد ایک بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور نوحنا اور ابنِ حاتم کی زندگی کے لیے دعائیں مانگیں۔

پھر مختصر سا کھانا ہوا۔

دعوت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا مگر محلہ کی عورتوں نے نوحنا کی ماں سے کہہ کہہ کے آخر کھانا پکوا ہی لیا۔ محلہ کی عورتیں تو ثرید کی فرمائش کر رہی تھیں مگر نوحنا نے ماں کو منع کر دیا۔

ثرید کی دعوت عرب کے اونچے گھرانوں میں ہوتی تھی۔ شوربے میں روٹیاں توڑ کے ڈالی جاتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ثرید بہت قیمتی اور لذیذ غذا ہے۔ اس کا ذکر کلامِ پاک میں بھی ہے۔

رات گئے تک عورتیں گھر میں بھری رہیں۔

جب نوحنا کی سہیلیاں اور ہمسائیاں رخصت ہو گئیں تو ابنِ حاتم اور اس کے ساتھیوں کو اندر بلا لیا گیا۔

نوحنا کی ماں نے شوہر کو سمجھا دیا تھا کہ وہ شادی کی تاریخ کی گفت گو کریں گے۔ ان کو یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ شادی کی تاریخ جلدی کی طے کی جائے۔ تاریخ سے مطلب یہ تھا کہ شادی کا مہینہ طے کر لیا جائے۔ دن اور تاریخ خود عورتیں مقرر کر لیں گی۔

نوحنا کے والد کو ان معاملات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ نوحنا ان کی اکیلی اولاد تھی۔ ان کی یہ مشکل بھی گمنام نے آسان کر دی۔

ابنِ حاتم اور اس کے ساتھی آ کے بیٹھے تو نوحنا کے والد نے گمنام سے کہا:

"اللہ نے منگنی کا کام تو بخیر و خوبی پورا کر دیا۔ اللہ خیر کرے شادی بھی اسی طرح انجام پائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ شادی کے لیے کونسا مہینہ بہتر رہے گا؟"

گمنام اور ابنِ حاتم وغیرہ نے اس سلسلے میں پہلے ہی سب کچھ طے کر لیا تھا اور اس سلسلے میں گمنام کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا۔

اتفاق سے نوحنا کے والد نے گمنام ہی کو مخاطب کیا تھا' چنانچہ گمنام کو جو پٹی پڑھائی گئی تھی وہ اس نے پڑھنا شروع کر دی۔

اس نے بڑے مؤدب طریقے سے کہا:

"خالو جان منگنی ہو گئی تو بس سمجھیے کہ شادی ہو گئی۔"

"یہ بات تو ہے بیٹے لیکن شادی۔ تاریخ تو ---"

خالو جان کہتے ہوتے جھجکے مگر گمنام نے جملہ پورا کر دیا:

"تو پھر شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔" اس نے اک دم کہہ دیا۔

خالو جان خوش ہو گئے۔ بولے:

"کونسی تاریخ مقرر کی ہے تم نے؟"

"دن تاریخ تو صحیح معلوم نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ سردار ابنِ حاتم اور میری شادی ایک ہی تاریخ کو ہو گی۔ کیوں سردار۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

ابنِ حاتم کیا جواب دیتا۔ گمنام اور اس کے درمیان تو بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ پھر بھی اُسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ پس اس نے کہا:

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ خالو جان کو بھی اعتراض نہ ہو گا۔"

"ہاں ہاں مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ---" خالو جان گھبرا گئے۔ "مگر --- مگر ---"

"آپ چپ ہو جائیے نوحنا کے ابا۔" بڑی بی کڑک دار آواز میں بولیں: "میں بات کرتی ہوں ان سے۔"

وہ اٹھیں اور جا کے ابنِ حاتم کے [illegible] بیٹھ گئیں۔

"ہاں بیٹے ابنِ حاتم۔ مجھے بتاؤ یہ تمہارے ساتھی کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔ صاف کیوں نہیں بتاتے کہ شادی کرنا ہے تمہیں --- یا نہیں کرنا ہے؟"

اب ابنِ حاتم پریشان ہو گیا۔ جلدی سے بولا:

"کیا فرما رہی ہیں خالہ جان۔ نوحنا میری ہے اور میری ہو گی۔ آپ کو باہر کا کچھ پتہ نہیں۔ قریشِ مکہ

پھر مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں!"

"ہائے اللہ۔ خدا خیر کرے ـــ اب کیا ہوگا!" بڑی بی کو پسینے آ گئے۔

ابنِ حاتم کے خالو بھی گھبرا گئے۔ گمنام نے دخل دیا اور فضا فوراً بدل گئی۔

"خالو جان۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔ ہم مجاہدوں کی شادیاں فتح و شکست سے بندھی ہوتی ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ خدا ہمیں مشرکوں پہ فتح دے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جس دن مسلمانوں نے مکہ پہ قبضہ کر لیا اس دن ہم دونوں بھائی یعنی میں اور میرے سردار ابنِ حاتم دولہا بنیں گے۔ کہیے خالو جان۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی یا نہیں؟"

وہ بے چارے کیا جواب دیتے۔ وہ کبھی گمنام کو اور کبھی ابنِ حاتم کو دیکھ رہے تھے۔ گمنام نے انہیں نظر انداز کر کے بڑی بی کو مخاطب کیا:

"خالہ جان۔ آپ کو شادی کی تاریخ معلوم ہوگئی نا!"

"ہاں۔ معلوم ہوگئی!" بڑی بی بوکھلائے انداز میں بولیں: "جنگ۔ پھر فتح۔ پھر شادی!"

"بالکل ٹھیک خالہ جان۔ آپ بالکل صحیح سمجھیں!"

گمنام ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوگیا: "اب ہمیں اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیجیے۔ بڑے سردار ہمیں یاد کر رہے ہوں گے۔ کیا پتہ کس وقت ہمیں محاذ پر جانا پڑے"۔

"اچھا بیٹے۔ خدا حافظ"۔ بڑی بی نے افسردگی سے کہا "فی امان اللہ!"

"خالہ جان۔ مکہ فتح ہونے کی دعا کیجیے" گمنام نے ہنس کے کہا۔

پھر وہ سب ایک ایک کر کے خالہ خالو سے رخصت ہوئے۔ ابنِ حاتم نے ذرا دیر کے لیے نوحنا سے گفتگو کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔

وہ جلدی سے اندر گیا۔

نوحنا چند سہیلیوں کے ساتھ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ سہیلیاں ابنِ حاتم کو آتا دیکھ کر ایک طرف ہوگئیں۔

نوحنا کے قریب پہنچ کر ابنِ حاتم نے کہا:

"اچھا نوحنا۔ اب مجھے رخصت کرو"۔

نوحنا کو کچھ معلوم نہ تھا کہ باہر ان لوگوں میں کیا باتیں ہوئیں اور کیا طے ہوا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے ابنِ حاتم کو دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"اب کب آؤ گے ابنِ حاتم!"

بڑی آرزوئیں اور بڑا کرب تھا ان پانچ لفظوں میں!

ابنِ حاتم کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی نظروں سے گر گیا تھا۔

گمنام کے کہنے اور سمجھانے پر اس نے نوحنا کے والدین سے جھوٹ بولا تھا۔ انہیں دھوکا دیا تھا۔ یہ غلط تھا کہ مشرکین مکہ، مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ بات تو گمنام نے نوحنا کے والدین کو مطمئن کرنے کے لیے کہی تھی تاکہ وہ فوری شادی کا تقاضہ نہ کریں۔

بات کہی گمنام نے تھی مگر شرمندہ وہ تھا کیونکہ وہ خود بھی اس جرم میں شریک تھا۔ گمنام کے اس پُر فریب بہانے کے اظہار میں ابنِ حاتم خود بھی شریک تھا۔

وہ بڑی مشکل سے نوحنا سے آنکھیں ملا سکا۔

نوحنا کی آنکھوں میں امنگوں، آرزوؤں اور محبتوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور ابنِ حاتم کی آنکھیں شرمندگی کے نم سے بوجھل تھیں۔ چنانچہ اس کی نظریں جلدی سے جھک گئیں۔

اس نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا:

"نوحنا۔ ہم جلد ملیں گے۔ فتح مکہ کی دعا کرو"۔

نوحنا کچھ نہ سمجھ سکی۔ کچھ سمجھی تو بس یہی کہ شاید یہ بھی محبت کا اک انداز ہے۔

"اچھا خدا حافظ۔ میں دعا کروں گی"۔

ابنِ حاتم بغیر اس سے آنکھیں ملائے باہر آ گیا اور نوحنا کو اس کی سہیلیوں نے پھر گھیر لیا۔





ابنِ حاتم کی شرمندگی اپنی جگہ درست تھی۔

گمنام نے اسے منگنی کا مشورہ دیا تو اس نے مان لیا مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر نوحنا کے والدین نے شادی کی تاریخ مقرر کرنے پر زور دیا تو کیا کریں گے؟

اس وقت گمنام نے یہ تجویز پیش کی کہ شادی کی تقریب کو ایک دو سال کے لیے ٹال دیا جائے، ممکن ہے کہ اس وقت تک مسلمان اتنی طاقت حاصل کر لیں کہ وہ سر اٹھا کے چل سکیں اور یہی ابنِ حاتم کی قسم تھی۔

پس گمنام نے ابنِ حاتم کو مصلحت سے کام لینے کا مشورہ دیا اور شادی کو "فتح مکہ" سے منسلک کر دیا۔

یہاں تک تو خیر غنیمت تھا لیکن گمنام کا یہ کہنا بالکل غلط تھا کہ مشرکینِ مکہ مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور قطعاً
کتاب کا مصنف شیطان ہے صحابہ کرام کی طرف جھوٹ کی نسبت کرتا
اس بات کا کوئی امکان نہ تھا۔

مشرکینِ مکہ تو اپنے جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے۔ عرب قبائل کے لوگ تیزی سے اسلام قبول کر رہے تھے اور جو اسلام قبول کرتا سیدھا مدینہ منورہ کا رخ کرتا۔

معاہدۂ حدیبیہ کی وہ شرط جس میں یہ تھا کہ مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جانے والے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مکہ بھیج دیں گے، خود مشرکین کے کہنے پر منسوخ کر دی گئی تھی۔ اس لیے اب تو جو مسلمان ہو گیا وہ ہو گیا۔ مشرکینِ مکہ نہ تو اسے سزا دے سکتے تھے۔ نہ گرفتار کر سکتے تھے اور نہ کسی اور طریقہ سے مدینہ جانے سے روک سکتے تھے۔

پس گمنام کا یہ کہنا کہ مکہ والے مدینہ پر حملے کے لیے پر تول رہے ہیں بالکل بے بنیاد تھا۔ یہ بات اس کے لیے گمنام نے نہ تو ابنِ حاتم سے مشورہ کیا تھا اور نہ کسی دوسرے ساتھی کو بتایا تھا۔ یہ بات خالص اس کی اپنی اختراع تھی مگر یہ ایک ایسا خوبصورت بہانہ تھا جس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نوحنا کے والدین تو اس پر فوراً ہی ایمان لے آئے تھے اور انہوں نے اسی وقت سے فتح مکہ کی دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں۔

بعض اتفاقات بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔

گمنام کی وہ بات جس کا سر تھا نہ پیر۔ جس کی وجہ سے ابنِ حاتم خود اپنے آپ سے شرمندہ ہو گیا تھا، وہی اب حقیقت بنتے دکھائی دینے لگی۔

مکہ اور مدینہ والوں میں جنگ کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا مگر اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ عرب کی فضاؤں پر اچانک جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔

قصہ یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائلِ عرب کو یہ آزادی تھی کہ وہ چاہے قریشِ مکہ جن کا سردارِ اعلیٰ ابوسفیان تھا، کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کریں اور چاہیں تو مدینہ کی اسلامی ریاست جس کے سربراہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، کے حلیف اور دوست بن جائیں۔

عرب قبائل میں گروہ بندی کی رسم بہت پرانی تھی۔ دراصل ان کی جنگجویانہ سرشت اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ ہر قبیلہ کا سردار یہ چاہتا تھا کہ دوسرے قبائل اس کے حلیف اور دوست بن جائیں تاکہ اگر جنگ چھڑ جائے تو حلیف قبائل اس کا ساتھ دیں۔

جہاں تک عرب قبائل میں جنگ ہونے کا تعلق تھا تو وہ ہر وقت تیار رہتی تھی بلکہ خانہ جنگی تو ان کے خمیر میں داخل تھی۔

عربوں کے دو قبیلے جن کے نام بنو بکر اور بنو خزاعہ تھے، عہدِ قدیم سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آ رہے تھے۔ ان کے درمیان ہر وقت ٹھنی رہتی تھی۔

جب صلح نامہ حدیبیہ ہوا تو عرب قبائل دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ زیادہ قبائل ابوسفیان کے حلیف ہو گئے اور کچھ نے، جن کی نظریں مستقبل پر تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کیا اور مسلمانوں کا حلیف ہونے کا اعلان کر دیا۔

قبیلہ بنو بکر کی حال پر نظر تھی۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ ابوسفیان کا رعب و دبدبہ اور جنگی قوت مدینہ کی ابھرتی ہوئی اسلامی ریاست سے زیادہ ہے، ابوسفیان سے اتحاد کر لیا اور قریشِ مکہ کا حلیف ہو گیا۔

بنو بکر کے مخالف قبیلہ بنو خزاعہ کو جب معلوم ہوا کہ اس کے دشمن نے ابوسفیان سے دوستی کا معاہدہ کرلیا ہے تو اس نے فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رخ کیا اور مسلمانوں کا اتحادی ہو گیا۔

بنو خزاعہ کا مسلمانوں کا حلیف ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بنو خزاعہ کا سردار عمرو بن سالم خزاعی اپنے دشمن سے زیادہ عقلمند تھا۔ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مدینہ سے ابھرنے والی نئی اسلامی طاقت مستقبل قریب میں پورے عرب پر چھا جائے گی۔ اس خیال نے بھی اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔

عرب اپنے معاہدوں کا بہت پاس کرتے تھے۔ کسی سے دوستی کا معاہدہ کرنے کے بعد وہ اس بات کے پابند ہوتے تھے کہ اگر دوست قبیلہ پر کوئی حملہ کرے یا اس کی کسی سے جنگ شروع ہو جائے تو اس کی دامے، درمے، سخنے مدد کریں۔

پھر ایسا ہوا کہ صلح حدیبیہ کو دو ہی سال کا قلیل عرصہ گزرا تھا کہ بنو خزاعہ اور بنو بکر کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

اس جنگ کا آغاز بنو بکر کی طرف سے ہوا۔

دراصل یہ ان کی زیادتی تھی کیونکہ انہوں نے بنو خزاعہ پر شب خون مارا تھا۔ بنو خزاعہ "چشمہ وتیر" پہ مقیم تھے کہ ایک شب بنو بکر نے انہیں غافل اور سویا ہوا دیکھ کر شب خون مار دیا۔

شب خون مارنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بنو بکر قبیلہ کے سردار نوفل بن معاویہ دیلی کو یہ زعم تھا کہ اس کے حلیف قریش کے تمام بڑے بڑے سردار ہیں جن میں عکرمہ بن ابوجہل، سہیل بن عمرو اور صفوان بن امیہ جیسے بڑے قریش سردار بھی تھے۔

شب خون کا یہ واقعہ ۸ھ ہجری میں پیش آیا۔

بنو خزاعہ چونکہ محوِ خواب تھے اس لیے غفلت میں مارے گئے اور اپنی مدافعت نہ کر سکے۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا، بس وہ وہاں سے بھاگ کر سیدھے خانہ کعبہ میں گھس آئے۔

خانہ کعبہ ہمیشہ سے دارالامن رہا ہے۔ وہاں خون بہانا منع ہے اور وہاں پناہ لینے والے کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن ــــ بنو بکر کو قریش کے سرکردہ سرداروں کی دوستی کا زعم تھا اس لیے انہوں نے خانہ کعبہ کے احترام کے دستورِ ازلی کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور بنو خزاعہ کا تعاقب کرتے ہوئے حرم کے اندر گھس گئے اور وہاں انہوں نے بنو خزاعہ کے بیس آدمیوں کو ذبح کر ڈالا۔

بنو خزاعہ کے کچھ افراد نے بھاگ کے بدیل بن ورقہ اور رافع کے گھر میں پناہ لی اور اس وجہ سے قتل ہونے سے بچ گئے۔

بنو بکر نے اپنی اس بزدلانہ اور حماقت انگیز حرکت سے نہ صرف خانہ کعبہ کے احترام کو پامال کیا بلکہ معاہدۂ حدیبیہ کی بھی خلاف ورزی کی۔

انہیں معلوم تھا کہ بنو خزاعہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف ہیں اور بنو خزاعہ کی حمایت میں آپؐ ضرور کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے حلیف بنو خزاعہ کے ساتھ بنو بکر کی زیادتی اور خانۂ خدا میں خون بہانے کے حالات دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئے تو آپؐ کو بہت غم ہوا مگر آپؐ نے انتظار فرمایا کہ بنو خزاعہ کی طرف سے کوئی اطلاع آئے تو پھر کوئی قدم اٹھایا جائے۔

دوسرے ہی ہفتہ میں بنو خزاعہ کا سردار عمرو بن سالم خزاعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں فریادی بن کے آ گیا۔

اس نے الف سے لے کر ی تک تمام حالات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گوش گزار کیے۔ آپؐ اس کی داستانِ غم سن کر بہت متاثر ہوئے۔

آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عمرو! تمہاری مدد کی جائے گی!"

عمرو بن سالم اور اس کے دوسرے ساتھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ عالیہ سے بہت متاثر ہوئے ان کے دلوں کو تقویت ہوئی۔

انہی دنوں مکہ سے بدیل بن ورقہ ایک وفد کے ساتھ مدینہ پہنچا اور اس نے انکشاف کیا کہ:

"قریشِ مکہ نے ہی بنو بکر کو بنو خزاعہ پر شب خون مارنے کے لیے اکسایا اور درپردہ ان کی مدد بھی کی تھی۔

پھر جب بنو خزاعہ نے بھاگ کے خانہ کعبہ میں پناہ لی تو اگر قریشِ مکہ چاہتے تو انہیں قتل ہونے سے بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے جان بوجھ کر بنو بکر کو ڈھیل دی اور شہ دے کر خانۂ خدا میں

خونریزی کرائی؟

پس سپہ سالارِ اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ مکہ پہ چڑھائی کریں گے۔ آپؐ نے اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ قریشِ مکہ کے پاس ایک قاصد روانہ فرمایا۔ اسے ہدایت فرمائی کہ وہ قریشِ مکہ کے سامنے تین شرطیں رکھے اور کہے کہ ان میں سے ایک شرط منظور کریں۔

یہ شرائط مندرجہ ذیل تھیں:

۱۔ مقتولینِ بنوخزاعہ کا خون بہا ادا کیا جائے۔

۲۔ قریش، بنوبکر کی حمایت سے دست کش ہو جائیں۔

۳۔ معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیا جائے۔

قاصد نے مکہ پہنچ کے ابوسفیان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تینوں شرائط بیان کیں۔

ابوسفیان نے فوراً مجلسِ مشورت طلب کی۔ اس مجلس میں وہ قبائل شامل نہ ہوئے جو بنوخزاعہ کے خلاف بنوبکر کی درپردہ مدد کرنے پر سردارِ قریش سے سخت ناراض تھے۔

جتنے سردار وہاں جمع ہوئے ان کے سامنے قاصد نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرائط ایک بار پھر بیان کر دیں۔

شرائط سن کے سرداروں پر سناٹا چھا گیا اور کوئی نہ بولا۔ صرف قرطہ بن عمر نے کھڑے ہو کر کہا:

"قریشِ مکہ کی طرف سے یہ جواب لے جاؤ کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔"

تیسری شرط صلح نامہ حدیبیہ ختم کر دینے کی تھی یعنی قریشِ مکہ اور ریاستِ مدینہ کے درمیان امن کا معاہدہ منسوخ سمجھا جائے۔

اسلامی قاصد قرطہ بن عمر کو پہچانتا تھا۔ اس نے کڑک کر اسے ٹوکا:

"قرطہ بن عمر۔ تم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہو۔ مدینہ کے سردارِ اعلیٰ نے قریش کے سردار کو پیغام بھیجا ہے۔ اس کا جواب سردارِ قریش ہی دے سکتا ہے"۔

قاصد کے اس تلخ جواب کو سن کے قرطہ بن عمر بھڑک اٹھا اور تلوار کھینچ کر قاصد کی طرف بڑھا۔ اس پر ابوسفیان نے اسے ڈانٹا:

"خبردار قرطہ جو تم نے قاصد پہ ہاتھ اٹھایا۔"

قرطہ کے قدم رک گئے اور وہ چیخ کے بولا:

"سردار ابوسفیان! اس معمولی قاصد نے میری توہین کی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"قرطہ!"

ابوسفیان نے چیں بجبیں ہوتے ہوئے کہا:

"غلطی تمہاری ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں قاصد کو جواب دینے کا کوئی حق نہیں!"

قرطہ آنکھیں نکالتا ہوا اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

قاصد نے اپنی بات دہرائی:

"اے قریش کے سردارِ اعلیٰ! مدینہ کے سپہ سالار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کی ہیں، جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ آپ ان میں سے کسی ایک صورت کو منظور فرمائیے"۔

ابوسفیان نے افسردہ لہجے میں کہا:

"شرطیں پھر سے بیان کرو قاصد"۔

قاصد نے دوبارہ شرطیں بیان کیں:

"اے سردارِ قریش! پہلی شرط یہ ہے کہ بنوخزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ قریش، بنوبکر کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیں۔

تیسری اور آخری شرط یہ ہے کہ معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیا جائے"۔

ابوسفیان فکرمند ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کونسی شرط منظور کرے۔

پہلی شرط خون بہا ادا کرنے کی تھی۔ بیس خزاعی مارے گئے تھے۔ ان کا خون بہا بھی بہت زیادہ بنتا تھا۔ پھر سوال یہ تھا کہ خون بہا کون ادا کرے؟ خون تو بنوبکر نے بہایا تھا اور اس مجلس میں ان کا جو نمائندہ حاضر تھا اس نے صاف الفاظ میں ابوسفیان سے کہہ دیا تھا کہ اس کا قبیلہ نہ خون بہا ادا کر سکتا ہے اور نہ خون بہا تسلیم کرتا ہے۔

دوسری شرط میں قریش کو بنوبکر کا ساتھ چھوڑنا تھا۔ یہ بھی کسی طرح منظور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ بنوبکر قریش کا حلیف قبیلہ تھا اور کسی کو حلیف بنا کے اسے چھوڑنا عربوں کے رسم و رواج کے خلاف تھا۔

تیسری شرط پہلی دو شرطوں سے بھی زیادہ سخت تھی۔ اسے منظور کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مکہ اور مدینہ ایک بار پھر حالتِ جنگ میں آ جائیں۔

قاصدِ رسولؐ تنگ آ کے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

"اے سردارِ قریش! میں آپ کے جواب کا زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔"

اس نے تلخی سے کہا:

"مجھے واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ آپ کی یہ خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ آپ قرطہ بن عمر کے جواب

سے مطمئن ہیں۔ میں مدینہ جا کر سپہ سالارِ اعظم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ دوں گا کہ قریشِ مکہ نے صلح حدیبیہ کو توڑنا منظور کیا ہے"۔

ابوسفیان نے بڑی فکر مند نظروں سے اپنے سرداروں کو دیکھا پھر مضمحل لہجے میں ان سے دریافت کیا:

"اے قریشِ مکہ کے حلیفو! کیا تم قرظہ بن عمر کی رائے سے اتفاق کرتے ہو اور کیا معاہدۂ حدیبیہ کو ختم کر دینا چاہتے ہو؟"

"ہاں ہاں۔ ہمیں صلح نامہ حدیبیہ کو توڑنا منظور ہے"۔

یہ آواز اسی قرظہ بن عمر کی تھی جس نے پہلے بھی تیسری شرط منظور کرنے کا اعلان کیا تھا۔ قرظہ بن عمر کے علاوہ کسی اور سردار نے اس کی موافقت یا مخالفت میں کوئی آواز بلند نہ کی۔

آخر ابوسفیان کو اعلان کرنا پڑا:

"ہم تیسری شرط منظور کرتے ہوئے معاہدۂ حدیبیہ کی تنسیخ اور اس کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں۔ سردارِ مدینہ کو ہمارا یہی جواب ہے"۔

قاصدِ رسولؐ نے مزید کسی بات کا انتظار نہ کیا۔ وہ مجلس سے اٹھ کے باہر آیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مگر —

قاصد کے روانہ ہوتے ہی ابوسفیان کی مجلس کا رنگ بگڑ گیا اور جن زبانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے وہ جیسے ایک دم آزاد ہو گئیں۔

ایک قبیلہ کا سردار بولا:

"ہم نے صلح نامہ ختم کر کے اچھا نہیں کیا"۔

دوسرے قبیلے کے سردار نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"معاہدہ ختم کر کے ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے"۔

تیسرے قبیلے کے سردار کا لہجہ زیادہ تلخ تھا:

"سردار ابوسفیان، آپ نے صلح نامہ حدیبیہ کو توڑ کر ہمارے تجارتی راستوں کو بند کر دیا ہے۔ ہم اب ملک شام کو کوئی تجارتی قافلہ نہیں بھیج سکتے۔ وہ راستہ پھر غیر محفوظ ہو گیا ہے"۔

ایک اور سردار نے کہا:

"ہم نے بنو بکر کا ساتھ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے!"

ایک اور سردار نے خیال ظاہر کیا:

"بنو بکر کو خون بہا دے کر جان چھڑا لینی چاہیے تھی جنگ کو دعوت دینا کوئی عقلمندی نہیں"۔

ابوسفیان جھنجلا گیا۔

"اب سب کے سب اعتراض کر رہے ہیں"۔

اس نے غصہ سے سرخ ہو کے کہا:

"قاصد کے سامنے سب منہ بند کیے بیٹھے رہے۔ معاہدۂ حدیبیہ تو اب ٹوٹ چکا۔ اس کے نتیجے کا انتظار کرو"۔

"نتیجہ تو صاف ظاہر ہے"۔

ایک قدرے عقلمند قریش نے تبصرہ کیا:

"مدینہ والے ہم پر حملہ کریں گے اور تمام اگلے پچھلے بدلے لیں گے۔ ہم نے معاہدہ دس سال کے لیے کیا تھا تاکہ اپنے حالات درست کریں۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ معاہدہ دو سال بعد ہی ٹوٹ گیا"۔

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" ایک سردار نے سوال کیا۔

"کرنا کیا ہے؟"

ابوسفیان نے جواب دیا:

"جنگ کی تیاری کرو۔ مسلمان مکہ پر حملہ ضرور کریں گے"۔

"نہیں سردار۔ ہم اس وقت جنگ نہیں کر سکتے"۔

ایک سردار نے کہا:

"آپ معاہدہ کو مت توڑیے"۔

"معاہدہ تو ٹوٹ چکا"۔

ابوسفیان نے افسردگی سے کہا:

"مدینہ کا قاصد واپس جا چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا"۔

"یہ بہت برا ہوا سردار"۔

اسی سردار نے کہا:

"آپ حالات کو سنبھالنے کی کوشش تو کیجیے۔ آپ خود مدینہ جائیے اور معاہدہ کو منسوخ ہونے سے بچائیے!"

"ہاں ہاں سردار۔ آپ خود مدینہ جائیے"۔

ایک اور سردار نے کہا:

"ابھی تازہ تازہ بات ہے۔ آپ مدینہ جا کے بات کریں گے تو معاملات ٹھیک ہو جائیں گے"۔

گفت گو طول کھینچتی گئی۔ صبح سے شام ہو گئی مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ابوسفیان نے مجلس برخاست کرتے ہوئے اعلان کیا:

"یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ آپ لوگ اس پر خوب غور کیجیے۔ کل پھر اس سلسلے میں بات ہو گی اور کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے گا"۔

ایک روایت کے مطابق قرطر بن عمر کو لوگوں نے بڑی لعنت ملامت کی کہ اس نے ایک غلط بات کہہ کر صلح نامہ حدیبیہ منسوخ کرا دیا۔

دوسرے دن کی مجلس میں زیادہ دیر گفت گو نہ ہوئی۔ ہر سردار اپنی جگہ جیسے سہما ہوا تھا۔ ابوسفیان نے ان کی رائے مانگی تو تمام سرداروں کی ایک ہی رائے تھی کہ:

"صلح حدیبیہ کو ٹوٹنے نہ دیا جائے!"

اس سلسلے میں نہ کسی نے کوئی سبب بیان کیا اور نہ ابوسفیان نے کسی سے سبب وجواز دریافت کیا۔ سب کے دلوں میں ایک چور سا بیٹھا تھا اور وہ چور تھا مدینہ کی ابھرتی ہوئی اسلامی ریاست کا۔

یہ فیصلہ بھی ہوا کہ خود قریش سردار ابوسفیان مدینہ جائے اور اس بگڑی ہوئی بات کو سنوار کر آئے۔ بلکہ صلح حدیبیہ کی تجدید کر کے لوٹے۔

مدینہ میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد واپس پہنچ چکا تھا۔ اس نے آنحضرتؐ کو صاف الفاظ میں بیان کر دیا تھا کہ مشرکینِ مکہ نے تیسری شرط یعنی صلح نامہ حدیبیہ منسوخ کرنا منظور کیا ہے۔

اس اطلاع سے رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکون حاصل ہوا۔ مدینہ کے انصار اور خصوصیت سے مہاجرین ایک عرصہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقاضا کر رہے تھے کہ انہیں کسی صورت مکہ کی زیارت کی اجازت بلکہ عام اجازت دی جائے۔

مکہ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے پیدائش بھی تھی۔ آپؐ بھی وہاں جانا چاہتے تھے اور مہاجرین کو

ھلے عام مکہ جانے کی اجازت دینے کے حق میں تھے لیکن صلح حدیبیہ نے آپؐ کو سیاسی اور اخلاقی طور پہ کوئی قدم ھانے سے روک دیا تھا مگر اب جبکہ مشرکین نے خود ہی صلح نامہ ختم کر دیا تھا تو پھر حضورؐ کے کسی اقدام پہ وئی پابندی نہ رہ گئی تھی۔

چنانچہ قاصد سے اطلاع پلتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درپردہ فوجی تیاری کا حکم دیدیا درخاص خاص صحابہ کرامؓ کو مطلع کر دیا کہ آپؐ بہت جلد مکہ پہ فوج کشی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مکہ پر فوج کشی اسلام کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے کیونکہ مکہ ہی دراصل اسلام کے فروغ کے لیے وہ عظیم منبع تھا جسے جاری کیے بغیر اسلام کی کرنیں عرب اور بیرونِ عرب نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

مکہ پہ فوج کشی کے دو اسباب بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ مذہبی

۲۔ سیاسی اور تجارتی

اس کا مختصر حال کچھ اس طرح ہے:

خانہ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ اسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی مدد سے تعمیر کیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کعبہ کی پہلی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی لیکن ان کے بعد امتدادِ زمانہ سے یہ نشان مٹ گیا تھا۔

پھر لاکھوں سال بعد جب حضرت ابراہیمؑ کو خانہ کعبہ تعمیر کرنے کا حکم ہوا تو جبریلؑ نے اس مقام کی نشاندہی کی جہاں پر اللہ کا یہ پہلا گھر تعمیر ہوا تھا۔ جبریلؑ کی نشاندہی اور پرانی بنیاد کو رہنما بنا کر حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیرِ نو کی تھی۔

مگر ــــ خدا کے اس پہلے گھر کو جسے اس ذاتِ واحد کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا، مشرکینِ مکہ نے ایک بت خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے اندر ۳۶۰ بت رکھے تھے اور یہاں ان بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔

چنانچہ جب تک ان بتوں سے خانۂ خدا کو پاک نہ کیا جاتا، اس وقت تک فروغِ دینِ اسلام ممکن نہ تھا۔

مکہ پہ فوج کشی کا دوسرا سبب اقتصادی اور تجارتی تھا۔

زمانۂ قدیم ہی سے مکہ عربوں کا مذہبی، سیاسی اور تجارتی مرکز تھا۔ مکہ کے قریب ہی "عکاظ" کا وہ میدان تھا جہاں عربوں کا سب سے بڑا تجارتی اور مذہبی میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں

عربوں کا ہر قبیلہ شریک ہونا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

چونکہ قریشِ مکہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے تمام قبائلِ عرب انہیں تکریم و تعظیم کی نظر سے دیکھتے اور اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے تھے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر عرب قبیلے کا اپنا ایک شاعر ہوتا تھا۔ یہ شاعر "عکاظ" کے میلے میں اپنے قبیلے کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر مکہ اور قریشِ مکہ کا انہیں اس قدر احترام ملحوظ ہوتا کہ ہر شاعر جب اپنے قبیلے کے کسی وصف اور خوبی کو بانس پہ چڑھا کے بیان کرتا تو پہلے یہ کہہ دیتا تھا کہ :

"سوائے قریش کے !"

یعنی قریش کے مقابلہ کا اور کوئی قبیلہ نہ تھا مگر طلوعِ اسلام، جنگِ بدر، اُحد اور خندق نے حالات تبدیل کر دیے اور سب سے بڑھ کر صلح حدیبیہ نے قریشِ مکہ کی مذہبی، سیاسی، تجارتی عظمت کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ عرب قبائل کی طاقت تقسیم ہو گئی تھی اور اب مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کو بھی ایک مذہبی اور سیاسی قوت حاصل ہو گئی تھی۔

چنانچہ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان مکہ پر قبضہ کر کے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کریں اور قریش کے مکہ میں مذہبی زعم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔

پھر وہ مہاجرین تھے جنہیں اپنے جائے پیدائش اور وطن کو چھوڑے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مکہ جائیں تو اب فاتحانہ جائیں۔

یہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر صلح حدیبیہ کے خاتمے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مکہ پہ فوج کشی کا فیصلہ کیا۔



جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مکہ اس کے حقیقی وارثوں کے ہاتھوں میں دیا جائے تو اس نے اس کے اسباب پیدا کر دیے جن میں سب سے بڑا سبب مشرکینِ مکہ کا صلح حدیبیہ کو توڑ دینا تھا۔

مشرکین کو اپنی غلطی کا احساس اسی دن ہو گیا تھا جس دن انہوں نے قاصدِ رسولؐ کو جواب دے کر واپس کر دیا تھا۔

قاصد کے واپس جاتے ہی ان میں خوب بحث و مباحثہ ہوا۔ پھر بات تُو تُو مَیں مَیں سے بڑھ کر نوکِ شمشیر تک پہنچ گئی۔

وہ تو کچھ سمجھدار لوگوں نے درمیان میں پڑ کر جھگڑا نمٹا دیا ورنہ ان میں خانہ جنگی شروع ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

مشرکینِ مکہ کا اختلاف اور جھگڑا اس طرح طے پایا تھا کہ مشرکین کے سردارِ اعلیٰ یعنی ابو سفیان کو خود مدینہ جانا چاہیے اور وہاں جا کر وہ سردارِ مدینہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کرے کہ جو جواب مدینہ بھجوایا گیا ہے یعنی "صلح نامہ کی تنسیخ" تو اسے غلط سمجھا جائے اور اس کے بجائے پہلی شرط قابلِ قبول سمجھی جائے۔

قریش کے سرداروں نے ابو سفیان سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ اس صلح کی از سرِ نو "تجدید" کر آئے تاکہ آئندہ کوئی بکھیڑا نہ شروع ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی ابو سفیان بنی عدد خزاعی مقتولین کا خون بہا ادا کرنے کا پکا وعدہ کر کے آئے۔

پس ابوسفیان اپنی غلطی تسلیم کرنے اور تجدیدِ معاہدہ کی آرزو لے کر بھاگم بھاگ مدینہ پہنچا مگر وہاں یہ بات پوری طرح مشہور ہو چکی تھی کہ مشرکینِ مکہ نے صلح نامہ حدیبیہ کو منسوخ کر دیا ہے اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کے اس جواب کا اعلان مسجدِ نبوی میں کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سردارانِ فوج کو خفیہ طور پر جنگی تیاریاں شروع کرنے کا حکم بھی دے دیا گیا تھا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ابوسفیان کا سامنا سرِ راہ ہوا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور بغیر کسی تمہید کے کہا:

"اے محمد! ہم نے آپؐ کے قاصد کے ہاتھ یہ جواب دیا تھا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے یعنی یہ کہ صلح نامہ حدیبیہ توڑ دیا جائے لیکن ہمارا وہ جواب غلط تھا۔ اس لیے میں استدعا کرتا ہوں کہ اسے درست سمجھا جائے۔ میں اس سلسلے میں صلح حدیبیہ کی تجدید کرنے خود آیا ہوں"۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کی بات پوری توجہ سے سنی مگر اس کی استدعا پر آپؐ نے نہ کوئی تاثر ظاہر کیا اور نہ کوئی منفی یا مثبت جواب دیا۔

ابوسفیان، جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ دوبارہ حضورؐ کو روک کر مزید کوئی بات کرتا۔

ابوسفیان کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر لوگوں سے حضرت ابوبکرؓ کے مکان کا پتہ پوچھا اور ان کے پاس پہنچ کر کہا:

"آپ، جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ کے صلح حدیبیہ کی تجدید کرا دیں"۔

حضرت ابوبکرؓ نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

"میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا"۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے ملاقات کی اور ان سے بھی یہی درخواست کی جنابِ عمرؓ نے بھی اسے نفی میں جواب دیا۔

پھر وہ جنابِ علی مرتضیٰؓ کے پاس آیا اور ان سے بھی یہی استدعا کی۔ جنابِ علی مرتضیٰؓ نے اسے سمجھاتے ہوئے فرمایا:

"اے ابوسفیان! تم قاصد کے ذریعے بھیجے ہوئے اپنے پیغام کو تسلیم کرتے ہو۔ اب یہ چاہتے ہو کہ اسے غلط سمجھنے کے لیے میں تمہاری سفارش کروں۔
کسی غلط کام کے لیے سفارش ہمارے مذہب میں یوں بھی جائز نہیں۔ پھر یہ تو ایک سیاسی اور فوجی مسئلہ ہے اور سوائے سپہ سالارِ لشکرِ اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی اور کے ٹال دینے یا سفارش کرنے کی ہمت نہیں!"

ابوسفیان، حضراتِ ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ سے صاف جواب پانے کے بعد سیدھا مسجدِ نبویؐ میں پہنچا اور وہاں موجود یا ناموجود لوگوں کے سامنے "تجدیدِ معاہدہ" کا اعلان کر کے مکہ واپس چلا گیا۔

ابوسفیان کے جاتے ہی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ مدینہ کو جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا مگر ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ اس کی خبر مکہ والوں کو نہ ہونے پائے۔

جب مسلمان کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی حاطبؓ بن ابی بلتعہ مہاجر مکی نے اپنی ایک کنیز سارہ کو بلا کر ایک خط دیا اور کہا:

"سارہ! اس خط کو اپنے کپڑوں میں چھپا لے اور فوراً مکہ روانہ ہو جا——"

"آقا۔ آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں"۔

سارہ نے اپنے آقا کی بات کاٹ دی:

"میں جانتی ہوں یہ خط کسے پہنچانا ہے!"

حاطبؓ کنیز کی بات پر چونکے اور پوچھا:

"تو کس کو خط پہنچائے گی؟"

"واہ آقا!"

سارہ نے ہنستے ہوئے کہا:

"کیا مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے بیوی بچے مکہ میں ہیں"۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے بیوی بچے مکہ میں ہیں سارہ!"

حاطب نے ایک آہ بھر کر کہا:

"مگر یہ خط میں انہیں نہیں بھیج رہا ہوں"۔

"پھر کسے بھیج رہے ہیں یہ خط؟" کنیز نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ خط تجھے قریشِ مکہ کے سردار ابوسفیان کو پہنچانا ہے سارہ!"

"سردار ابو سفیان کو ــــ ؟"
کنیز کی حیرت دو چند ہو گئی:
"مگر کیوں ؟"
"تو پوچھنے والی کون ہوتی ہے ؟"
حاطبؓ نے اسے جھڑک دیا:
"تجھے جو کہا ہے وہ کر"۔
"میرے آقا۔ آپ مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں"
سارہ نے پُرسکون لہجے میں ادب سے کہا:
"پھر اس کافر کو آپ خط کیوں بھیج رہے ہیں ؟"
"تجھے معلوم تو ہے کہ میرے اہل و عیال وہاں ہیں"۔
حاطبؓ نے قدرے غم ناک لہجے میں کہا:
"میرے بیوی بچے بہت تکلیف میں ہیں۔ میں ان کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں"۔
"مگر میرے آقا ــــ"
"چپ ہو جا!"
کنیز کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ حاطبؓ نے اسے ڈانٹ دیا:
"کنیز کا کام اپنے آقا کی بات ماننا اور حکم بجالانا ہے۔ اسے بحث نہ کرنا چاہیے"۔
سارہ ڈانٹ کھا کے خاموش ہو رہی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور لانبے کرتے کی اندر کی جیب میں اپنے آقا کا خط رکھ کر مکہ کی طرف چل پڑی۔
سارہ کے مدینہ سے روانہ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخبری ہوئی کہ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کی کنیز سارہ ان کا ایک اہم خط لے کر مکہ جا رہی ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت زبیرؓ بن عوام اور جناب علی مرتضیٰؓ کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ:
"فوراً مکہ روانہ ہو جاؤ اور حاطبؓ کی کنیز سارہ جہاں ملے اس سے وہ خط حاصل کرو جو وہ مکہ لے کر جا رہی ہے"۔
جناب علی مرتضیٰؓ اور زبیرؓ بن عوام، ارشاد نبوی کے مطابق اسی وقت سوار ہوئے اور مکہ جانے والے راستے پر گھوڑے سرپٹ چھوڑ دیے۔
سارہ کو مکہ پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی اس لیے وہ ایک قافلہ کے ساتھ آہستہ آہستہ سفر کر رہی تھی۔
جناب علی مرتضیٰؓ اور زبیرؓ بن عوام جلد سے جلد سارہ کے پاس پہنچ کر اس سے خط حاصل کرنے کے متمنی تھے اس لیے ان کے گھوڑے تیز رفتاری سے بھاگ رہے تھے۔
آخر، روضہ خاخ کے مقام پر سارہ، تعاقب کرنے والوں کو مل گئی۔ سارہ، حضرت علی مرتضیٰؓ کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ چوری پکڑی گئی۔
جناب علی مرتضیٰؓ نے سارہ کو قافلہ سے الگ بلا کر پوچھا:
"وہ خط کہاں ہے جسے تم مکہ لے کر جا رہی ہو؟"
سارہ نے کوئی مزاحمت نہ کی اور خط نکال کر جناب علی مرتضیٰؓ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے خط سنبھال کے جیب میں رکھ لیا۔
جناب علی مرتضیٰؓ اور زبیرؓ بن عوام نے سارہ سے برآمد کیا ہوا خط مدینہ پہنچ کے آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔
حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے اس خط میں ابو سفیان کو مطلع کیا تھا کہ مدینہ سے ایک بڑا لشکر تسخیر مکہ کے لیے جلد روانہ ہونے والا ہے۔
نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاطبؓ کو بلا کر ان سے جواب طلب فرمایا۔
حاطبؓ نے دربار نبوی میں جواب عرض کیا مگر اس انداز سے کہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔
انہوں نے کہا:
اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ میرے دل کا حال ضرور جانتے ہوں گے۔ میرے بیوی بچے ابو سفیان کی قید میں ہیں اور ان پر سخت تشدد کیا جا رہا ہے۔ جب ان پر تشدد کی خبر مجھ کو ملتی ہے تو میں رو پڑتا ہوں۔
یہ خط میں نے ابو سفیان کو اس لیے لکھا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر میرے بیوی بچوں پر ظلم و ستم میں کچھ کمی کر دے۔
میں نے یہ کام بیوی بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر کیا ورنہ میرا دل مسلمانوں کے ساتھ ہے اور

"میرا ایمان سلامت ہے!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاطبؓ کا بیان سننے کے بعد انہیں کچھ نہ کہا بلکہ معاف کر دیا اور فرمایا کہ وہ اس واقعے کو بالکل بھول جائیں۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مجبور مسلمان کی اس لغزش کو کیسے معاف نہ فرماتے جبکہ آپؐ کا دامنِ رحمت ہر اپنے اور بیگانے کے لیے وا تھا۔

آیئے اب لشکرِ اسلام کا مکہ کی طرف روانگی کا منظر دیکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں عبداللہؓ بن ام کلثوم اور ایک دوسری روایت کے مطابق ابورہمؓ کلثوم بن حصین غفاری کو اپنا نائب مقرر کیا اور بروز بدھ مطابق ۱۰۔ رمضان المبارک سنہ ۸ ہجری، بعد نماز عصر، دس ہزار کے لشکرِ اسلام کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ فرمایا۔

اس لشکر میں مہاجرین اور انصار کے تمام بالغ افراد شامل تھے۔ راستے میں عرب قبائل اس میں شامل ہوتے رہے حتیٰ کہ لشکر کی تعداد ۱۲ ہزار ہو گئی۔

جب لشکرِ اسلام ذوالحلیفہ یا جحفہ کے مقام پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ معہ اہل و عیال کے مکہ سے ہجرت کر کے آتے ہوئے ملے۔

اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس طرح میری نبوت آخری ہے اسی طرح عباسؓ کی ہجرت بھی آخری ہے۔"

مکہ کے قریب مرالظہران کے مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کو خیمہ زن ہونے کا حکم دیا اور تاکید فرمائی کہ لشکر منتشر ہو کر خیمے لگائے اور الگ الگ خیمہ کے آگے آگ کے الاؤ روشن کیے جائیں۔

چنانچہ جب الاؤ روشن ہوئے تو حدِ نظر تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے اور لگتا تھا بہت بڑا لشکر خیمہ زن ہے۔

اہل مکہ نے جب دور دور تک لشکر کو پھیلے دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے فوراً ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ کو دریافتِ حال کے لیے لشکرِ اسلام کی طرف بھیجا۔

ابوسفیان جوں جوں آگے بڑھتا جاتا تھا اس پر لشکرِ اسلام کا رعب بڑھتا ہی جاتا تھا۔ دور دور تک جلتے ہوئے الاؤ کے شعلے لپک رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ شعلے اسی کی طرف بڑھ رہے ہوں۔

چونکہ مشرکینِ مکہ کا سردارِ اعلیٰ بھی وہی تھا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن بھی وہی تھا اس لیے اسے سب سے زیادہ اپنی جان کا خوف تھا۔

کسی نہ کسی طرح لرزاں و ترساں، چھپتا چھپاتا ابوسفیان، مجاہدینِ اسلام کے خیموں کے قریب پہنچا۔ اس نے اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کر لی تھی اور اب اس فکر میں تھا کہ اسے کسی طرح امان مل جائے۔

اس میں خود تو اتنی ہمت نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جا کر معافی طلب کرے اس لیے ادھر ادھر پھر رہا تھا کہ کوئی سہارا مل جائے تو وہ توبہ کرنے کے لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو۔

دوسری طرف لشکرِ اسلام میں حضرت عباسؓ خیمہ گاہ سے نکل کر کسی ایسے مزدور یا لکڑہارے کی تلاش میں تھے جو مکہ پہنچ کے مشرکین کو لشکرِ اسلام کی آمد سے آگاہ کرے اور یہ کہے کہ جان بچانے اور تباہی سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر اپنی شکست تسلیم کرو اور معافی کے طلب گار ہو۔

اس طرح ایک طرف ابوسفیان اپنا معافی نامہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کسی کا سہارا ڈھونڈتا پھر رہا تھا تو دوسری طرف حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جس کے ذریعے لشکرِ اسلام کی خبر مکہ والوں کو پہنچائی جا سکے۔

پھر جب ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو یوں معلوم ہوا جیسے حضرت عباسؓ کو اسی کی تلاش تھی چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو دیکھتے ہی کہا:

"اے ابوسفیان! اب تمہاری جان کی خیر نہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اتنا بڑا لشکر ہے کہ مشرکینِ مکہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ کوئی مشرک مکہ میں زندہ نہ بچے گا۔ صبح ہوتے ہی قریشِ مکہ کی قسمتوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

ابوسفیان کی آدھی جان پہلے ہی نکل چکی تھی۔ حضرت عباسؓ نے اسے اور دہلا دیا۔ وہ گھبرا کر کانپتے ہوئے بولا:

اے عباسؓ! تم ہی میری مدد کرو اور مجھے اپنی امان میں لے لو"

حضرت عباسؓ اس کا اثر و رسوخ جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ ابوسفیان کے بیع ہونے سے مکہ کی نصف طاقت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر انہوں نے ابوسفیان کو تسلی دی اور کہا:

"میں تمہیں امان دیتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ"۔

اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمہ مبارک پہ لے گئے۔

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمہ پر اس وقت حضرت عمرؓ موجود تھے۔ انہوں نے حضرت عباسؓ کے ساتھ ابوسفیان کو آتے دیکھا تو تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! مجھے اس مشرک کے قتل کی اجازت دیجیے"۔

حضرت عباسؓ اس کے ضامن بن چکے تھے، انہوں نے فوراً کہا:

"یا رسولؐ اللہ! میں ابوسفیان کو اپنی ضمانت پر لایا ہوں۔ اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا"۔

"کیوں ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا!"

حضرت عمرؓ کا لہجہ تلخ ہو گیا:

"یہ مشرک ہے۔ بت پرست ہے۔ اس کی ضمانت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو ہماری جنگ طے ہے!"

حضرت عباسؓ کو بھی غصہ آ گیا۔ کڑک کر بولے:

"میں نے اسے پناہ دی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بات بڑھتے دیکھی تو حضرت عباسؓ سے فرمایا:

"آپ اس وقت اسے اپنے خیمے میں لے جائیے۔ کل صبح فیصلہ ہو گا"۔

حضرت عباسؓ، ابوسفیان کو اپنے ساتھ خیمے میں لے گئے۔ تمام رات جاگتے اور پہرہ دیتے رہے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کوئی اور مسلمان طیش میں آ کر ابوسفیان کا خاتمہ نہ کر دے۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ جنابِ عباسؓ، ابوسفیان کو لے کر دربارِ رسالت میں پہنچے۔ ابوسفیان گھبرایا ہوا اور شرمندہ شرمندہ تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اشارے پر اس کی گردن اڑ سکتی تھی مگر آپؐ تو رحمۃ للعالمین تھے اور رسولِ آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی۔ آپؐ نے کرم نوازی کا

مظاہرہ فرماتے ہوئے ارشاد کیا:

"کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تمہیں معلوم ہو کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ نرمی سے ابوسفیان کی گردن کچھ اور جھک گئی اور اس نے سر جھکا کر عرض کیا:

"میرے ماں باپ آپؐ پر نثار۔ آپؐ کس قدر حلیم و کریم ہیں اور رشتہ داری اور قرابت کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔ اگر کوئی خدا کا شریک ہوتا تو اس مصیبت کے وقت میری مدد کو ضرور آتا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم جان لینے کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں"۔

ابوسفیان نے جواب دیا:

"ابھی اس کے لیے میرے دل میں کچھ شبہ ہے"۔

اس وقت جنابِ عباسؓ نے ابوسفیان سے سرگوشی کی:

"کیوں اپنی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ اب قیل و قال کو چھوڑ اور جلدی سے اسلام لے آ"۔

ابوسفیان کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ فوراً کلمۂ توحید پڑھ کے ایمان لے آیا۔

جنابِ عباسؓ کو ابوسفیانؓ کے اسلام لانے سے خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ اس لیے کہ کل تک فتنہ کی جڑ اور مشرکین کا سرغنہ یہی شخص تھا مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ابوسفیان کی تمام زندگی جاہ پسندی اور تفاخر کے اظہار میں گزری ہے اس لیے اب مطیع ہونے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

پس جنابِ عباسؓ نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! ابوسفیانؓ فخر کرنے کا عادی اور تفاخر کا دلدادہ ہے اس لیے آپؐ اسے کوئی ایسا امتیاز عطا کیجیے جس کی بنا پر وہ اپنی قوم کے سامنے فخر کر سکے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"بہتر ہے۔ جائیے اور اعلان کر دیجیے کہ جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے امان دی جائے گی۔ نیز جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا اس کو بھی امان اور جو حرم میں داخل ہو جائے اسے بھی امان!"

پھر جب ابوسفیانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا کردہ اس اعزاز کے ساتھ مکہ جانے لگا تو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا:

"ابوسفیانؓ کو لے کر وادی کے دہانے پر کھڑے ہو جایئے تاکہ یہ لشکرِ اسلام کی عظمت اور وسعت کا اندازہ کر سکے اور مکہ جا کر اپنی قوم کو بتائے کہ مسلمانوں کے مقابلے پر آ کے وہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالے"۔

جنابِ عباسؓ حکم کے مطابق ابوسفیانؓ کو وادی کے دہانے پر لے گئے جہاں سے پورا لشکرِ اسلام رواں دواں نظر آ رہا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکرِ اسلام کو چار حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا۔ لشکر کی یہ ترتیب و تقسیم ذی طویٰ کے مقام پہ ہوئی تھی جہاں سے لشکر مارچ کرتا ہوا ابوسفیان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میمنہ پہ خالدؓ بن ولید کو مقرر کیا تھا اور ان کی کمان میں عرب کے مشہور مگر سرکش قبائل مثلاً غفار، جہینہ، فرینہ، سلیم اور اسلم وغیرہ تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ جب حضورِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے خالدؓ بن ولید کو فوج کی قیادت اور امارت کا شرف بخشا گیا تھا۔

پہلا حصہ جو ابوسفیانؓ کے سامنے سے پورے وقار اور ترتیب کے ساتھ گزرا وہ لشکر کا میمنہ ہی تھا جس کے سالار خالدؓ بن ولید تھے۔

فوج کے دوسرے حصوں پر جو سالار مقرر ہوئے ان کے نام سعدؓ بن عبادہ اور زبیرؓ بن عوام تھے۔ خالدؓ کو "لیط" کے مقام سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا جبکہ سعدؓ بن عبادہ کو کدا اور زبیرؓ بن عوام کو کدیٰ کے مقامات سے شہر میں داخل ہونا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود "اذاخر" کے مقام سے مکہ میں داخل ہونے کا فیصلہ فرمایا۔

لشکرِ اسلام کا کرّ و فر دیکھ کر ابوسفیانؓ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے حضرت عباسؓ سے کہا:

"اے عباسؓ! آج اس لشکر کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی شان ہے اے ابوالفضل! آخر تمہارے برادر زادے کی بادشاہت قائم ہو گئی!"

"یہ بادشاہت نہیں"۔

جنابِ عباسؓ نے فوراً تصحیح کی:

"یہ نبوتؐ ہے!"

اسلام کی عسکری شان و شوکت دیکھ کر ابوسفیان اس قدر متاثر اور مرعوب ہوا کہ جب وہ مکہ واپس

جا رہا تھا تو اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اسی عالم میں اس نے مکہ کے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر اہلِ مکہ کو اس طرح مخاطب کیا:

"اے قریش! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ایسا لشکرِ جرار لے کر آئے ہیں کہ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم فوراً اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔

یہ بات بھی سن لو کہ جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے امان ہو گی یا جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا یا پھر بیت اللہ میں پناہ گزیں ہو گا اسے بھی امان ہو گی"۔

ابوسفیانؓ کے اس اعلان پہ سمجھدار اہلِ مکہ تو اپنی نجات کی فکر میں لگ گئے مگر وہ بدذات جو اسلام کی قوتِ عسکری کو تسلیم کرنے پہ کسی طرح تیار نہ تھے، انہوں نے لشکرِ اسلام سے ٹکرانے کا احمقانہ فیصلہ کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شدید خواہش تھی کہ حرمِ پاک کے تقدس کے پیشِ نظر وہاں خون نہ بہایا جائے۔

آپؐ نے سرداروں کو حکم دیا تھا کہ کوئی مسلمان اس وقت تک اپنی تلوار بے نیام نہ کرے جب تک اس کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہو۔

مگر —

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تر احتیاط کے باوجود مفسدہ پردازوں نے حرم مقدس میں بھی خون بہانے سے گریز نہ کیا۔ چنانچہ صفوان بن امیہؓ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو نے قبیلہ بنو بکر اور احابیش[1] کے بعض افراد کو زیریں مکہ میں خندمہ کے مقام پر جمع کیا۔

ان قبائل نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور انہیں مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تین اطراف سے تو مکہ میں بلا کسی مزاحمت کے داخل ہو گئے مگر لیط کے مقام پر جہاں سے خالدؓ بن ولید کو داخل ہونا تھا، مندرجہ بالا قبائل نے مزاحمت کی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو مکہ میں سب سے پہلے داخل ہونے کا حکم دیا تھا اور

۱۔ واضح رہے کہ بنو الہون بن خدیمہ، بنو الحرث بن عبد مناف بن کنانہ اور بنو المصطلق کے مشترکہ قبائل کو احابیش کہا جاتا تھا۔

انہی کی مزاحمت کی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات مقدر کر رکھی تھی کہ خالدؓ بن ولید اس دن انہی لوگوں کے خلاف اپنی تلوار کے جوہر دکھائیں جن کے ساتھ مل کر وہ کچھ عرصہ قبل تک مسلمانوں سے جنگ کیا کرتے تھے!

پس —

مقامِ لیط پر شدید جنگ ہوئی جس میں تیرہ مشرکین مارے گئے اور دو اور بعض روایات کے مطابق تین مسلمان شہید ہوئے۔ اس جگہ کے علاوہ کسی اور مقام پر مشرکین کو لشکرِ اسلام کا راستہ روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذاخر کے مقام سے مکہ میں داخل ہوئے اور مکہ کی بلندی پر پہنچ کے سواری سے اترے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بروز جمعہ مطابق ۲۰۔ رمضان المبارک ۸ ہجری دن چڑھے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

آپؐ سانڈنی پر سوار تھے اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کے بیٹے حضرت اسامہؓ بیٹھے تھے۔ اس وقت آپؐ کی زبان پر سورۂ   کا وِرد تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکرِ اسلام کے تمام دستوں کو حکم دیا تھا کہ جب وہ مکہ میں داخل ہوں تو مندرجہ ذیل باتوں کی پابندی کریں:

۱۔ جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۲۔ جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۳۔ جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لے لے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۴۔ جو شخص ابنِ حزم کے گھر میں چلا جائے اسے بھی قتل نہ کیا جائے۔
۵۔ بھاگنے والوں، زخمیوں اور گرفتار ہونے والوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔

اس طرح رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ رویا مبارک (خواب) کامل طور پر پورا ہوا جس کا ذکر کلامِ پاک میں اس طرح کیا گیا ہے:

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن
المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رءوسکم ومقصرین
لا تخافون فعلم ما لم تعلموا فجعل من
دون ذلک فتحا قریبا۔

ترجمہ:

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو سچا ہی خواب دکھایا تھا کہ انشاء اللہ تم مسجدِ حرام میں بے خوف و خطر داخل ہو گے۔ وہاں جا کر تم میں سے بعض تو اپنے سر منڈوائیں گے اور کچھ فقط بال ہی کتروائیں گے۔ غرض جس بات کی تم کو خبر نہ تھی اللہ کو پہلے سے ہی معلوم تھی۔
پھر اس خواب کی تعبیر یہ ہوئی کہ فتح مکہ سے پہلے ایک فتح کر لی۔

لشکرِ اسلام کے میمنہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس حصۂ فوج میں حضور اکرمؐ نے جو قبائل شامل فرمائے تھے وہ سراسر بدوی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یہ قبائل نہ تہذیب و تمدن سے واقف تھے نہ کسی نظام میں رہ کر زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔

پھر جب خالدؓ بن ولید کو ایسے وحشی اور بے لگام لشکر کی سرداری پر مقرر کیا گیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ صرف خالدؓ ہی اس مخلوط الطبائع اور مختلف السیرت لوگوں کی کمان کر سکتے تھے۔ ان کی قیادت کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

خالدؓ بن ولید نے مکہ میں داخل ہوتے وقت مزاحمت کرنے والے لشکر کا جس بے جگری اور جرأت سے مقابلہ کیا اس کا اعتراف بہت سے مسلمان اور مشرک شعراء نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ ذیل میں حماس بن قیس بکری کے اشعار کا ترجمہ پیش ہے۔

حماس ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے خالدؓ بن ولید کا مقابلہ کیا تھا۔ جب ان لوگوں نے شکست کھائی تو حماس بن قیس بھاگ کر اپنے گھر پہنچا اور بیوی سے کہا:

"دروازہ بند کر دو"۔

اس کی بیوی نے اس کی بزدلی اور نامردی پر اسے بہت لعنت ملامت کی۔ اس کے جواب میں حماس نے یہ اشعار کہے:

"اے میری بیوی! کاش تو خندمہ کی جنگ میں موجود ہوتی جبکہ صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابی جہل بھاگ گئے تھے اور ابویزید بھی حیران و پریشان حال کھڑا تھا۔

اس وقت جبکہ میں ایسی تیز تلواروں کے ساتھ ان کے آگے بڑھا جو کلائی اور کھوپڑی کو کاٹ کاٹ دیتی تھیں۔

اور اس شدت کی لڑائی تھی کہ بجز تلواروں کی جھنکار کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اور ہمارے پیچھے شور و غوغا تھا۔

پس ـــــ اگر تو اس منظر کو دیکھتی تو ایک لفظ بھی ملامت کا میرے متعلق نہ کہتی!"

خانہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ پھر سات چکر لگا کر کعبہ کا طواف کیا۔

آپؐ نے کعبہ کی چابی (کلید) عثمانؓ بن طلحہ سے واپس لے لی۔ ان کے خاندان میں ایک زمانہ سے کلید برداری کی سعادت چلی آ رہی تھی۔ بعد میں حضورِ پاکؐ نے کلیدِ کعبہ دوبارہ عثمانؓ بن طلحہ کو عطا کر دی اور آج تک یہ فرض اسی خاندان کے سپرد ہے۔

کعبہ کی دیواروں پر جس قدر تصاویر آویزاں یا منقش تھیں وہ سب ہٹا اور مٹا دی گئیں اور کعبہ کے اردگرد جو تین سو ساٹھ بُت لگے تھے وہ سب توڑ دیے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک میں ایک چھڑی تھی جس سے آپؐ ان بتوں کو ٹھوکے دیتے تھے اور زبانِ اقدس سے یہ الفاظ ادا فرماتے جاتے تھے:

جاء الحق و زھق الباطل ط ان الباطل کان زھوقاًo

ترجمہ:

"حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹنے والی ہی چیز تھی"۔

کعبہ میں رکھا ہوا ہر بت زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کے بعد آپؐ نے جنابِ بلالِ حبشیؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں۔

چنانچہ حضرت بلالؓ نے اذان دی۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلالؓ اور حضرت طلحہؓ کے ساتھ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور نمازِ شکرانہ ادا فرمائی۔

اس کے بعد دروازے پر آ کر قریشِ مکہ کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا:

"ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔

اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے عاجز بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدد کی اور تن تنہا مخالف جتھوں کو شکست دی۔

جان لو کہ تمام مفاخر (فخر و مباہات)، سارے انتقامات اور خون بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، سوائے کعبہ کی نگرانی اور حاجیوں کی آب رسانی کے۔

جان لو کہ اتفاقی ناگہانی قتل خواہ وہ کوڑوں سے ہو یا لاٹھی سے، اس کا خون بہا دیا جائے گا، جو ایک سو اونٹ ہوگا۔

اے قریش!

اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر خاندانوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو"۔

بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں معزز ترین وہ شخص ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ بے شک اللہ دانا اور واقف کار ہے"۔

اس کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قانونی اعلان فرمایا:

"خدا اور اس کے رسولؐ نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی"۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آپؐ کے سامنے وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے اب تک اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی شدید مخالفت کی تھی۔ آپؐ کے ایک اشارے پر ان کی گردنیں قلم ہو سکتی تھیں مگر خدا نے آپؐ کو تمام کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔

چنانچہ آپؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

"اے اہلِ مکہ! تمہیں معلوم ہے میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں"۔

قریش بولے:

"ہم آپؐ سے نیک سلوک کی توقع رکھتے ہیں کیونکہ آپؐ ایک شریف اور بامروّت بھائی ہیں"۔

اس وقت ارشادِ نبویؐ ہوا:

"جاؤ، تم سب آزاد ہو۔ تم پہ آج کوئی مواخذہ نہیں!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف چار افراد کے قتل کا حکم دیا۔ ان میں دو مرد اور دو عورتیں تھیں مردوں کے نام یہ تھے:

۱۔ عبدالعزیٰ بن حنظل

۲۔ مقیس بن حبابہ

یہ منافقت سے اسلام لائے تھے پھر موقع ملا تو مسلمانوں کو قتل کر کے بھاگ آئے۔

عورتوں میں ایک تو کنیز سارہ تھی جو اپنے آقا حاطبؓ کا خط لے کر مکہ جا رہی تھی اور راستہ میں گرفتار ہو گئی تھی۔ حضورؐ نے اس کے قتل کا حکم دیدیا تھا مگر بعد میں معاف فرما دیا۔ مگر ابنِ حنظل کی دو لونڈیوں میں سے جو حضورؐ کی ہجو میں اشعار گایا کرتی تھیں، ایک کو ہلاک کر دیا گیا اور دوسری کی جان بخش کر دی گئی۔

اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض ایسے مشرکین کو بھی معاف فرما دیا جو بذاتہٖ معافی کے لیے حاضر ہو گئے تھے۔

ان مشرکین میں ایک عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھا جو کاتبینِ وحی میں سے تھا لیکن مرتد ہو کر مکہ آ گیا تھا۔ اسے جنابِ عثمانؓ کی سفارش پہ معاف کیا گیا۔

حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی کو بھی معاف فرما دیا گیا۔

اسی طرح ہبار بن الاسود جس نے آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا تھا، اسے بھی معاف کر دیا گیا۔

مجرمین میں عکرمہ بن ابی جہل کا نام بھی تھا جو اپنی اسلام دشمن حرکتوں کی وجہ سے خوفزدہ ہو کر یمن بھاگ گیا تھا مگر اس کی بیوی ام حکیم بن الحارث نے اسلام قبول کیا اور اپنے خطا کار شوہر کی جاں بخشی کی درخواست کی تو آنحضرتؐ نے اسے بھی معاف فرما دیا۔

عکرمہ بن ابی جہل کو جب اپنی معافی کی خبر یمن میں ملی تو سخت متعجب ہوا اور وہاں سے واپس آ کر

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔

پھر آپؐ صفا کی پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ وہاں لوگ جوق در جوق آتے اور اسلام قبول کرتے رہے۔ ان نومسلموں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نابینا والد ابو قحافہؓ بھی تھے۔ حضورؐ نے صرف پندرہ دن تک مکہ میں قیام کیا۔

اس مختصر قیام کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے سب سے بڑے بت عزیٰ[1] کو توڑنے کا حکم دیا۔

یہ بت نخلہ کے مقام پر نصب تھا۔ قریش، کنانہ اور مضر کے قبائل اس کی تعظیم کرتے تھے۔ جس معبد میں عزیٰ نصب تھا اس معبد کا انتظام بنو ہاشم کے حلیف بنو سلیم کی شاخ بنی شیبان کے سپرد تھا۔

حضورؐ کو علم تھا کہ تمام قبائل کنانہ اور مضر اس کی حد درجہ تعظیم کرتے ہیں اس لیے اس کا انہدام کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شاید حضورؐ کو اس بت کے پہلے منہدم کرنے کا خیال اس وجہ سے آیا کہ اگر اسے گرا دیا گیا اور اس کے پرستش کرنے والوں نے اطاعت قبول کر لی تو دوسرے بتوں کو توڑنا اور ان کے پرستاروں کو مطیع کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے صرف پانچ دن بعد خالدؓ بن ولید کو حکم دیا کہ وہ نخلہ جا کر عزیٰ کو منہدم کر دیں۔

حضورؐ کا حکم پاتے ہی خالدؓ صرف تیس سواروں کے ساتھ نخلہ روانہ ہو گئے۔ ان کے اس مختصر دستہ میں زیادہ تر ان کے محافظ دستہ کے سوار شامل تھے اور ان سواروں میں نوحنا کا جواں سال منگیتر ابن حاتم بھی تھا۔ اس نے جنگ حذیبیہ میں خوب دادِ شجاعت دی تھی۔

خالدؓ بن ولید اپنے سواروں کے ساتھ ۲۵۔ رمضان المبارک ۸ھ کو نخلہ پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی انہوں نے بت خانہ میں داخل ہو کر عزیٰ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

مشرکین کا وہاں ایک بڑا مجمع تھا مگر کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ خالدؓ بن ولید کے عزیٰ کو منہدم کرنے کے کام میں مزاحم ہو سکے۔

عرب قبائل پر قریش کی برتری ختم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے مکہ پہ قبضے سے عرب قبائل کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور انہوں نے جان لیا تھا کہ اب قریشِ مکہ پہ تکیہ کرنے کے بجائے انہیں دین و دنیا کی بھلائی کے لیے

۱۔ یاد رہے کہ عزیٰ ایک دیوی کا نام تھا۔

اسلام کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مکہ ہی میں موجود تھے کہ بعض بڑے قبائل نے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔

پس حضورؐ نے بہتر خیال کیا کہ مکہ کے اردگرد مقیم قبائل کے پاس لشکر بھیج کے ان سے اسلام قبول کرنے کو کہا جائے۔

اس سلسلہ میں نبی کریمؐ نے اپنے قیام مکہ کے دوران ساڑھے تین سو مہاجر، انصار اور بنو سلیم کے مجاہدین کے ساتھ خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف تبلیغ اسلام کے لیے روانہ کیا اور ایک روایت کے مطابق انہیں قتال سے منع فرمایا۔

چونکہ بنو جذیمہ میں تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں ایک انتہائی ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا اس لیے اس کا ذکر تفصیل سے کیا جا رہا ہے۔

تاریخِ اسلام میں اس واقعہ کو بہت اچھالا گیا ہے اور اس کی موافقت اور مخالفت میں اس قدر دلائل دیے گئے ہیں کہ حقیقت تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ تاریخی واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔

شوال ۸ ہجری میں خالدؓ بن ولید ساڑھے تین سو مجاہدین کے ساتھ بنو جذیمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قبیلہ چشمہ غمیصاء کے پاس آباد تھا۔

اس چشمہ پر پہنچ کے خالدؓ بن ولید نے اس قبیلے کے افراد کو طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہو گئے تو انہیں حکم دیا گیا:

"ہتھیار رکھ دو کیونکہ قریشِ مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے"۔

بنو جذیمہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد خالدؓ نے ان کی مشکیں کسنے کا حکم دیا اور ان میں بعض کو قتل کرا دیا۔

تاریخوں میں یہ باتیں اس انداز سے درج کی گئی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔

سب سے پہلے تو یہ کہ خالدؓ بن ولید کا بنو جذیمہ سے یہ کہنا کہ وہ ہتھیار اس وجہ سے ڈال دیں کیونکہ

قریشِ مکہ نے قبولِ اسلام کر لیا ہے، کچھ بے تکا سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی قبیلہ کو اسلام لانے کے لیے قریشِ مکہ کے مسلمان ہونے کا جواز پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دوسرے یہ کہ اگر خالدؓ بن ولید نے انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا اور انہوں نے ہتھیار رکھ دیے تو پھر ان کی مشکیں کسنے اور بعض کو قتل کرنے کا کیا جواز تھا؟

اس کے بعد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب اس واقعہ کی اطلاع جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر فرمایا:

"اے اللہ! میں خالدؓ کے فعل سے بری الذمہ ہوں"۔

تمام تاریخی شواہد سے قطع نظر حضورؐ کا یہ فرمانا کہ اے اللہ! میں خالدؓ کے اس فعل سے بری الذمہ ہوں اس بات کا ثبوت ہے کہ بنو جذیمہ کے افراد خالدؓ بن ولید کے حکم سے قتل کیے گئے اور وہ غلط قتل کیے گئے کیونکہ تاریخیں غلط ہو سکتی ہیں مگر فرمانِ رسولؐ کے غلط ہونے کا تصور کرنا ہی کفر ہے:

پس ـــ

یہ ثابت ہوا کہ خالدؓ بن ولید نے بنو جذیمہ کے آدمیوں کو قتل کرنے کا غلط حکم دیا تھا اور یہ حکم کیوں دیا گیا اس کی وجہ بخاری نے بیان کی ہے جو قرینِ قیاس بلکہ درست ہے۔

خالدؓ بن ولید کے ساتھ جو دستہ بنو جذیمہ کی طرف بھیجا گیا تھا اس میں دو صحابی بھی شامل تھے:

۱۔ ابن عمرؓ

۲۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ

امام بخاری نے یہ روایت جناب ابن عمرؓ کی زبان سے بیان کی ہے۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہؐ نے خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ بنو جذیمہ نے بجائے اس کے، کہ وہ جواب میں

اسلمنا (ہم اسلام لائے) کہتے،

صبانا - صبانا (ہم صابی ہو گئے) کہنا شروع کر دیا"۔

علامہ بدر عینی شارح بخاری لکھتے ہیں:

"صبانا ۔ صباء سے ہے جس کے معنی ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے کے ہیں۔ قریش ہر اس شخص کو جو مسلمان ہو جاتا تھا، صابی

کہا کرتے تھے۔

جب خالدؓ بن ولید کے جواب میں بنو جذیمہ نے "صبانا۔ صبانا" کہا تو حضرت ابنِ عمرؓ نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں لیکن خالدؓ بن ولید نے ان الفاظ کو کافی نہ جانا۔ وہ ان کے منہ سے اسلام کا لفظ صاف طور پر سننا چاہتے تھے۔"

خطابی کہتے ہیں:

"اس بات کا احتمال ہے کہ خالدؓ بن ولید کو اس بات پر غصہ آیا ہو کہ بنو جذیمہ نے اسلام کا لفظ چھوڑ کے صباٗ کا لفظ اختیار کیا۔ ممکن ہے کہ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ یہ لوگ یہ لفظ صباٗ، اسلام سے نفرت کی وجہ سے کہہ رہے ہیں اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اسی لیے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

رسولؐ اللہ، خالدؓ پر اس لیے ناراض ہوئے کہ:

"انہوں نے جلدی کیوں کی اور معاملہ فہمی سے کام کیوں نہ لیا"۔

امام ابنِ تیمیہ، علامہ عینی، ابنِ حجر وغیرہ نے صاف طور پر کہا ہے کہ:

"خالدؓ بن ولید نے جو کچھ کیا وہ غلط فہمی کی وجہ سے کیا اور بنو جذیمہ کے چند آدمی قتل کر کے انہوں نے اپنے کسی دیرینہ جھگڑے کا انتقام ہرگز نہیں لیا جیسا کہ بعض لوگ الزام لگاتے ہیں۔

پھر یہ کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو کوئی سزا نہیں دی۔ انہیں ان کے عہدے پر برقرار رکھا۔ اور آئندہ حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ کے دوران بھی خالدؓ نے بحیثیت ایک سردار کے کئی جنگوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

بعد میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب علی مرتضیٰؓ کو بنو جذیمہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان کے مقتولین کا خون بہا ادا کریں۔

اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خالدؓ بن ولید نے یہ اقدام ایک غلط فہمی کے تحت کیا تھا جسے معاف فرماتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

خون بہا کی رقم ادا فرما دی تھی۔"

آخری بات یہ کہ حضرت خالدؓ بن ولید جیسے انسان سے، جس کی تمام عمر فوجی آداب کے تحت گزری تھی، ان [سے] صبر و تحمل اور معاملہ پر ضرورت سے زیادہ سوچ بچار کی توقع رکھنا شاید درست نہ ہوگا۔ غصہ اور خشونت [ان] کے مزاج میں سرایت کر گئے تھے۔ ان کے خیال میں اسلام قبول کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ انسان اسلام کا [اق]رار کرتے ہوئے زبان سے بھی "اسلام" کا لفظ صاف صاف ادا کرے۔

چونکہ بنو جذیمہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ایک روایت کے مطابق انہوں نے ہتھیار ڈالنے میں بھی ذرا [پس و] پیش کیا تھا اس لیے آپ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔







فتح مکہ کے بعد عرب کے بہت سے قبائل نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا لیکن ہوازن اور بنو ثقیف کے دو بڑے قبائل نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر وہ مسلمانوں کو شکست دیدیں تو اہلِ مکہ کے جتنے باغات اور جاگیریں طائف میں ہیں، وہ سب ان کے قبضہ میں آجائیں گی۔

ہوازن ایک بہت بڑا قبیلہ تھا جس کی کئی شاخیں تھیں۔ یہ قبیلہ، ہوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس بن عیلان بن الیاس بن مضر کی جانب منسوب تھا۔

قبیلہ ہوازن والے یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ مسلمانوں سے اس بُت شکنی کا بھی انتقام لیں جو انہوں نے بیت اللہ سے بُت ہٹوا کر کی تھی۔

چنانچہ، اس قبیلہ نے بنی مضر اور بنی حلال کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح ان تمام قبائل کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو گئی۔

اب یہ اس لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور وادیٔ حنین میں پہنچ کے قیام کیا۔ وادیٔ حنین، مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔

اس لشکر کا سردار مالک بن عوف ایک تیس سالہ جوان تھا۔ اس کے حکم پر ان قبائل نے اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے لیا تھا تاکہ کوئی شخص میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب ان قبائل کے ارادوں کی خبر ملی تو آپؐ نے دریافتِ حال کیلیے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی کو جاسوس کے طور پر ان کی طرف بھیجا۔

عبداللہ بڑی تیزی سے اُدھر گئے اور اسی تیزی سے واپس آ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر دی کہ ہوازن، بنو ثقیف اور دیگر قبائل جن کی مجموعی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے، وہ لشکرِ اسلام سے مقابلہ کے لیے وادیٔ حنین میں خیمہ زن ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اطرافِ کعبہ اور سرزمینِ حرم پہ خونریزی نہیں چاہتے تھے اس لیے آپؐ بروز ہفتہ ۶۔ شوال ۸ھ ہجری کو ان قبائل کی سرکوبی کے لیے مکہ سے روانہ ہوئے۔ آپؐ کے ساتھ دس ہزار کے لشکر کے علاوہ دو ہزار اہلِ مکہ بھی تھے جو مالِ غنیمت کے خیال سے یا پھر قومی عصبیت کی وجہ سے ساتھ ہو گئے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو سو سواروں کے ہمراہ متعین کیا تھا۔ خالدؓ کے یہ تمام سوار سوائے ابنِ حاتم کے، سب کے سب بنو سلیم سے تعلق رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ سے نکلتے وقت خالدؓ کو ان کے دستہ کے ساتھ آگے روانہ فرما دیا تھا اور خالدؓ، جعرانہ تک مقدمۃ الجیش پہ متعین رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لشکر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے چوتھے روز منگل کو شام کے وقت حنین کے مقام پر پہنچ گئے۔

لشکرِ اسلام تعداد میں دشمن سے تین گُنا تھا اور ان کے پاس اسلحہ بھی کثرت سے تھا اس وجہ سے ان میں غرور اور تفاخر پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ :

"آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے !"

ہم سب جانتے ہیں کہ غرور اور تکبر اللہ کو قطعی پسند نہیں۔ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی متعدد احادیث کے ذریعے مسلمانوں کو غرور کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ جب آپؐ کے کانوں تک لشکر کی یہ پُرغرور آواز پہنچی تو آپؐ نے اس پہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

دشمن نے زبردست قسم کی صف بندی کی تھی۔ ان کے لشکر کے آگے سوار، ان کے پیچھے پیادے، ان کے عقب میں عورتوں کی قطاریں، پھر بھیڑ بکری اونٹ اور دوسرے مویشی تھے۔

دشمن کے لشکر کا سپہ سالار، مالک بن عوف بڑا ذہین و سمجھدار نوجوان تھا۔ اس نے پیش بندی کے طور پہ تمام راستوں اور ناکوں پہ تیر انداز دستے مقرر کر دیئے تھے تاکہ جس وقت مسلمان لشکر بے خبری کے عالم میں وہاں پہنچے تو اسے تیروں پہ رکھ لیا جائے اور اسے اتنا موقعہ ہی نہ دیا جائے کہ وہ جنگ کے لیے ضروری صف بندی کر سکے۔

مالک بن عوف کی یہ عقلمندی کام آئی۔

چنانچہ جس وقت لشکرِ اسلام صبح کے دھندلکے میں (بعض تواریخ کے مطابق شام کے دھندلکے میں) وادیٔ حنین میں اترا تو اس پہ اچانک تیروں کی بارش شروع ہوگئی اور دشمن کے دستوں نے اس پر شدید حملہ کر دیا۔

اس بلائے ناگہانی سے مسلمان گھبرا گئے اور جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ظاہر ہے کہ خالدؓ کا سو سواروں کا دستہ جو سب سے آگے تھا، سب سے پہلے اسی پر دشمن کے تیروں کی باڑ پڑی اور ان کے گھوڑے منہ گھما کر بھاگنے لگے۔

غزوۂ حنین کے موقعہ پہ مسلمانوں کی جو بُری حالت ہوئی، اس کا نقشہ کلامِ پاک نے اس طرح کھینچا ہے:

ترجمہ:

"اے مسلمانو! یاد کرو حنین کے دن کو، جب تم اپنی کثرت پہ نازاں تھے
لیکن کوئی چیز بھی تمہارے کام نہ آسکی۔ زمین اپنی فراخی کے باوجود تم
پر تنگ ہوگئی۔ اور تم پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔"

بھاگنے والوں میں اہلِ مکہ کے دو ہزار وہ سوار اور پیادے بھی تھے جو مالِ غنیمت کے حصول کے لیے لشکرِ اسلام کے ساتھ ہولیے تھے۔ وہ بھاگ کے جدھر جاتے، ادھر سے ان پہ تیر برسنے لگتے۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ گویا زمین ان کے لیے سکڑ گئی اور پناہ کا کوئی گوشہ باقی نہ رہا۔

ان ہمت شکن لمحات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ سوائے چند صحابہؓ کے اور کوئی نہ رہ گیا تھا۔

ان صحابہ کرامؓ میں جنابِ ابوبکر صدیقؓ، جنابِ عمرؓ، جنابِ علی مرتضیٰؓ، جنابِ عباسؓ، ابوسفیان بن حارثؓ، فضل بن عباسؓ، ربیعہ بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور ایمن بن ام ایمنؓ شامل تھے۔

اس کڑے اور سخت آزمائش کے وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کمال پامردی اور بے پناہ

استقلال کا مظاہرہ فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دائیں بائیں دیکھا اور پکارا:

"یا معشر الانصار!"

اس کے جواب میں آواز آئی:

"لبیک!"

اس نازک وقت میں آپؐ اپنے خچر، جس کا نام دُلدُل تھا، سے اتر پڑے اور جلالِ نبوت میں فرمایا:

انا النبی لا کذب:

"میں نبی ہوں۔ یہ جھوٹ نہیں ہے۔"

انا ابن عبد المطلب:

"میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔"

حضرت عباسؓ کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔

جنابِ عباسؓ نے بلند آواز سے پکارا:

"یا معشر الانصار!"

(اے گروہِ انصار!)

"یا اصحاب الشجرۃ!"

(اے بیعتِ رضوان والو!)

حضرت عباسؓ کی آواز جب مسلمانوں کے کانوں میں پہنچی، جو اُس وقت گھبرا کر پسپا ہو رہے تھے تو وہ فوراً آواز کی طرف لپکے۔ اور رسولِ خدا کے گرد جمع ہوگئے۔

پھر مسلمانوں نے اس جوش و خروش اور بے جگری سے دشمنانِ اسلام پہ ایسا زبردست حملہ کیا کہ ان کے قدم میدان سے اکھڑ گئے۔

اس غزوہ میں دشمن کے ستر آدمی مارے گئے۔ ان میں اُن کا ایک سردار ذوالخمار اور اس کا بھائی عثمان بن عبداللہ بھی شامل تھا۔

دشمنوں کا سردارِ اعلیٰ مالک بن عوف اپنے قبیلہ کی ایک جماعت کے ساتھ بھاگ کے طائف کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔

شکست خوردہ فوج کا تیسرا حصہ یعنی قبیلہ ہوازن کے لوگ اپنے اہل وعیال اور مال و زر کے ساتھ قلعہ اوطاس میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خالدؓ بن ولید بھی ان لوگوں میں موجود تھے یا نہیں جو اس افراتفری کے عالم میں بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اس لیے کہ حضرت خالدؓ کا دستہ جس میں بنو سلیم کے آدمی تھے، سب سے آگے تھا اور تیروں کی بارش سب سے پہلے اسی پر ہوئی۔

تاریخ کی کوئی کتاب یہ نہیں بتاتی کہ حضرت خالدؓ ان لوگوں کے ساتھ تھے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود رہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید قبیلہ بنو سلیم کے ایک سو سواروں کے سردار تھے اور ہراول دستے کے طور پر لشکر کے آگے آگے چل رہے تھے۔ چنانچہ جب ان پر تیروں کی اچانک بارش ہوئی تو انہوں نے فوراً تیروں کی اس بارش سے بچنے کے لیے اپنے اونٹ موڑے۔

میدانِ جنگ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب سامنے سے دباؤ بڑھ جاتا ہے تو کچھ دیر کے لیے مصلحتاً پسپا ہونا پڑتا ہے۔ حضرت خالدؓ بھی پیچھے ہٹے مگر فوراً ہی ان کے کانوں میں حضرت عباسؓ کی گرجدار آواز پہنچی اس آواز کو سنتے ہی حضرت خالدؓ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے اونٹوں کا رخ آواز کی سمت کر دیا مگر تیر اس قدر تیزی سے برس رہے تھے کہ اونٹ بے قابو ہو رہے تھے اور سامنے کی طرف گردن نہ گھماتے تھے۔

ایسے وقت میں اس بہادر سالار نے اپنی تلوار سے اپنے ہی اونٹ کی گردن کاٹ دی اور کود کر اس سے الگ ہو گئے۔

یہی ترکیب ان کے دوسرے سواروں نے بھی کی اور وہ سب کے سب پا پیادہ بے تحاشہ حضرت عباسؓ کی آواز کی طرف دوڑ پڑے۔

جس وقت یہ پیدل دستہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچا تو اس کی زبان پر "لبیک یا رسول اللہ" کا نعرہ تھا۔

حضرت خالدؓ آواز سنتے ہی لبیک کا نعرہ لگاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے تھے ساتھ ہی انہوں نے اپنی اس وقتی اور مجبوری کے تحت پسپائی کو جسے بعض لوگوں نے "بھاگنے" کا نام دیا ہے،

ایسی تلافی کر دی کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔

واپس آنے کے بعد حضرت خالدؓ اور ان کے دستے کے سوار جو اب سب کے سب پیدل تھے، دشمن پر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ ان کی صفوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔

حضرت خالدؓ کے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے جو آتا تھا، مارا جاتا تھا۔ اس عالم میں ان کے ہاتھ سے دو ایک عورتیں بھی قتل ہوئیں۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ایک آدمی کے ذریعے حضرت خالدؓ کو عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے منع فرمایا۔

حضرت خالدؓ اس غزوہ میں زخمی ہو گئے تھے۔ حضورؐ کو حضرت خالدؓ سے جو لگاؤ تھا اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ آپؐ خود حضرت خالدؓ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور آپؐ نے ان کے ساتھیوں کو ان کی تیمارداری کے لیے مختلف ہدایات دیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ دشمنانِ اسلام کا سپہ سالار مالک بن عوف شکست خوردہ لشکر کے ساتھ طائف کے قلعہ میں جا چھپا تھا اور اب اس نے ایک نئی جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی۔

پس ـــ

حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حنین سے فارغ ہوتے تو آپؐ نے مالِ غنیمت جعرانہ بھجوا دیا اور خود لشکر لے کر طائف پہنچے۔ طائف مکہ سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر حجاز کا دوسرا بڑا شہر تھا۔

یہ شہر سطحِ سمندر سے تین ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔

طائف، قبیلہ بنو ثقیف کا مسکن اور روؤسائے عرب کا شہر کہلاتا تھا۔

شہر کے گرد ایک سربفلک اور مضبوط فصیل تھی۔ مالک بن عوف نے یہاں پہنچتے ہی فصیل کی مرمت کرائی اور قلعہ کے اندر ایک سال کے لیے سامانِ خورد و نوش اکٹھا کر لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ آپؐ نے وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

قلعہ بے حد مضبوط تھا اس لیے محاصرے نے طول کھینچا۔ حضرت خالدؓ بن ولید لشکرِ اسلام کے ساتھ

ساتھ تھے۔ وہ اگرچہ زخمی تھے لیکن ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ بار بار خیمے سے نکل کر قلعے کے سامنے جاتے اور نعرہ لگاتے:

"ھل من مبارز"

(مجھ سے مقابلہ کرنے والا بھیجو)۔

لیکن ان کی للکار کا قلعہ پر سے کوئی جواب دیا جاتا اور نہ کوئی ان کے مقابلے پر نکلتا تھا۔ ان کے بار بار للکارنے سے تنگ آ کر آخر بنو ثقیف کا ایک سردار جس کا نام عبد یالیل تھا، قلعہ کی دیوار پر آیا اور پکار کر بولا:

"اے ابنِ ولیدؓ! ہم میں سے کوئی شخص تمہارے مقابلے پر نہیں نکلے گا۔ ہم اسی طرح قلعے میں مقیم رہیں گے کیونکہ ہمارے پاس اس قدر سامانِ خورد و نوش ہے جو دو سال تک کافی ہو گا۔"

محصورین نے قلعہ سے تیر برسا کر مسلمانوں کا جانی نقصان کیا۔ مسلمانوں نے قلعہ کی فصیل توڑنے کے لیے منجنیق اور دبابے کا بھی استعمال کیا لیکن اس وقت تک مسلمان ان آلات کے استعمال سے اچھی طرح واقف نہ تھے اس لیے فصیل کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے۔

قلعہ طائف کا محاصرہ بیس دن تک جاری رہا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوفل بن معاویہ سے خصوصی مشورہ کیا۔ اس نے بڑا دلچسپ جواب دیا۔

اس نے کہا:

"لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے۔ اگر کوشش جاری رہی تو پکڑی جائے گی اور اگر چھوڑ دی جائے تب بھی کوئی اندیشہ نہیں اس لیے بہتر ہے آپ محاصرہ اٹھا لیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوچا کہ طائف کے اردگرد اسلام پھیل چکا ہے اس لیے طائف کی حالت سمندر میں ایک جزیرے کی سی ہو گی اور وہ زیادہ دن تک الگ نہ رہ سکے گا۔ اگر اس وقت اس پر سختی کی گئی تو دو طرفہ نقصان ہو گا۔ محاصرہ اٹھا لینے کی صورت میں بنو ثقیف میں مسلمانوں کے لیے رضاکارانہ طور پر جذبۂ اطاعت ابھرے گا اور ان کے دلوں میں اسلام کی خوبیاں اثر کیے بغیر نہ رہیں گی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ:

"بنو ثقیف کے لیے بد دعا فرمائیں!"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی:

"اے خدا!

بنو ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں میرے پاس آنے کی توفیق عطا فرما۔"

غور کرنے کی بات ہے کہ جس ہستی کو خداوندِ نعمت نے سراپا رحمت بنایا ہو اس کے لبوں سے کسی کے لیے بد دعا کیسے نکل سکتی ہے!

محاصرہ اٹھانے کے بعد آپؐ جعرانہ تشریف لائے جہاں ہوازن کے قیدی اور مالِ غنیمت رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالِ غنیمت کی تقسیم کا حکم دیا۔

تقسیم شروع ہوئی تو ایک منافق نے آواز دے کر کہا:

"یہ خدائی تقسیم نہیں ہے۔"

یہ آواز سن کر صحابہ کرامؓ کے چہرے غصہ سے تمتما اٹھے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"یا رسول اللہ! کیا ہم اسے قتل نہ کر دیں؟"

حضرت خالدؓ بن ولید تلوار کھینچ کر بولے:

"حضورؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"نہیں۔ اسے کچھ نہ کہو۔ شاید یہ نماز پڑھتا ہو۔"

اللہ اللہ! کیا شانِ رحمت تھی۔ آپؐ کو اسلام اور مسلمان کا کس قدر احترام تھا کہ ایک منافق صریحاً مالِ غنیمت کی تقسیم پر ناجائز اعتراض کر رہا ہے۔ یہ نظامِ تقسیم خود رسولِ خدا کا بنایا ہوا ہے۔ صحابہ کرامؓ اس منافق کو قتل کرنے پر آمادہ ہیں مگر آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:

"نہیں۔ اسے کچھ نہ کہو۔ شاید یہ نماز پڑھتا ہو۔"

اور آج یہ حال ہے کہ ایک مذہبی جماعت کا پیشوا دوسری جماعت کے پیشوا کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسرا نماز پڑھتا ہے وہ اسے بے دھڑک "کافر" کہہ دیتا ہے۔۔۔

خیر یہ میرا موضوع نہیں اور نہ میں اس کا اہل ہوں۔

دراصل مالِ غنیمت کی تقسیم میں کوئی بے اعتدالی نہیں ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے ان جدید الاسلام مسلمانوں کو جو شرفائے مکہ میں سے تھے، ان کی تالیفِ قلوب کے خیال سے غنیمت کا کچھ زیادہ حصہ عطا فرمایا تھا۔ اس پر بعض انصار نے اعتراض کیا اور صحابہ کرامؓ کو غصہ آگیا۔

چنانچہ حضورؐ نے انصار کے دلوں کو صاف کرنے کے لیے ان سے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"اے گروہِ انصار! یہ تم لوگوں نے کیسی بات پیدا کر دی! کہیں دلوں میں گرہ تو نہیں پڑ گئی؟

کیا یہ سچ نہیں کہ تم گمراہ تھے۔ خدا نے میرےؐ ذریعے تمہاری ہدایت کی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے۔ خدا نے میرےؐ ذریعے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے۔ خدا نے میرےؐ ذریعے تمہیں دولتمند بنایا۔"

خطبہ کے دوران انصار، آپؐ کی ہر بات پہ کہتے جاتے تھے کہ:

"خدا اور رسولؐ کے ہم پر بے حد احسان ہیں!"

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"بخدا! اگر تم یوں کہو تو بے شک صحیح کہو گے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تم ایسی حالت میں ہمارے پاس آئے تھے کہ تمام لوگوں نے تم کو جھٹلا دیا تھا۔ پس ہم نے تم کو سچا سمجھا اور تم پر ایمان لائے۔ تم بے یار و مددگار آئے اور ہم نے تمہاری مدد کی۔ تم کو سب نے چھوڑ دیا، ہم نے تمہاری غمخواری کی۔ تم غریب و بے کس تھے۔ ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تم بے چین تھے ہم نے تمہیں تسلی دی۔

اے گروہِ انصار!

کیا اس مردار دنیا کے لیے تم مجھ سے ناخوش ہوئے جاتے ہو جس کو (یعنی مالِ غنیمت کو) میں نے ضعیف الاسلام اہلِ مکہ میں تالیفِ قلوب کی غرض سے تقسیم کر دیا اور تمہارے ایمان کی پختگی پر اعتماد کر کے تم کو اس میں سے کم دیا۔

اے گروہِ انصار!

کیا تم اس پر خوش نہیں کہ لوگ بھیڑ بکریاں لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسولؐ کو لے کر اپنے وطن جاؤ۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے کہ تم جو لے کر جاؤ گے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو دوسرے لے کر جائیں گے۔

میں تم لوگوں کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصاری ہوتا اور اگر کل جہان کے آدمی ایک راستے پر چلیں اور تم ایک راستہ پر، تو میں انصار ہی کے ساتھ چلوں گا۔

اے میرے اللہ!

انصار اور ان کی اولاد پر رحم فرمانا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطبہ پر انصار چیخ اٹھے کہ:

"ہمیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درکار ہیں۔"

فرطِ گریہ سے انصار کی داڑھیاں بھیگ گئیں اور سب نے بیک آواز کہا:

"ہم اپنے حصہ پر راضی ہیں۔"

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جعرانہ ہی سے عمرہ ادا کرنے کے لیے احرام باندھ کر روانہ ہوئے اور ۶۔ ذیقعدہ ۸ھ ہجری کو عمرہ ادا کیا۔

پھر آپؐ نے عتابؓ بن   کو مکہ کا عامل اور معاذؓ بن جبل کو معلمِ دین بنایا اور خود انصار اور مہاجرین کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے۔ آپؐ ۲۴۔ ذیقعدہ ۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۶۳۰ء کو مدینہ منورہ واپس پہنچے۔

حضورؐ نے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اس میں یہ بھی فرمایا تھا کہ:

"میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا!"

حضورؐ کے اس جملہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب آپؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو انصارِ مدینہ نے آپؐ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انصارِ مدینہ نے مہاجرین کی دامے درمے سخنے مدد کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مہاجرین کو اپنی نصف ملکیت کا مالک بنایا۔

روایت ہے کہ اس موقع پر کسی انصاری نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ:

"تاہم لوگوں نے مصیبت کے وقت آپؐ کی ہر طرح مدد کی ہے مگر جب یہ مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے تو آپؐ پھر مکہ واپس چلے جائیں گے اور ہمیں بھول جائیں گے"۔

اس پر حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انصار پر واضح کر دیا تھا کہ ان کی خدمات کو وہ کبھی نہ بھلائیں گے اور حالات خواہ کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں مگر آپؐ مکہ واپس نہیں جائیں گے اور انتقال کے بعد آپؐ اپنا مدفن بھی مدینہ ہی میں بنانے کی وصیت کرتے ہیں۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ کھلا وعدہ فرما لیا تھا اس لیے آپؐ مکہ صرف کسی ضرورت کے وقت جاتے تھے اور آپؐ نے اپنی تمام عمر مدینہ ہی میں گزاری۔

فتح مکہ کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدینہ واپسی بھی دیدنی تھی۔

جس وقت آپؐ دس ہزار فرزندانِ اسلام کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے تھے تو لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے اور بہت کم لوگوں کو اس بات کی امید تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکہ پر پہلی ہی یلغار میں فتح حاصل کر لیں گے لیکن اللہ کی مدد نے یہ معجزہ بھی دکھا دیا اور مشرکینِ مکہ کی عظمت و اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

کون یقین کر سکتا تھا کہ وہ ابوسفیان جو دو بار مدینہ پر حملہ آور ہوا تھا حضورؐ سے معافی مانگے گا اور مسلمان ہو کر رسولِ خداؐ کی پناہ میں آ جائے گا۔

پس — اس فاتح لشکر کا مدینہ میں بھی استقبال بڑا شاندار ہوا۔

حضورؐ اگرچہ بے جا شان و شوکت کو پسند نہ فرماتے تھے لیکن اہلِ مدینہ تھے کہ فاتح لشکر کے آگے اپنی آنکھیں بچھا رہے تھے۔

پورے مدینہ میں محرابیں لگائی گئی تھیں اور جگہ جگہ چراغاں ہو رہا تھا۔ یوں تو لشکرِ اسلام کی مدینہ واپسی کا ہر ایک کو انتظار تھا مگر نوضا اور اس کے والدین جس بے چینی سے لشکرِ اسلام جس میں ان کا ہونے والا داماد ابنِ حاتم شامل تھا، کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے، اس کا ذکر الفاظ میں ممکن نہیں۔

فاتح لشکر کی واپسی کے دن کا اعلان ہو چکا تھا۔ پورا مدینہ سرحد پہ پہنچ گیا تھا۔ نوضا اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ ایک رات پہلے ہی مکہ سے آنے والی سڑک پر بہت دور آگے پہنچ گئی تھی۔

لشکر جب مدینہ کی سرحد پر پہنچا تو لشکریوں کی آنکھیں اپنے عزیز و اقارب کو اور عزیز و احباب کی نظریں اپنے مجاہد بھائی، بیٹوں اور دوستوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

حضورِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اعلان فرما دیا تھا کہ لشکرِ اسلام مدینہ میں داخل ہونے کے بعد مجاہدین اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں، وہ اس وقت تک آرام کر سکتے ہیں جب تک انہیں کسی دوسری جنگ کے لیے طلب نہ کیا جائے۔

خالدؓ بن ولید کا دستہ ہمیشہ مقدمۃ الجیش ہوا کرتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ فوج کا دایاں بازو میمنہ یا یمین کہلاتا ہے اور بائیں بازو کو میسرہ یا یسار کے نام سے پکارتے ہیں۔ درمیان کی فوج جس میں عام طور پر سپہ سالارِ فوج یا بادشاہ ہوا کرتا ہے اسے قلب کہا جاتا تھا۔

ان تین فوجوں کے علاوہ ایک فوج جو ہراول یا مقدمۃ الجیش کہلاتی تھی، دراصل ایک ہلکا پھلکا مگر بے حد بہادر دستۂ فوج ہوتا تھا جس کا کام لشکر کے آگے آگے چلنا ہوتا تھا۔ اس کے ذمے دشمن کا پتہ لگانا، لشکر کے لیے راستہ صاف کرنا اور غیر متوقع حملہ کو روکنا ہوتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سیف اللہ خالدؓ بن ولید کو اسی ہراول دستہ کا سردار مقرر فرمایا تھا اور خالدؓ نے خود اپنی مرضی سے اس دستہ کے لیے بنو سلیم کے ایک سو سوار منتخب کیے تھے۔ ان سواروں میں ایک سو ایک کا نمبر ابنِ حاتم کا تھا جسے خالدؓ نے بطورِ خاص اپنے ساتھ رکھا تھا۔

ابنِ حاتم نوضا اور اپنے خالو اور خالہ سے ملنے کے لیے اس قدر بے چین تھا کہ اس کا گھوڑا بار بار صف سے بڑھ کر سردار خالدؓ بن ولید کے گھوڑے کے برابر پہنچ جاتا تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ ابنِ حاتم نے اپنے سسرال والوں سے قسم کھائی ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد اپنی دلہن کو بیاہ کے لائے گا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے جب ابنِ حاتم کو بہت زیادہ بے چین دیکھا تو اسے اجازت دے دی کہ وہ صف توڑ کے آگے جا سکتا ہے۔

ابنِ حاتم تو ہراول دستے میں پہلے ہی سب سے آگے تھا۔ اب جو اسے صف سے آگے جانے کی اجازت ملی تو اس نے گھوڑے کو ایڑ دی اور گھوڑا ہوا میں اڑتا ہوا دم کے دم میں سب سے پہلے مدینہ کی سرحد پر پہنچ گیا۔

نوضا نے اسے آتے دیکھ لیا۔ اس نے ماں باپ کو بھی بتا دیا جو بڑی مسرت اور دلچسپی سے ابنِ حاتم کو آتا دیکھ رہے تھے۔

ابنِ حاتم کی نظر ان پر پڑی تو گھوڑے سے کود کر بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا۔

"السلام علیکم خالو جان۔ سلام خالہ جان"۔ ابنِ حاتم نے دونوں کو ایک ہی سانس میں سلام کیا پھر نظریں نوضا پر جما دیں۔

نوضا نے اسے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر ہاتھ ماتھے کے قریب جا کر رک گیا اور اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

خالو اور خالہ نے ابنِ حاتم کو دعائیں دیں مگر اس کی نظریں تو نوضا کے چہرے پر اٹک کے رہ گئی تھیں جو تصویر بنی کھڑی تھی۔

"نوضا! کیسی ہو؟" ابنِ حاتم نے اسے چھیڑا۔

نوضا چونک پڑی۔

"اچھی ہوں"۔

نوضا اور کچھ نہ کہہ سکی۔

بوڑھے خالو نے دیکھا کہ سرِ راہ کھڑے ہو کر باتیں کرنا کہیں تماشہ نہ بن جائے۔ انہوں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا:

"چلو بیٹے حاتم! گھر بیٹھ کے اطمینان سے باتیں کریں گے"۔

"چلیے خالو جان"۔ اسے بھی جیسے ہوش آ گیا۔

گھر پہنچ کے خالو نے بغیر کسی تمہید کے ابنِ حاتم سے کہا:

"بیٹا۔ اب اپنا وعدہ پورا کرو"۔

"وعدہ!"

ابنِ حاتم نے چونک کے انہیں دیکھا:

"آپ کا مطلب شاید شادی سے ہے۔"

"ہاں بیٹے!"

خالو نے اثبات میں سر ہلا کر کہا:

"میرے بوڑھے کاندھے اب اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکتے"۔

"اب میں اس بوجھ کو سنبھالوں گا"۔

ابنِ حاتم نے کہا: "میں اسی لیے آیا ہوں"۔

بڑے میاں نے بڑی بی کو اور انہوں نے نوضا کو ابنِ حاتم کے جواب سے آگاہ کر دیا۔ وہ سب خوش ہو گئے۔ گھر میں جیسے بہار آ گئی۔

نہ کوئی انتظام کرنا تھا اور نہ کسی سے پوچھنا تھا۔ جمعرات کا دن شادی کے لیے مقرر ہوا۔ یہ دن خالہ نے منتخب کیا تھا اور ابنِ حاتم نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

ابنِ حاتم دن بھر ان سب سے باتیں کرتا رہا۔ اسے کہیں جانا آنا تو تھا نہیں۔ یار دوست سب چھوٹ چکے تھے۔

شام ہوئی تو ابنِ حاتم کی طبیعت کچھ سست ہو گئی۔ خالو نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اسے تیز بخار ہے۔

"ابنِ حاتم! تمہیں تو سخت بخار ہے"۔

انہوں نے چونک کے کہا:

"کپڑے بدل کر تھوڑی دیر کو سو جاؤ"۔

ابنِ حاتم کو واقعی آرام کی ضرورت تھی۔ سفر کی تکان سے وہ بے حال ہو رہا تھا مگر خالو اور خالہ اس کے سامنے تھے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جب سے ابنِ حاتم گھر میں داخل ہوا تھا نوضا ایک لمحے کے لیے بھی اس کے سامنے سے نہ ہٹی تھی۔ اس کا جسم اگرچہ تھکن سے چور تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا مگر اس کی باتیں ختم نہ ہوتی تھیں۔

خالو کے آرام کرنے کے مشورے پر اس نے ہنس کر کہا:

"خالو جان۔ مجھے بخار وخار کچھ نہیں ہے۔ سفر کی وجہ سے ذرا تھکان ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا"۔

"نہیں بیٹے۔ تھکن سے اتنا تیز بخار نہیں ہو سکتا"۔

خالو نے سمجھایا:

"تم آرام کرو۔ میں طبیب کو لے کر آتا ہوں۔ دوا کی دو ایک خوراکیں لے لوگے تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے"۔

ابنِ حاتم انہیں روکنے کے لیے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مکہ اور مدینہ منورہ کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۲۰ میل ہے۔ پھر گھوڑوں پر سفر۔ امن کا زمانہ تھا اس لیے رفتار بھی کم رکھی گئی تھی۔ لشکرِ اسلام دس دن تک سفر کرنے کے بعد مدینہ پہنچا تھا۔

ابنِ حاتم کے کپڑے میلے چکٹ ہو گئے تھے۔ اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ کم از کم کپڑے بدل کر لے۔ اس نے آنے کے بعد سے اب تک سر سے پگڑی بھی نہیں اتاری تھی۔

ابنِ حاتم نے چاہا کہ پگڑی سر سے اتارے۔ جب وہ پگڑی اتارنے لگا تو پگڑی کا ایک سرا اس کے سر سے اٹک گیا۔

اس نے جھٹکا دے کر سرے کو کھینچا تو اسے شدید تکلیف ہوئی۔ تب اسے یاد آیا کہ غزوۂ حنین میں اسے سر پر ایک زخم آیا تھا۔ اس نے مرہم پٹی تو کرا لی تھی مگر زخم کی دیکھ بھال نہ کی تھی جس کے نتیجے میں زخم خراب ہو گیا تھا۔

نوضا نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا:

"یہ سر میں کیا ہوا ہے؟"

"غزوۂ حنین میں ایک معمولی سا زخم لگا تھا۔"

ابنِ حاتم کو بتانا پڑا۔

"شاید وہ پک گیا تھا اور پگڑی کا سرا اس میں چپک گیا ہے۔"

بڑی بی قریب ہی بیٹھی تھیں۔ زخم کا سن کر ابنِ حاتم کی طرف جھک گئیں:

"لاؤ، میں دیکھوں۔ کیسا زخم ہے؟"

ابنِ حاتم نے سر پرے کر لیا کہ کہیں بڑی بی کپڑا نہ کھینچ لیں۔ اس نے کہا:

"آپ پانی گرم کر دیں۔ میں زخم خود صاف کر لوں گا۔"

پھر اس نے کپڑے کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو تھوڑی سی تکلیف کے بعد زخم سے الگ ہو گیا۔ اب زخم صاف نظر آ رہا تھا۔

بڑی بی اور نوضا نے زخم دیکھا تو گھبرا گئیں۔

"ہائے اللہ!"

نوضا کے لبوں سے نکلا:

"یہ تو بہت گہرا زخم ہے۔"

اسی وقت بڑے میاں طبیب کو ساتھ لے کر گھر میں داخل ہوئے۔ بڑی بی نے وہیں سے آواز لگائی:

"ابنِ حاتم کے سر میں بڑا گہرا زخم ہے۔ کسی جراح کو بھی لے آیئے۔"

طبیب اور بڑے میاں قریب آ گئے تھے۔ طبیب نے زخم کا معائنہ کیا۔ پھر نبض دیکھی اور نسخہ لکھ کر کہا:

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ تھکن اور زخم کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ جراح کو بلا کر فوراً پٹی تبدیل کرا دیجیے۔"

طبیب کے کہنے پر سب کو اطمینان ہوا۔ بڑے میاں ان کے ساتھ ہی دوا لینے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو جراح ان کے ساتھ تھا۔

جراح نے زخم صاف کیا اور مرہم لگا کر دوسری پٹی باندھ دی۔ وہ فارغ ہو کر جانے لگا تو خالہ نے اس سے پوچھا:

"زخم بھرنے میں کتنے دن لگیں گے میرے بھائی؟"

"دن نہیں کئی مہینے لگیں گے۔"

جراح نے رک کر جواب دیا:

"تلوار کا زخم ہے۔ دو انچ لمبا اور آدھا انچ گہرا۔ انہیں ہلنے جلنے نہ دیجیے گا بالکل ورنہ زخم اور خراب ہو جائے گا۔"

بڑی بی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ جراح دروازے سے نکلنے لگا تو لپک کے اس کے پاس پہنچیں۔

"بھائی ذرا ٹھہرو۔ تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

جراح رک گیا:

"جی۔ فرمایئے۔"

بڑی بی اسے دوسرے کمرے میں لے آئیں۔ بڑے میاں بھی وہیں آ گئے۔ بڑی بی نے جراح سے سوال کیا:

"بھائی ذرا سوچ کے بتاؤ کہ لڑکے کا زخم کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟"

جراح نے جواب دیا:

"اماں میں کہہ چکا ہوں کہ ایک مہینہ سے زیادہ ہی لگے گا زخم بھرنے میں"۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" بڑی بی نے گھبراہٹ میں بڑے میاں سے کہنے کے بجائے جراح سے کہہ دیا۔

"اماں۔ ہو گا کچھ نہیں"۔

جراح گھبرا گیا اور بولا:

"زخم بھر جائے گا۔ بس ذرا صبر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ انہیں چلنے پھرنے نہ دیجیے گا"۔

بڑی بی کو اب اپنی بدحواسی کا احساس ہوا۔ انہوں نے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"بھائی۔ یہ سوال میں نے تم سے نہیں بلکہ ان سے کیا تھا"۔

جراح پھر دروازے کی طرف چلا:

"تو پھر مجھے اجازت ہے"۔

"نہیں بھائی۔ تم ابھی ٹھہرو"۔

بڑی بی جلدی سے بولیں:

"تمہارے بغیر تو کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا"۔

جراح کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ سر ہلاتا واپس آ کر بیٹھ گیا۔

"بتائیے۔ اب کیا ہوگا؟"

بڑی بی نے شوہر سے کہا:

"یہ بھائی تو کہتے ہیں کہ زخم بھرنے میں مہینوں لگیں گے۔ اب ہم کیا کریں!"

بڑے میاں بولے:

"تم نے انہیں اپنی مجبوری بھی بتائی ہے یا نہیں؟"

"اے لو۔ میں کیا بتاتی"۔

بڑی بی جھلا کے بولیں:

"آپ کے سامنے ہی تو بات ہو رہی ہے۔ آپ ہی بتا دیں!"

"بھائی میاں"۔

بڑے میاں رخ موڑ کے جراح سے بولے:

"بات دراصل یہ ہے کہ یہ زخمی جوان میرا بھانجا ابنِ حاتم ہے۔ ہم نے اپنی بیٹی کی بچپن ہی میں اس سے کر۔۔۔۔۔"

"میں کہتی ہوں اس تفصیل کی کیا ضرورت ہے؟"

بڑی بی نے ان کی بات کاٹ دی:

"شادی کی تاریخ بتاؤ ان بھائی کو"۔

"ہاں ہاں۔ وہی بتا رہا ہوں"۔

بڑے میاں جواب دے کے پھر جراح سے مخاطب ہوئے:

"یہ آج ہی لشکرِ اسلام کے ساتھ گھر سے لوٹا ہے۔ ہم نے جمعرات کو اس کی شادی کی تاریخ رکھی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ زخم بھرنے میں مہینہ بھر لگے گا۔ اب بتاؤ۔ یہ بات کیسے بنے گی؟"

جراح چڑ کر بولا:

"آپ نے تاریخ مقرر کرنے سے پہلے ان کا زخم دیکھا تھا؟"

"نہیں بھائی"۔

بڑے میاں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"نہ ہم نے زخم دیکھا نہ اسی نے بتایا تھا کہ اس کے سر پر کوئی زخم ہے"۔

"میں جا رہا ہوں"۔

جراح کھڑا ہو گیا:

"جو مجھے کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔ آپ براہِ کرم حکیم صاحب سے اس سلسلے میں ضرور مشورہ کر لیجیے گا۔ اور سن لیجیے کہ اگر اس حالت میں آپ نے ان کی شادی کر دی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے"۔

یہ کہتا ہوا جراح باہر چلا گیا۔

بڑے میاں اور بڑی بی سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

اسی وقت نوضا گھبرائی ہوئی کمرے میں آئی:

"وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ ابنِ حاتم بول نہیں رہے۔ وہ ۔۔۔ بے ہوش ہو گئے ہیں"۔

دونوں میاں بیوی اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے میاں نے دونوں سے کہا:

"تم دونوں اس کے پاس چلو۔ میں حکیم کو لے کر آتا ہوں"۔

ذرا دیر بعد حکیم صاحب آ گئے۔ انہوں نے ابنِ حاتم کی نبض دیکھی۔ آنکھیں دیکھیں۔ سینے پر ہاتھ

دکھا، پھر بولے:

"بخار کی غفلت ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جلد ہوش آجائے گا۔"

بڑی بی نے میاں کی طرف دیکھا:

"کوئی اور بات کی تھی آپ نے حکیم صاحب سے!"

"نہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا میں نے۔"

بڑے میاں نے جواب دیا:

"میں تو یہ کہہ کے حکیم صاحب کو لایا ہوں کہ بیٹے حاتم کی طبیعت اچانک زیادہ بگڑ گئی ہے۔"

"اچھا۔ تو آپ ان کو سب کچھ بتائیے اور مشورہ کیجیے۔" بڑی بی نے نوضا کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"حکیم صاحب!"

بڑے میاں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا:

"دراصل بات یہ ہے کہ یہ بچہ میرا بھانجا ہے۔ میری بیٹی کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ طے یہ تھا کہ فتح مکہ کے بعد نکاح اور رخصتی ہوگی۔ چنانچہ یہ آج ہی مکہ سے واپس آیا ہے اور آتے ہی بیمار پڑ گیا ہے ـــ"

"دیکھیے جناب!"

حکیم صاحب بات کاٹ کے منہ بناتے ہوئے بولے:

"مجھے شادی کی کہانی سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی تشخیص بیان کر چکا ہوں۔ مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔ مطب پر مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"جی میں آپ کو روک نہیں رہا ہوں۔"

بڑے میاں کھسیا کر بولے:

"جراح آیا تھا۔ اس نے زخم دیکھ کے کہا ہے کہ اگر ان کی اس حالت میں شادی کی گئی تو غضب ہو جائے گا۔"

"آپ کیسی فضول باتیں کر رہے ہیں!"

حکیم صاحب غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے:

"جراح نے زخم دیکھ کر ہی آپ کو مشورہ دیا ہوگا۔"

"جی ہاں۔"

بڑے میاں نے تصدیق کی:

"اس نے زخم دیکھا تھا۔ پھر مشورہ دیا تھا۔"

"تو پھر اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ ـــ"

حکیم صاحب نے پھر بات کاٹ دی:

"بات دراصل یہ ہے کہ آپ بہت وہمی ہیں اور وہم کا علاج تو کسی لقمان کے پاس بھی نہیں تھا پھر میں کیسے آپ کا وہم دور کر سکتا ہوں۔ جراح نے جو کہا ہے وہ درست ہے۔ آپ اس کی بات پہ عمل کریں۔"

حکیم صاحب بڑبڑاتے ہوئے واپس ہو گئے۔ نوضا اور بڑی بی بڑے میاں کے پاس آگئیں تو وہ بولے:

"حکیم صاحب بھی کہہ گئے ہیں کہ جب تک زخم نہ بھر جائیں اس وقت تک ابنِ حاتم کی شادی نہ کی جائے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

اس وقت بڑے میاں نے بڑی عقلمندی کی۔ انہوں نے ایسی بات کہی کہ بڑی بی اور نوضا کوئی جرح نہ کر سکیں بلکہ ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے نوضا نے کہا:

"ابا جان۔ حکیم صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ شادی کی ابھی کیا جلدی ہے۔ آپ ان کا علاج کیجیے۔ یہ اچھے ہو جائیں تو پھر جو چاہے کیجیے گا۔"

اس طرح شادی کی بات ٹھنڈی پڑ گئی اور تمام گھر ابنِ حاتم کے علاج معالجے میں لگ گیا۔

ایک ہفتے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

بڑی بی نے دروازہ کھولا تو ان کے سامنے ابنِ حاتم کے تینوں ماتحت، جو اس کے دوست بھی تھے، موجود تھے۔

بڑی بی نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ نوضا اور ابنِ حاتم کی منگنی میں یہی تینوں دوست ہی تو شریک

ہوئے تھے۔

بڑی بی تینوں دوستوں کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں ابن حاتم بیمار پڑا تھا۔ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے بڑی بی کو دیکھا۔

بڑی بی نے انہیں بتایا:

"میرے بچو، ابن حاتم جس دن سے آیا ہے اسی حال میں پڑا ہے۔ غزوہ حنین میں اس کے سر میں کوئی زخم آیا تھا۔ جراح [redacted] زخم کی دیکھ بھال نہیں کی گئی اس لیے خراب ہو گیا ہے۔ حکیم اور جراح دونوں علاج کر رہے [redacted] پر بے ہوشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ پہلے تو یہ چار چار گھنٹے بے ہوش رہتا تھا۔ اب کچھ فر[redacted] ہے مگر بے حد کمزور ہو گیا ہے۔"

ابن حاتم کے دوستوں کو بے حد افسوس ہوا۔ ایک نے پوچھا:

"ابن حاتم نے شادی کر لی کیا؟"

"نہیں بیٹے!"

بڑی بی نے نفی میں سر ہلایا:

"شادی کی تاریخ تو پہلے ہی دن مقرر ہو گئی تھی مگر اسی دن یہ راز کھلا کہ ابن حاتم زخمی ہے اور زخم بھی ایسا کہ ابھی تک کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بڑی بی نے دریافت کیا:

"کیا تم لوگ ابن حاتم کے ساتھ فتح مکہ میں شامل نہیں تھے؟"

"ایسی بات نہیں ہے اماں!"

ایک نے وضاحت کی:

"مکہ تک تو ہم سب ساتھ تھے مگر وہاں پہنچ کے ہمیں دوسرے دستوں میں بھیج دیا گیا۔ ابن حاتم کو سردار خالدؓ بن ولید نے اپنے دستے میں شامل کر لیا تھا اس لیے ہماری پھر وہاں ملاقات نہ ہو سکی۔ ہم لوگ کل ہی مکہ سے واپس آئے ہیں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ابن حاتم اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ بس ہم ادھر آ گئے۔"

ابن حاتم کے دوست گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کے واپس چلے گئے اور پھر آنے کا کہہ گئے۔ ابن حاتم پر اس دوران بے ہوشی طاری رہی۔

ابن حاتم کا زخم بہت آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ اس لحاظ سے اس کے بدن میں طاقت آ رہی تھی۔

غفلت اور بے ہوشی کا وقت اب کم ہو گیا تھا مگر یہ عجب اتفاق تھا کہ اس کے دوست جب بھی اسے دیکھنے آئے انہوں نے ابن حاتم کو بے ہوش ہی پایا۔

اسی طرح ابن حاتم کا زخم مندمل ہونے میں دو طویل مہینے لگ گئے۔ اب وہ تقریباً تندرست ہو گیا اور اسے چلنے پھرنے کی اجازت بھی مل گئی۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ اللہ نے اس کے زخم کی آخری پٹی بھی اتروا [redacted] ابن حاتم کے غسل صحت کا دن تھا۔

نوضا کے اصرار پر اس کے والدین نے غسل صحت کی ایک مختصر [redacted] منعقد کی جس میں محلے کے چند معززین اور بزرگوں کو مدعو کیا گیا۔ بڑے میاں نے کئی کھانوں کے [redacted] اب کے خاص ڈش "ثرید" کا بھی اہتمام کیا تھا۔

ابن حاتم کی خوش قسمتی کہ اس تقریب کے موقع پر اس کے تینوں دوست بھی آ گئے۔ اس کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔

یہ ضیافت دوپہر کی تھی۔ کھانے کے بعد بڑے میاں نے محفل میں شریک ہونے والے اصحاب کو یہ مژدہ سنایا کہ ان کی اکلوتی بیٹی نوضا کی شادی ان کے بھانجے ابن حاتم کے ساتھ جمعرات کے دن ہوگی۔ جمعرات کو صرف دو دن باقی تھے اس لیے بڑے میاں نے اس دعوت میں موجود لوگوں کو شادی پر بھی مدعو کر دیا اور یہ تاکید کی کہ وہ خواتین کو بھی شادی میں شرکت کے لیے بھیجیں۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد دوستوں نے گپ شپ شروع کر دی جو بعد مغرب تک جاری رہی۔

جس طرح ابن حاتم نے اپنی شادی کو فتح مکہ سے مشروط کیا تھا۔ اسی طرح اس کے ایک دوست نے بھی ایسی ہی قسم کھائی تھی اور مکہ سے واپس آتے ہی اس نے شادی کر لی تھی جبکہ ابن حاتم کی شادی سر کے زخم کی وجہ سے ملتوی رہی تھی۔

جب دوست واپس جانے لگے تو اک دم ابن حاتم کو خیال آیا۔ اس نے پوچھا:

"کسی طرف جہاد پر جانے کا حکم تو نہیں ہوا؟"

ایک دوست نے جواب دیا:

"کہیں جانے کا حکم تو نہیں ہوا مگر مجاہدین کو جمع ہونے کا حکم دے دیا گیا ہے۔"

ابن حاتم نے سوچتے ہوئے کہا:

"اگر مجاہدین کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی جنگ ضرور ہونے والی ہے"۔

دوسرے دوست نے جواب دیا:

"سردار ابنِ حاتم! میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں نے یہ افواہ سنی ہے کہ قبیلہ بنو مصطلق کے پاس [illegible]ت کے لیے ایک وفد بھیجا گیا تھا مگر انہوں نے زکات دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میرا خیال [illegible] جنگ ضرور ہوگی"۔

اس پر پہلے [illegible]

"سردار۔ آپ کیو[illegible]ے ہیں۔ دو دن کے بعد تو آپ کی شادی ہو ہی جائے گی"۔

"وہ تو ٹھیک ہے"۔

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"مگر مجھے شادی سے زیادہ جہاد پہ جانے کی فکر ہے۔ شادی جہاں اتنے دن ملتوی ہوتی رہی ہے اب پھر ملتوی ہو سکتی ہے لیکن جہاد تو نہیں روکا جا سکتا۔

میں یوں بھی بستر پر پڑے پڑے تنگ آ گیا ہوں۔ جنگ پر جاؤں گا تو ذرا ہاتھ پیر کھل جائیں گے اور ثواب الگ ملے گا"۔

پھر تینوں دوست ابن حاتم کے گھر سے رخصت ہو گئے!





قبیلہ بنو مصطلق کا ایک وفد سنہ ہجری میں دربارِ رسالت میں حاضر ہوا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دستِ مبارک پہ اسلام قبول کیا تھا۔

وفد کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ زکات کی سالانہ ادائیگی لازمی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کوتاہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

اس واقعہ کو دو سال ہونے کو آئے تھے مگر بنو مصطلق کی طرف سے زکات کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی

زکات کی وصولی اور ادائیگی کے لیے اسلام میں بہت سخت احکامات ہیں اس لیے اہلِ مدینہ کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ بنو مصطلق کے خلاف ضرور فوجی کارروائی ہوگی۔

اس خیال نے ایک افواہ کی صورت اختیار کر لی اور ہر طرف یہ چرچا ہونے لگا کہ بنو مصطلق کے خلاف جہاد ہونے والا ہے۔

جب ابنِ حاتم اور اس کے دوستوں میں شادی کے سلسلے میں گفتگو ہوئی تھی تو اس کے ایک دوست نے کہہ دیا تھا:

"جہاد شروع ہونے والا ہے"۔

دوستوں کے جانے کے بعد ابنِ حاتم تمام رات بے چین رہا۔ اسے نوشابہ سے محبت تھی اور وہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ زخمی نہ ہوا ہوتا تو اب تک اس کی شادی نوشابہ سے ہو چکی ہوتی لیکن "جہاد" کے ذکر نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی وہ اپنے سردار خالدؓ بن ولید کے پاس

جا پہنچا۔

جنابِ خالدؓ نے اس کا حال پوچھا اور ابنِ حاتم نے اعلان کیا کہ:

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور جہاد پہ جانے کو تیار رہوں"۔

"کیا کہہ رہے ہو ابنِ حاتم؟"

حضرت خالدؓ نے اسے حیران نظروں سے دیکھا:

"کہاں جہا کس جہاد پہ جانے کے لیے تیار ہو؟"

سردارِ معظ

ابنِ حاتم نے ...ب دیا:

"میں نے سنا ہے کہ بنو مصطلق نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا ہے اور اس کے خلاف فوجی کاروائی ہونے والی ہے"۔

"یہ بالکل غلط ہے ابنِ حاتم!"

خالدؓ بن ولید نے تردید کی:

"بات صرف اتنی ہے کہ بنو مصطلق نے زکات ادا نہیں کی ہے اور ان سے جواب طلب کیے جانے کا امکان ہے۔ جہاد کا اس سے کیا تعلق۔

ابھی تو دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے بنو مصطلق کی طرف ایک وفد روانہ کیا جائے گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ زکات ادا نہ کرنے کی کیا وجوہات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ قبیلہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور زکات ادا نہ کرنے کا جواز موجود ہو"۔

"میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں"۔

ابنِ حاتم نے شرمساری سے کہا:

"یقیناً یہی بات ہوگی جو آپ نے فرمائی ہے اور لوگوں نے اسے خواہ مخواہ افواہ میں تبدیل کر دیا ہے"۔

پھر جنابِ خالدؓ نے مسکراتے ہوئے دریافت فرمایا:

"تمہاری شادی کا کیا بنا ابنِ حاتم؟"

"شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے سردارِ معظم"۔

ابنِ حاتم نے سر جھکا کر کہا:

"مگر جہاد کی بات سن کے میں رہ نہ سکا اور آپ کے پاس چلا آیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر جہاد شروع ہونے والا ہے تو میں شادی کی تاریخ تبدیل کرا دوں گا۔ میرے لیے جہاد، شادی سے کہیں زیادہ افضل ہے"۔

"شاباش ابنِ حاتم!"

خالدؓ خوش ہو کے بولے:

"لشکرِ اسلام کو تم جیسے پُرجوش جوانوں ہی کی ضرورت ہے۔ مطمئن دی کر دو۔ جہاد شروع ہوا تو تمہیں ضرور خبر دی جائے گی"۔

ابنِ حاتم کا ذہن بالکل صاف ہو گیا۔

واپس آتے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ وہ شادی کے لیے پوری طرح تیار ہے مگر یہ شادی بالکل سادگی سے ہوگی۔

خالہ اور خالو کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ابنِ حاتم اور نوضا کی شادی بالکل سادہ طریقے سے ہوئی جس میں ابنِ حاتم کے تینوں دوستوں کے علاوہ محلہ کے چند بزرگ شامل ہوئے۔ نہ بارات چڑھنا تھی اور نہ نوضا کو رخصت ہو کے کہیں جانا تھا۔

نوضا کے گھر میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں اسے دلہن بنا کر بٹھایا گیا اور عقد کے بعد اسے رخصت کر کے دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس شادی کی خوشی جس قدر ابنِ حاتم کو تھی اس سے کہیں زیادہ نوضا خوش تھی۔ اس کی امیدیں اور آرزوئیں کئی بار ٹوٹی اور جڑی تھیں۔

ابنِ حاتم نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر پہلا جملہ یہ کہا:

"نوضا۔ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو —"

"ایسا نہ کہیے میرے سرتاج!"

نوضا نے فوراً اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نے اس وقت کے لیے نہ جانے کتنی دعائیں مانگی ہیں!"

ابنِ حاتم مسکرایا:

"اور وہ تمام دعائیں پوری ہوگئیں"۔

پھر ذرا رک کے اس نے کہا:

"نوضا۔ اب یہ دعا مانگو کہ کچھ دن ہم مدینہ میں اطمینان سے گزار سکیں"۔

"خیریت تو ہے"۔

نوضانے گھبرا کر پوچھا:

"اب تو ہماری شادی ہوگئی ۔ بے اطمینانی کس بات کی ہے؟"

"نوضا!"

ابنِ حاتم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"شاید تم نہیں جانتیں کہ مجاہد کو، بیوی سے بھی زیادہ ایک چیز عزیز ہوتی ہے!"

"میں جانتی ہوں ابنِ حاتم!"

نوضانے اس طرح کہا کہ وہ حیران رہ گیا۔

"کیا جانتی ہو تم؟"

"میں جانتی ہوں کہ مسلمان کو، بیوی، بچوں سے بھی بڑھ کر کیا چیز عزیز ہوتی ہے!"

"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں تم سے؟"

نوضانے اس سے آنکھیں چار کرتے ہوئے بڑے استقلال سے کہا:

"ہر مسلمان کو بیوی، بچوں سے زیادہ جہاد پر جانا عزیز ہوتا ہے"۔

"تم نے ٹھیک کہا نوضا!"

ابنِ حاتم کا دل کھل اٹھا:

"لیکن جہاد پہ جانے کی اس وقت زیادہ خوشی ہوتی ہے جب اس کی بیوی رخصت کے وقت آنسو بہانے کے بجائے اسے "فی امان اللہ" کہے"۔

"خوش نصیب ہے وہ عورت جس کا شوہر جہاد پر جائے"۔

نوضانے فوراً جواب دیا:

"یقین رکھو ابنِ حاتم! اللہ کرے تو وہ وقت تم بھی دیکھو گے جب تمہاری نوضا اپنے ہاتھوں سے تمہارے جسم پر ہتھیار سجائے گی اور تمہیں مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہے گی!"

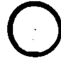
ابنِ حاتم نے فوراً اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور جذباتی لہجے میں کہا:

"مجھے خوشی ہے نوضا کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی ہے جو صحیح معنوں میں ایک مجاہد کی بیوی کہلانے کے لائق ہے۔ اب مجھے میدانِ جنگ میں کسی قسم کی بھی فکر نہ ہوگی اور میں پوری توجہ اور عزم سے اپنا فرض ادا کر سکوں گا"۔

رات بھیگتی چلی گئی۔

اور ــــ

ان کی باتیں بھی جذبات میں ڈوبتی چلی گئیں۔



ولیدؓ بن عقبہ بن ابی معیط کو دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حکم ہوا کہ وہ قبیلہ بنو مصطلق کے پاس دس سواروں کا ایک وفد لے کر جائے اور دریافت کرے کہ انہوں نے مقررہ زکات کی رقم کیوں نہیں بھجوائی؟

حکم پاتے ہی ولیدؓ بن عقبہ دس سواروں کے ساتھ بنو مصطلق کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں شناخت کے لیے اسلامی پرچم تھا۔

ولیدؓ، بنو مصطلق کی آبادی کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ آبادی سے تقریباً پچاس ساٹھ مسلح سوار نکلے اور تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

ولیدؓ بن عقبہ یہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ طلوعِ اسلام سے پہلے ولیدؓ کے قبیلے کی بنو مصطلق سے سخت دشمنی تھی اور آئے دن جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔

انہوں نے اس وقت بنو مصطلق کے اتنے زیادہ سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہیں خطرہ محسوس ہوا اور یہ گمان بھی پیدا ہوا کہ یہ لوگ ان سے اپنی پرانی دشمنی کی بنا پر جنگ کرنے کے لیے آرہے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی ولیدؓ نے اپنا گھوڑا روکا، یہ دیکھ کر ان کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی راسیں کھینچ لیں۔

ولید بن عقبہؓ نے کہا:

"آگے جانے کی ضرورت نہیں ۔ یہ لوگ مرتد ہو گئے اور جنگ کرنے آرہے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں میرے قبیلے اور بنو مصطلق میں دشمنی تھی۔ شاید وہ اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ ہم واپس جاکر دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حال بیان کریں گے"۔

ان کے ساتھیوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ولیدؓ بن عقبہ کے ساتھ ہی اپنے گھوڑے موڑے اور مدینہ کے رُخ پر چل پڑے۔

بنو مصطلق نے انہیں واپس ہوتے دیکھا تو ٹھہر گئے۔ پھر جدھر سے وہ آئے تھے اُدھر ہی کو لوٹ گئے۔

ولیدؓ نے مدینہ واپس پہنچ کے دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! بنو مصطلق مرتد ہو گئے!"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا:

"کیا انہوں نے زکات دینے سے انکار کر دیا۔ یا اسلام کے خلاف کوئی بات کی تھی؟"

"یا رسولؐ اللہ!"

ولیدؓ بن عقبہ نے جواب میں کہا:

"جب ہم ان کی آبادی کے قریب پہنچے تو بنو مصطلق کے پچاس ساٹھ آدمی مسلح ہو کر آبادی سے باہر نکل آئے۔ آپؐ نے ہمیں جنگ کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے ہم بغیر مقابلہ کیے واپس آگئے ہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ولیدؓ کی بات کچھ درست معلوم نہ ہوئی۔ آپؐ نے پھر تحقیق کی اور دوبارہ دریافت فرمایا:

"کیا انہوں نے زکات دینے سے انکار کر دیا؟ یا تم پر حملہ کر دیا تھا؟"

چونکہ ان میں سے ایک بات بھی نہ ہوئی تھی اس لیے ولیدؓ بن عقبہ نے وضاحت کی:

"یا رسولؐ اللہ! ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ انہوں نے حملہ بھی نہیں کیا مگر ان کے ارادے نیک نہ معلوم ہوتے تھے"۔

"یا رسولؐ اللہ!"

دربارِ رسالتؐ میں موجود ایک صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا:

"کسی زمانہ میں بنو مصطلق اور ولیدؓ بن عقبہ کے قبیلے میں دشمنی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ولیدؓ کے ساتھ کم سوار دیکھ کر حملہ کا ارادہ کیا ہو؟"

اس کی تائید ولیدؓ بن عقبہ نے بھی کی:

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ بات درست ہے۔ وہ مجھ سے جنگ کرنے ہی نکلے تھے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے خیال کی تائید نہ فرمائی بلکہ آپؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو ایک فوجی دستے کے ساتھ بنو مصطلق کی طرف بھیجا اور تاکید فرمائی:

"جلد بازی سے کام نہ لینا بلکہ اچھی طرح معلوم کرنا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ نماز ادا کرتے ہوں تو ان سے کسی تعرض کی ضرورت نہیں لیکن اگر انہوں نے نماز چھوڑ دی ہو تو پھر جو مناسب سمجھو وہ کرنا"۔

خالدؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم پا کر خیمہ گاہ میں واپس آئے اور سواروں کا انتخاب کیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ابنِ حاتم جس کی چند روز پہلے ہی شادی ہوئی ہے وہ اپنے گھر گیا ہوا ہے۔

جنابِ خالدؓ نے پہلے تو سوچا کہ اس مہم پہ ابنِ حاتم کو نہ لے جایا جائے بلکہ کچھ دن اسے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ گزارنے دیں مگر پھر انہیں دو دن پہلے کی بات یاد آئی کہ ابنِ حاتم ان کے پاس آیا تھا اور اس نے درخواست کی تھی کہ جب بھی جہاد ہو اُسے اس میں شرکت کا اعزاز بخشا جائے۔ یہ بات یاد آتے ہی انہوں نے ابنِ حاتم کو فوراً بلوا بھیجا۔

ابنِ حاتم کو جہاد پہ جانے کی اطلاع ملی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اس نے اندر جاکر نوضا کو خبر دی:

"سنتی ہو نوضا۔ ہمارے سردارِ معظم جناب خالدؓ بن ولید جہاد پہ تشریف لے جا رہے ہیں اور مجھے بھی بلوایا ہے"۔

نوضا کا دل دھک سے ہو گیا مگر وہ فوراً سنبھلی اور مسکرا کے بولی:

"مبارک ہو ابنِ حاتم۔ یہ اعزاز ہر ایک کو نہیں ملتا۔ مجھے تمہارے جہاد پہ جانے کی بے حد خوشی ہے"۔

"تو پھر دیر نہ کرو نوضا!"

ابنِ حاتم نے جلدی سے کہا:

"مجھے خوشی خوشی رخصت کرو"۔

نوضا کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے مگر اس نے ضبط کر کے کہا:

"ابنِ حاتم۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے شادی کی رات تم سے ایک بات کہی تھی!"

"بات کہی تھی!"

ابنِ حاتم سر پکڑ کے سوچنے لگا:

"یاد نہیں پڑتا، کیا بات کہی تھی تم نے!"

"میں نے کہا تھا۔"

نوضا نے بڑے تحمل سے کہا:

"کہ اگر جہاد کا موقع آیا تو میں تمہارے جسم پر اپنے ہاتھوں سے اسلحہ سجاؤں گی۔"

"تم بہت عظیم ہو نوضا!"

ابنِ حاتم مسرت بھرے جذبات سے جھوم اٹھا:

"بس دیر نہ کرو اور مجھے اسلحہ پہنا دو۔"

نوضا نے کانپتے ہاتھوں سے تلوار ابنِ حاتم کی کمر میں لٹکائی۔ ڈھال کاندھے پر چڑھائی اور ترکش پشت پر لگا کر کمان گلے میں ڈال دی۔ پھر نوضا اپنے چند دن کے دولہا کو اپنے ضعیف ماں باپ کے پاس لے گئی۔

"سنتے ہو بابا!"

نوضا نے باپ کو مخاطب کیا:

"ابنِ حاتم جہاد پر جا رہے ہیں۔"

ضعیف جسموں میں ایک لمحہ کے لیے رعشہ سا پیدا ہوا مگر دونوں فوراً ہی سنبھل گئے۔ باپ نے ابنِ حاتم کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی:

"جاؤ بیٹے! خدا تمہیں اسلام کی خدمت کے لیے زیادہ سے زیادہ دن زندہ رکھے۔ دشمن کا مقابلہ سینہ سامنے رکھ کر کرنا، پیٹھ نہ دکھانا۔"

بوڑھی خالہ نے ابنِ حاتم کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی اور بہ چشمِ نم رخصت کیا۔ اس کا بوڑھا دل لرز رہا تھا۔

ابنِ حاتم گھوڑے پر سوار ہوا تو نوضا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے فوراً منہ گھما لیا اور دو آنسو آنکھ سے گر کر زمین میں جذب ہو گئے۔

ابنِ حاتم دُور تک پلٹ پلٹ کے اسے دیکھتا رہا!

ابنِ حاتم خیمہ گاہ میں پہنچا تو سردار خالدؓ بن ولید کا رسالہ جانے کو تیار کھڑا تھا۔ انہوں نے ابنِ حاتم کو رسالہ میں شامل کیا اور روانہ ہو گئے۔

جب یہ رسالہ بنو مصطلق کی بستی کے قریب پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ جنابِ خالدؓ نے رات بستی سے باہر گزارنے کا حکم دیا۔

سواروں نے گھوڑے کھول دیے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی کے ساتھ رات بسر کرنے کے لیے زینیں بچھالیں۔

چوکی پہرہ درست کر دیا گیا اور خشک میوہ کھا کر اور چھاگلوں سے پانی پی کر تمام رسالے کے سوار آرام کرنے لگے۔

سردار خالدؓ بن ولید نے ابنِ حاتم کو بلوا کر کہا:

"ابنِ حاتم! تمہیں بڑی ہوشیاری سے بستی میں جانا ہے اور اچھی طرح معلوم کرنا ہے کہ بنو مصطلق مسلمان ہیں یا واقعی مرتد ہو گئے ہیں۔"

"سردارِ معظم!"

ابنِ حاتم نے سردار کے حکم پر سر جھکا کر کہا:

"خادم کو روانگی کی اجازت دیجیے۔"

"فی امان اللہ!"

جنابِ خالدؓ نے ابنِ حاتم کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اسے رخصت کر دیا۔

ابنِ حاتم نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا رخ بنو مصطلق کی بستی کی طرف کر دیا جو زیادہ دُور نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں پہنچ گیا۔

ابنِ حاتم بستی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر ایک بزرگ پر پڑی۔ ابنِ حاتم نے اس کے قریب پہنچ کے گھوڑا روکا۔

بزرگ گھوڑے کی ٹاپیں سن کر پہلے ہی رک گیا تھا۔

ابنِ حاتم نے گھوڑے سے اتر کر کہا:

"بزرگ محترم! کیا ایک مسافر کو بستی میں کچھ کھانے کو مل جائے گا۔"

بزرگ نے چاند کی ہلکی روشنی میں ابنِ حاتم کا چہرہ غور سے دیکھا اور کہا:

"اے جوان۔ اگر تم مسلمان ہو تو ہمارے بھائی ہو اور اگر بت پرست ہو تو بھی ہم وطن ہونے کی حیثیت سے

تمہارا ہم پر حق ہے۔
عرب قوم اپنی مہمان نوازی کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ میں تمہیں اپنا مہمان بنا کے بے حد خوشی محسوس کروں گا۔"

"بزرگ محترم!"

ابنِ حاتم نے نرمی سے کہا:

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ بنو مصطلق کی بستی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔"

بزرگ نے خوش ہو کر کہا:

"یہ بنو مصطلق ہی کی بستی ہے۔ ہمارا قبیلہ اسلام لانے سے پہلے بھی اپنی مہمان نوازی کے لیے عرب میں مشہور تھا اور اب تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے ہم لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اسلیے ہماری مہمان نوازی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔"

دونوں بزرگ کے مکان پہ یونہی باتیں کرتے ہوئے آن پہنچے۔ بزرگ نے دروازے پر سے ہی آواز دی:

"بیٹے حاتم۔ باہر آ کے دیکھو۔ مہمان آئے ہیں۔"

حاتم کے نام پر ابنِ حاتم چونکا۔

اسی وقت ایک جوان گھر سے برآمد ہوا۔

"یہ میرا بیٹا ہے، حاتم۔"

بزرگ نے تعارف کرایا:

"اور یہ مہمان ہیں"۔ اس نے بیٹے کو بتایا:

"ان کے بارے میں ابھی میں کچھ نہیں جانتا۔ اندر جا کے نشست کا اور اس کے بعد کھانے کا اہتمام کرو۔"

حاتم، ابنِ حاتم ہی کا ہم عمر تھا۔ اس نے مہمان پہ بڑی دلچسپی سے نظر ڈالی۔ پھر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے واپس آ کر کہا:

"اندر چلیے۔ سب انتظام ہو گیا ہے۔"

حاتم نے ابنِ حاتم کا گھوڑا سنبھال لیا اور وہ بزرگ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

چھوٹا سا گھر تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی مہمان خانہ (بیٹھک) تھا جہاں صاف ستھرا فرش بچھا تھا۔
ابنِ حاتم جا کے بیٹھ گیا۔

حاتم شاید کھانے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔

تنہائی ہوئی تو ابنِ حاتم نے کہا:

"محترم۔ آپ میرے بزرگ بھی ہیں اور میزبان بھی۔ ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں مگر خیال آتا ہے کہیں آپ کو ناگوار نہ گزرے۔"

"مہمانوں کی کسی بات کا برا نہیں مانا جاتا۔"

بزرگ نے جواب دیا۔

"جو پوچھنا ہے تم بلا تکلف پوچھ سکتے ہو۔"

ابنِ حاتم کو اطمینان ہوا۔

"بزرگ محترم!"

اس نے خوب جانچ تول کر سوال کیا:

"آپ فرماتے ہیں کہ بنو مصطلق مسلمان ہو گئے ہیں مگر مدینہ میں یہ بات مشہور ہے کہ بنو مصطلق مسلمان ہوئے مگر اب مرتد ہو گئے ہیں۔"

بزرگ کے چہرے پہ قدرے غصے کے آثار نمایاں ہوئے مگر انہوں نے مہمان کا ادب ملحوظ خاطر رکھا اور کہا:

"میرے نوجوان مہمان! ہمیں مرتد کہنا سراسر ہم سے زیادتی بلکہ ہماری توہین ہے۔ ہم جب سے مسلمان ہوئے ہیں تمام اسلامی احکامات بجا لاتے ہیں۔ ہم لوگ اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ پتہ نہیں کس دشمن نے ہمیں مرتد مشہور کیا ہے۔

اگر تم صبح تک ٹھہر سکو تو میں تمہیں اپنے سردار سے ملاؤں گا۔ اگر تم بھی مسلمان ہو تو ہمارے سردار سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"محترم!"

ابنِ حاتم نے خوشدلی سے کہا:

"مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ میں خود بھی مسلمان ہوں۔ آپ مجھے بھی اپنا بیٹا ہی سمجھیے۔ آپ کے بیٹے کا نام حاتم ہے اور میرا نام ابنِ حاتم ہے۔"

"واہ بھئی واہ!"

بزرگ خوش ہو کر بولے:

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ بے شک تم میرے بیٹے ہی ہو۔ اب میں تمہیں رات میں نہیں جانے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب!"

ابنِ حاتم نے بھی خوش دلی سے جواب دیا:

"میں رات میں نہیں جاؤں گا لیکن صبح مجھے بہت سویرے جانا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میں کل پھر آپ سے ملاقات کرنے آؤں۔"

بزرگ کی سمجھ میں ابنِ حاتم کی بات نہ آئی۔ انھوں نے کہا:

"ہاں ہاں بیٹے۔ تم جب چاہو آ سکتے ہو۔"

کھانے کے دوران بھی ان کی گفتگو جاری رہی۔

"بیٹے ابنِ حاتم!"

بزرگ نے دریافت کیا:

"اگر تم مناسب سمجھو تو اپنے قبیلے کا نام بتاؤ۔"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"میں یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میرا تعلق قبیلہ بنو غطفان سے ہے۔ میرے چچا نعیم بن مسعود اشجعی کا شمار قبیلہ کے رؤسا میں ہوتا ہے۔"

"سبحان اللہ۔"

بزرگ نے مسرت سے کہا:

"بنو غطفان تو عربوں کا بہت بڑا قبیلہ ہے۔ اچھا بیٹے ابنِ حاتم! یہ تو بتاؤ کہ تمہاری شادی ہو چکی یا ابھی اکیلے ہو؟"

"میری شادی صرف چند دن قبل ہوئی ہے۔"

ابنِ حاتم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"شادی قبیلے ہی میں ہوئی ہے مگر میں مکہ کے بجائے مدینہ میں رہتا ہوں۔"

"بہت خوب۔" بزرگ نے سر ہلا کر کہا۔

کھانے کے بعد ابنِ حاتم کے لیے بستر لگا دیا گیا۔ اس وقت بزرگ کا بیٹا حاتم بھی وہاں موجود تھا۔

ابنِ حاتم نے ہنس کے کہا:

"برادر۔ تمہارا نام حاتم اور میرا نام ابنِ حاتم ہے۔ اس لیے ہم تم ایک ہی ہوئے۔ اس وقت تو میں سونے والا ہوں۔ کل دن میں تم سے تفصیلی گفتگو ہوگی۔"

"کل ـــــ؟"

حاتم نے حیران ہو کے پوچھا:

"کیا آپ کل تک ٹھہریں گے؟"

"کل صبح سویرے چلا جاؤں گا۔"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"پھر دن میں واپس آ جاؤں گا۔"

اس کے بعد ابنِ حاتم نے بزرگ سے کہا:

"اگر یہاں صبح کی نماز ہوتی ہو تو مجھے اذان سے پہلے اٹھا دیجیے گا۔"

"میرا پورا قبیلہ نمازی ہے۔"

بزرگ نے بڑے فخر سے کہا:

"بے فکر ہو کے سو جاؤ۔ میں تمہیں اذان سے پہلے بیدار کر دوں گا۔"

حاتم کے والد نے ابنِ حاتم کو اذان سے پہلے جگا دیا۔ ابنِ حاتم ہاتھ منہ دھو کے تیار ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

"میں بہت جلد واپس آؤں گا محترم بزرگ!"

اس نے چلتے وقت کہا:

"مجھے آپ کے بیٹے حاتم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے کو ایڑ دی اور گھوڑا دوڑنے لگا۔

حضرت خالدؓ بن ولید بستی سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب ابنِ حاتم وہاں پہنچا تو

فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ یہ اذان بنو مصطلق کی بستی میں ہو رہی تھی اور آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

سپہ سالارِ لشکر کا خیمہ سامنے ہی ایستادہ تھا۔ ابنِ حاتم سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ حضرت خالدؓ بن ولید بیدار ہو چکے تھے۔

ابنِ حاتم نے سلام کے بعد عرض کیا:

"سردارِ محترم۔ آپ نے اذان کی آواز سنی؟"

"سنی ہے ابنِ حاتم!"

جنابِ خالدؓ نے جواب دیا:

"کہیں قریب ہی سے آ رہی ہے یہ آواز"۔

"سردارِ محترم!"

ابنِ حاتم نے مسرت کا اظہار کیا:

"یہ اذان بنو مصطلق کی بستی میں ہوئی ہے۔ الحمد للہ پوری بستی مسلمان ہے۔ میں نے اچھی طرح تصدیق کر لی ہے"۔

"شکر ہے خدا کا کہ اس نے خود ہی یہ مسئلہ کر دیا"۔

جنابِ خالدؓ نے بے ساختہ کہا:

"اب فجر کی نماز کے بعد تم کو پھر ان کی بستی میں جانا ہے اور ان کے سردار کو اطلاع دینا ہے کہ ہم اس سے ملاقات کو آ رہے ہیں"۔

ابنِ حاتم نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

جب اچھی طرح سویرا ہو گیا تو ابنِ حاتم گھوڑے پہ سوار ہو کے سیدھا انہی بزرگ کے مکان پہ پہنچا جہاں اس نے رات گزاری تھی۔ بزرگ کا بیٹا حاتم بھی وہیں تھا۔

"ابنِ حاتم!"

بزرگ نے حیرانی سے پوچھا:

"تمہیں اتنی جلدی واپس آنا تھا تو پھر جانے کی کیا عجلت تھی؟"

"بزرگ محترم!"

ابنِ حاتم نے مسکرا کر جواب دیا:

"مجھے اپنے مالک، آقا اور سالار کو ایک اہم خبر پہنچانا تھی۔ وہ میں نے پہنچا دی اور واپس چلا آیا"۔

"ابنِ حاتم!"

بزرگ کی حیرت دوچند ہو گئی:

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارا مالک کون ہے اور تم نے انہیں کیا خبر پہنچائی؟"

ابنِ حاتم سوچ میں پڑ گیا کہ انہیں پوری بات بتائے یا نہ بتائے۔ اسے فکرمند دیکھ کے باپ کے بجائے بیٹے یعنی حاتم نے کہا:

"میرے بھائی! آپ ابنِ حاتم اور میں حاتم ہوں۔ اگر آپ ابا جان کو نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتائیے مگر مجھے تو بتائیے کہ آپ کون ہیں اور آپ کے سپہ سالار کون ہیں اور اس وقت کہاں ہیں؟"

"بزرگ محترم اور میرے پیارے دوست!"

ابنِ حاتم نے جواب دیا:

"آپ مجھے اپنے قبیلہ کے سردار کے پاس لے چلیے۔ میں ان کے سامنے آپ کے سوالوں کا جواب بھی دوں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ گزشتہ رات میں یہاں کیوں آیا تھا؟"

ان دونوں کی حیرانی میں اور اضافہ ہو گیا مگر وہ مزید بحث کیے بغیر ابنِ حاتم کو اپنے قبیلہ کے سردار کے پاس لے گئے۔

بنو مصطلق کا سردار ادھیڑ عمر اور مضبوط جسم کا تھا۔ ابنِ حاتم نے اس کے سامنے جا کر کہا:

"السلام علیکم!"

اس نے خندہ روئی سے کہا:

"وعلیکم السلام"۔

"محترم سردارِ قبیلہ!"

ابنِ حاتم نے بزرگ اور اس کے بیٹے کو دیکھتے ہوئے سردار سے کہا:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لشکرِ اسلام کے سپہ سالار کے حکم پہ حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ، اپنے مختصر دستے کے ساتھ آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کے

پاس بھیجا ہے"۔

فرستادۂ رسولؐ خالدؓ سیف اللہ کا نام سن کر بنو مصطلق کا سردار کھڑا ہو گیا۔

"اہلاً وسہلاً و مرحبا۔ سردارِ اسلام ہمارے سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔ اس سے بڑھ کے ہماری اور کیا خوش نصیبی ہوگی کہ جنابِ خالدؓ بن ولید اس بستی میں آ کر ہمیں اعزاز بخشیں۔ ہم لوگ چشم براہ ہیں۔ وہ ضرور تشریف لائیں"۔

"معزز سردار"۔

ابنِ حاتم نے جواب میں کہا:

"میں آپ کے پاس اسی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ اب مجھے واپسی کی اجازت دیجیے۔ سردارِ اعظم میرے منتظر ہوں گے"۔

"ٹھیک ہے جوان۔"

سردار نے کہا:

"تم جا سکتے ہو۔ مگر کم از کم اپنا نام تو بتاتے جاؤ"۔

"میرا نام ابنِ حاتم ہے"۔

اس نے مسکرا کر جواب دیا:

"مزید یہ کہ میں حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ کے ساتھ آنے والے مختصر لشکر کا ایک ادنیٰ سا سردار ہوں۔ میں اپنے سردارِ اعلیٰ کا قاصد بھی ہوں۔ باقی تفصیل جب میں اپنے سردارِ اعلیٰ کے ساتھ واپس آؤں گا تو بتاؤں گا"۔

ابنِ حاتم نے واپس آ کر جنابِ خالدؓ کو اپنی اور بنو مصطلق کے سردار کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

خالدؓ بن ولید اپنے دستے کے ساتھ بستی میں جانے کے لیے تیار تھے۔ ابنِ حاتم کی بات سن کے انہوں نے دستے کو چلنے کا اشارہ کیا اور اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ ابنِ حاتم بھی گھوڑا اٹھا کر ان کے ہم رکاب ہوا۔

یہ لوگ بستی کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ بنو مصطلق کے تمام لوگ جن میں عورتیں، بچے اور ضعیف العمر لوگ بھی تھے، سب کے سب سردارِ اسلام حضرت خالدؓ بن ولید کے استقبال کے لیے قطاریں باندھے کھڑے تھے۔

حضرت خالدؓ بن ولید یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور گھوڑے سے اتر کر سردارِ قبیلہ اور بزرگ لوگوں سے معانقہ کیا۔

بنو مصطلق کا سردار ان سب کو ساتھ لے کر بستی میں داخل ہوا اور انہیں اس جگہ لے جا کر بٹھایا جو ان کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔

دورانِ گفتگو خالدؓ بن ولید نے کہا:

"میں نے بستی سے اٹھتی ہوئی "اللہ اکبر" کی آواز صبح کو سنی تھی۔ اس کے علاوہ میرے قاصد ابنِ حاتم نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ بحمد للہ آپ سب لوگ نہ صرف مسلمان ہیں بلکہ اسلامی اصولوں کی پابندی بھی کرتے ہیں"۔

"سردار خالدؓ سیف اللہ!"

سردارِ قبیلہ نے جواب میں کہا:

"آپ نے جو باتیں کہی ہیں وہ ہماری عزت کا باعث ہیں۔ ہم لوگوں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے اس وقت سے دینی احکام کی پابندی شروع کر دی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اب بھی ان احکام کے پابند ہیں"۔

"دراصل مجھے دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس لیے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے کہ ہمارے ایک دوسرے سردار ولید بن عقبہ بن ابی معیط نے، جو کچھ عرصہ پہلے یہاں آئے تھے، واپس جا کر کچھ ایسی باتیں بیان کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے خدانخواستہ آپ لوگ مذہبِ اسلام سے پھر گئے ہیں اور ۔۔۔"

"سردار خالدؓ سیف اللہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

بنو مصطلق کے سردار نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا:

"ہم لوگ سچے مسلمان ہیں اور جس نے یہ کہا ہے کہ ہم نے اسلام چھوڑ دیا ہے اس نے غلط کہا ہے اور ہم اس کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ کچھ دن پہلے مسلمانوں کا ایک گروہ ادھر آیا تھا۔ اس کے پاس نشانِ اسلام (پرچم) تھا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں اپنے آدمیوں کے ساتھ اس گروہ کے استقبال کے لیے بستی سے نکلا

مگر نہ معلوم انہیں کیا ہوا کہ وہ ہمیں دیکھ کر فوراً گھوڑے گھما کر واپس ہو گئے۔

اس گروہ کے لوگ نہ تو ہم سے ملے اور نہ کوئی بات کی۔ پھر انہوں نے ہمارے بارے میں ایسی بات کیوں کہی؟"

"اسی لیے تو مجھے یہاں بھیجا گیا ہے"۔

خالدؓ بن ولید نے کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فوراً شبہ ہو گیا تھا کہ ولید بن عقبہ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ میں تحقیق کر کے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کروں"۔

"تو آپ واپس جا کر کیا کہیں گے دربارِ رسولؐ میں؟" بنو مصطلق کے سردار نے گھبرا کر حضرتِ خالدؓ سے دریافت کیا۔

"آپ بالکل مطمئن رہیے"۔

حضرت خالدؓ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"میں اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سچے مسلمان ہیں۔ میں واپس جا کر اس غلط فہمی کو ختم کرا دوں گا جو ولید بن عقبہ کی باتوں سے پیدا ہوئی ہے"۔

"ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں سردار خالدؓ سیف اللہ!"

سردار نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"آپ دربارِ رسالتؐ میں ہماری طرف سے یہ درخواست پیش کیجیے گا کہ خدا کے رسولؐ اپنی دعاؤں میں ہم لوگوں کو ضرور یاد رکھیں تاکہ ہماری عاقبت سنور جائے"۔

"انشاء اللہ۔ ایسا ہی ہو گا"۔ حضرتِ خالدؓ نے جواب دیا۔

بنو مصطلق کی بستی میں دو دن قیام کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید مدینہ واپس آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

"ولید بن عقبہ نے جو کچھ کہا تھا وہ قطعی غلط فہمی کی بنیاد پر کہا ہے۔ انہوں نے بنو مصطلق کی بستی میں قدم ہی نہیں رکھا تھا اور استقبال کے لیے آنے والوں کو اپنا دشمن سمجھ کر واپس آ گئے تھے"۔

اس وقت نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو نصیحت فرمائی کہ:

"آپ بغیر تحقیق اور تصدیق کے کوئی بات منہ سے نہ نکالا کریں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں سے کئی بے گناہوں کا خون بہ سکتا ہے"۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو تحقیق و تصدیق کے لیے بنو مصطلق کی طرف روانہ کیا تھا تو انہیں سختی سے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ بنو مصطلق کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے معاملہ کی اچھی طرح چھان بین کر لیں۔

اسی موقع پر قرآنِ مبین کی یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی تھی:

یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین ○

ترجمہ:

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح اس خبر کی تصدیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بے خبری میں نقصان پہنچا دو اور بعد میں اپنے کیے پر نادم ہو"۔

اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ چھان بین کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلدی کرنا شیطان کی طرف سے ہے۔

بعض مفسرین اور مؤرخین آیت:

یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء . . . . .

کی شانِ نزول کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ جب ولید بن عقبہ نے واپس آ کر رسولِ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ بنو مصطلق مرتد ہو گئے ہیں اور لڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں تو آپؐ نے ان سے لڑنے کا ارادہ کیا اور مسلمانوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ عنقریب بنو مصطلق سے جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر روانہ کیا جائے گا۔

ابھی اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا تھا کہ بنو مصطلق کا ایک وفد دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ وہ لوگ ولید بن عقبہ کے استقبال کے لیے بستی سے باہر نکل کر آئے تھے نہ کہ ان سے جنگ کرنے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بات کا یقین فرما لیا اور یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔

مگر دوسرا گروہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا خیال ہے کہ آیت شریفہ مذکورہ اس واقعہ پر منطبق ہوتی ہے جس میں حضرت خالدؓ کو بھیجنے اور انہیں تحقیق و تفتیش سے کام لے کر پھر کوئی قدم اٹھانے کا ذکر ہے۔

حضرت خالدؓ کو بنو مصطلق کے پاس بھیجنا اور انہیں صبر و احتیاط سے کام لینے کی تلقین کرنا حکمت سے خالی نہیں تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو مصطلق کی بغاوت کا حال سن کر کسی ایسے شخص کو روانہ فرمانا چاہتے تھے جو عقل مند، وسیع النظر اور معاملہ فہم ہو اور بنو مصطلق کے معاملات کو اچھی طرح معلوم کر سکے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی چاہتے تھے کہ بنو مصطلق کی طرف جو شخص بھیجا جائے وہ ایک ماہر سپہ سالار بھی ہوتا کہ وقت پڑنے پر جنگ بھی کر سکے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو صبر و احتیاط سے کام لینے کا جو حکم دیا تھا وہ اس بنا پر تھا کہ حضرت خالدؓ بن ولید کہیں جوشِ شجاعت میں تحمل سے کام لینا نہ بھول جائیں۔

ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خیال بھی آیا ہو کہ خالدؓ بن ولید نے جس طرح بنو جذیمہ کے معاملہ میں جلد بازی سے کام لے کر انہیں قتل کرا دیا تھا اسی طرح کا سلوک وہ بنو مصطلق کے ساتھ نہ کریں۔

اسی سال یعنی ۹ھ ہجری میں دومۃ الجندل کا واقعہ پیش آیا جس میں سیف اللہ حضرت خالدؓ بن ولید نے حاکم دومۃ الجندل، اکیدر بن عبد الملک کو گرفتار کیا تھا۔



دومۃ الجندل، دمشق اور مدینہ کے درمیان جبلِ طے کے قریب ایک قلعہ تھا۔ دمشق سے اس قلعہ کا فاصلہ "سات منزل" تھا۔

اکیدر عیسائی تھا اور قبیلہ کندہ سے تعلق رکھتا تھا۔ دومۃ الجندل کا واقعہ اس وجہ سے بھی بہت مشہور ہے کہ اس واقعہ کے سلسلے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پیشین گوئی کی تھی، وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی تھی!

جناب خالدؓ بن ولید چار سو بیس سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل کے عیسائی حاکم اکیدر بن عبد الملک کی طرف روانہ ہونے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اے خالدؓ! جب تم دومۃ الجندل پہنچو گے تو وہاں کا حاکم اکیدر تمہیں گائے کا شکار کھیلتے ہوئے ملے گا۔"

حضرت خالدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ اطہر سے یہ بات سنی اور گرہ میں باندھ لی۔ انہیں یاد تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگِ موتہ کے موقع پر بھی ایک پیشین گوئی فرمائی تھی جو پوری ہو کر رہی تھی۔

یہ پیشین گوئی اس طرح ہوئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موتہ کے عیسائی حاکم شرجیل بن عمرو غسانی کے خلاف زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک مہم اس وجہ سے روانہ فرمائی تھی کہ اس بدبخت نے قاصدِ رسولؐ حارثؓ بن عمیر کو بلا وجہ قتل کرا دیا تھا۔ چنانچہ جب یہ مہم روانہ ہونے لگی تو جنابِ رسولؐ نے

یہ بھی فرمایا کہ:

"دورانِ جنگ زیدؓ شہید ہوں تو جعفرؓ طیار امیرِ لشکر ہوں اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ سردار ہوں"۔

اس لشکر میں حضرت خالدؓ بن ولید بھی شامل تھے۔

شرجیل کو اسلامی لشکر کے آنے کی خبر ملی تو اس نے فوراً قیصرِ روم سے کمک طلب کر لی۔ قیصر کا لشکر ایران سے جنگ کر کے واپس آ رہا تھا اور اس وقت موتہ کے قریب موجود تھا۔ شرجیل کی درخواست پاتے ہی قیصر نے لشکر کو شرجیل کی کمک پر روانہ کر دیا۔

اسلامی لشکر قیصر سے جنگ کے لیے نہیں، شرجیل کی گوشمالی کے لیے بھیجا گیا تھا اس لیے صرف تین ہزار لشکریوں پر مشتمل تھا۔

زیدؓ بن حارث جب موتہ پہنچے تو ان کے مقابلہ پر دو لاکھ سے زیادہ رومی لشکر موجود تھا مگر انہوں نے پیٹھ دکھانے کے بجائے جنگ کا فیصلہ کیا اور اس مختصر فوج کے ساتھ رومیوں پر حملہ کر دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومی لشکر نے اسلام کے مجاہدین کو چاروں اطراف سے گھیر لیا۔ ٹھیک اس وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدِ نبویؐ میں اپنے پاس موجود صحابہؓ کو جنگِ موتہ کا حال سنا رہے تھے۔

آپؐ نے فرمایا:

"زیدؓ شہید ہوئے۔ علم جعفرؓ طیار کے ہاتھ میں آیا۔ اب جعفرؓ طیار بھی شہید ہوئے اور علم عبداللہؓ بن رواحہ کے ہاتھ میں ہے۔"

پھر آپؐ نے عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کا اعلان فرمایا اور ارشاد ہوا:

"اب جھنڈا

سیفٌ مِّن سیوف اللہ

اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے سنبھالا ہے۔ اللہ نے اس کے ہاتھ فتح دی ہے"۔

اس دن سے حضرت خالدؓ بن ولید، سیف اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

چنانچہ اس موقع پر بھی جب حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اکیدر انہیں گائے کا شکار کھیلتے ہوئے ملے گا تو جناب خالدؓ نے یہ بات اپنے ذہن میں بٹھالی۔ انہیں یقینِ کامل تھا کہ حضورؐ نے جس طرح فرمایا ہے بالکل اسی طرح ہوگا۔

جناب خالدؓ بن ولید اپنے سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل کے قریب پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ وہ چاندنی رات تھی۔ صاف و شفاف چاندنی میں دور دور تک سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ دومۃ الجندل کا قلعہ بھی دور سے نظر آ رہا تھا۔

جناب خالدؓ نے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ تمام سوار رک گئے۔

آپ نے کہا:

"ہم رات کسی محفوظ مقام پر گزاریں گے اور ہمارے جاسوس قلعہ دومۃ الجندل کے گرد چکر لگا کر دیکھیں گے کہ صبح کو کس مقام سے حملہ کیا جائے تاکہ قلعہ پر جلد قبضہ ہو سکے۔"

قریب ہی ایک جنگل تھا۔ خالدؓ بن ولید اپنے سواروں کے ساتھ وہاں پہنچے اور جنگل کے کنارے خیمے لگا دیے گئے۔

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد جناب خالدؓ نے اپنے خاص آدمی یعنی ابن حاتم کو طلب کیا اور اسے حکم دیا:

"قلعہ کی طرف جاؤ۔ گھوڑے کو کچھ دور چھوڑ کر قلعہ کی فصیلوں اور قلعہ پر پہرے کے انتظامات کو غور سے دیکھو اور واپس آجاؤ۔ تمہارے واپس آنے پر ہی صبح حملہ کا پروگرام طے کیا جائے گا۔"

ابنِ حاتم گھوڑے پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ قلعہ کی طرف روانہ ہوا۔

حاکم قلعہ اکیدر بن عبدالملک بے خبر سو رہا تھا کہ اس کی بیوی نے اسے جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے بولا:

"نیک بخت اس وقت جگانے کی کیا وجہ ہے۔ کہیں تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"نہیں۔"

اس کی بیوی نے جواب دیا:

"ڈر تو نہیں لگ رہا لیکن خطرہ ضرور محسوس ہو رہا ہے۔"

"کس طرح کا خطرہ؟" اکیدر نے چونک کر پوچھا۔

اس کی بیوی نے قلعہ کے صدر دروازے کی طرف اشارہ کیا:

"ادھر سے ایسی آوازیں آ رہی ہیں جیسے کوئی صدر دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہو"۔
اسی وقت ایکدر کی ملازمہ بھاگتی ہوئی خواب گاہ میں آئی۔
"کیا بات ہے؟"
ایکدر کی بیوی نے پوچھا:
"تو اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟"
"مالکن!"
ملازمہ نے ہانپتے ہوئے بتایا:
"صدر دروازہ کا بڑا محافظ آیا ہے اور یہ خبر لایا ہے کہ ایک جنگلی گائے نے قلعہ پر حملہ کر دیا!"
"کیا بکواس کر رہی ہے"۔
ایکدر غصے میں چیخ کر بولا:
"تو پاگل تو نہیں ہو گئی؟"
"میں کیا جانوں مالک!"
ملازمہ لرزتے ہوئے بولی:
"مگر بڑا محافظ یہی کہہ رہا ہے"۔
ایکدر بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
"میں خود دیکھتا ہوں"۔
یہ کہہ کر وہ اپنے جسم پر ہتھیار سجانے لگا۔
"ایکدر، تم کہاں جا رہے ہو؟"
اس کی بیوی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا:
"آج تک یہ نہیں سنا گیا کہ کسی جنگلی گائے نے کسی قلعہ پر حملہ کیا ہو"۔
"تم بیکار پریشان ہو رہی ہو"۔
ایکدر نے تلوار سنبھال کر کہا:
"میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟"
ایکدر باہر جانے لگا تو بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا:
"میرا جی بہت ڈر رہا ہے ایکدر۔ تم نہ جاؤ۔ یہ ضرور کوئی بلا ہے"۔

"تم اطمینان سے سو جاؤ"۔
ایکدر نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا:
"اگر وہ کوئی بلا ہے تو بھی میں اس کی گردن اڑا دوں گا"۔
یہ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔
باہر محافظ موجود تھا۔ ایکدر نے غصے میں پوچھا:
"تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ گائے ہے؟"
"جی ہاں میرے آقا"۔
محافظ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:
"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک جنگلی گائے غصے کے عالم میں قلعہ کے دروازے کو ٹکریں مار رہی ہے"۔
ایکدر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ آگے آگے اور محافظ پیچھے پیچھے، دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازہ پر پہنچ گئے۔ ایکدر فوراً سیڑھیاں چڑھ کے برج پر پہنچا اور نیچے جھانکنے لگا۔
محافظ کا بیان بالکل سچ تھا۔
ایک جنگلی گائے غصے سے ڈکراتی اور منہ سے جھاگ اڑاتی کبھی دروازے کو ٹکر مارتی تو کبھی پیروں سے جیسے ٹھوکریں مار رہی تھی۔
ایکدر نے یہ دیکھا تو چکرا کر رہ گیا۔ اسی وقت اس کا ایک بھائی حسان، بھاگتا ہوا ایکدر کے پاس پہنچا۔
"کیا بات ہے ایکدر بھائی!"
حسان نے پوچھا:
"یہ دروازے پر کھٹاکھٹ کی آوازیں کیا ہو رہی ہیں؟"
ایکدر نے کہا:
"تم خود ہی دیکھ لو"۔
حسان نے جھانک کے دیکھا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔
"بڑی عجیب بات ہے۔ آج تک نہ ایسا دیکھا نہ سنا"۔
اسی دم قریب کھڑا محافظ چیخا:

"آقا! وہ دیکھیے۔ گائے واپس جا رہی ہے۔"

اکیدر اور حسان دونوں نے ادھر دیکھا۔ گائے واقعی واپس جا رہی تھی مگر ڈکراتی ہوئی اور منہ سے جھاگ اڑاتی ہوئی۔

اکیدر بولا:

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا سردار بھائی۔" حسان بھی اس کے پیچھے لپکا۔ نیچے پہنچ کے اس نے اکیدر سے کہا:

"سردار بھائی! جنگلی جانور کے پیچھے اکیلے جانا اچھا نہیں۔ آپ سواروں کے دستے کے ساتھ باہر نکلیے۔"

اکیدر کی سمجھ میں بھائی کی بات آ گئی۔ اس نے رک کر سواروں کے دستے کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر میں پانچ چھ سو سوار تیار ہو کر آ گئے۔

اسی وقت صدر دروازے پر پھر چوٹیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ اوپر سے محافظ نے چلا کر اکیدر کو خبردار کیا۔

"آقا۔ ابھی باہر نہ نکلیے گا۔ پاگل گائے پھر واپس آ گئی ہے۔"

اکیدر اور حسان حیران رہ گئے۔ یہ گائے تو واقعی کوئی بلا معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد گائے ٹکریں مار کر پھر واپس چلی۔

اس وقت اکیدر دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس کے ساتھ پانچ سو سواروں سے زیادہ محافظوں کا ایک مضبوط دستہ تھا۔

محافظ نے اوپر سے بتایا:

"آقا۔ گائے کا رخ جنگل کی طرف ہے۔"

چنانچہ اکیدر بھی اپنے سواروں کو لے کر جنگل کی طرف بڑھا۔

اسی دوران ابنِ حاتم جسے جنابِ خالدؓ بن ولید نے قلعہ کے معائنے کے لیے بھیجا تھا، چکر لگاتا ہوا صدر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

اس وقت پاگل گائے قلعہ دومۃ الجندل کے دروازے پر ٹکریں مار رہی تھی۔ ابنِ حاتم نے کچھ دیر تو یہ تماشہ بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ پھر وہاں سے دوڑ کے گھوڑے کے پاس آیا جسے وہ فصیل سے کچھ دور باندھ آیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کے بھاگم بھاگ جنابِ خالدؓ بن ولید کے پاس پہنچا۔

"سردارِ معظم!"

ابنِ حاتم نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا:

"میں اس وقت ایک عجب تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

"کیسا تماشہ؟"

خالدؓ بن ولید نے سوال کیا:

"کہاں دیکھا تم نے؟"

"سردارِ معظم!"

ابنِ حاتم نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا:

"کیا آپ نے کبھی دیکھا یا سنا ہے کہ کوئی جنگلی گائے کسی قلعے کے دروازے کو ٹکریں مارتی ہو؟"

"کیا کہہ رہے ہو ابنِ حاتم؟"

جنابِ خالدؓ کو اس کی بات پاگلوں کی سی معلوم ہوئی:

"تم ہوش میں تو ہو؟"

"سردارِ محترم!"

ابنِ حاتم نے زور دے کر کہا:

"قسم لے لیجیے۔ میں اپنی آنکھوں سے ایک جنگلی گائے کو قلعہ دومۃ الجندل کے دروازے پر ٹکریں مارتے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

ذرا دیر کے لیے جنابِ خالدؓ بھی حیران ہوئے۔ پھر انہیں جیسے کچھ یاد آ گیا۔ بولے:

"سنو ابنِ حاتم! تم نے کسی کو گائے کا شکار کرتے تو نہیں دیکھا؟"

اب ابنِ حاتم پر حیرت کا غلبہ ہوا۔ اس نے کہا:

"سردارِ محترم! میں نے گائے کو تو دیکھا ہے مگر کسی شکاری کو نہیں دیکھا۔ آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس یونہی پوچھا تھا۔"

جنابِ خالدؓ بات کو ٹال گئے۔ وہ ابھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی کا اظہار نہیں

کرنا چاہتے تھے۔

اسی وقت ایک پہریدار نے آکر اطلاع دی:

"سردار۔ قلعے سے لاتعداد سوار نکل کر اس طرف آرہے ہیں"۔

یہ کسی ممکنہ خطرے کی نشاندہی تھی۔ جنابِ خالدؓ نے فوراً اپنے رسالے کو تیار ہونے کا حکم، اور خود لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ابنِ حاتم ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔

سامنے سے ایک جنگلی گائے بھاگتی چلی آرہی تھی اور اس کے تعاقب میں سینکڑوں سوار گھوڑے اڑاتے آرہے تھے۔

جنابِ خالدؓ کے کان میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز گونجی:

"دومۃ الجندل کا حاکم اکیدر تمہیں گائے کا شکار کھیلتا ملے گا"۔

جنابِ خالدؓ نے لگامیں کھینچ کے ابنِ حاتم سے کہا:

"سنبھل جاؤ ابنِ حاتم: یہ کوئی اور شکاری نہیں بلکہ اکیدر بن عبدالملک اپنے سواروں کے ساتھ آرہا ہے۔ اسے یہیں پر گھیرنا ہوگا"۔

اس وقت تک خالدؓ بن ولید کے تمام سوار تیار ہو کے گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے۔ خالدؓ بن ولید نے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور گھوڑے کا رخ آنے والوں کی طرف پھیر دیا۔

اللہ اکبر کا نعرہ سن کر اکیدر اور اس کے سوار رک گئے۔ شفاف چاندنی میں دونوں لشکر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

اکیدر نے اپنے سواروں کو نیم دائرے کی شکل دی۔ پھر وہ بھی اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے زور سے چیخا:

"حملہ کر دو"۔

دونوں طرف کے سواروں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا اس لیے وہ جلد ہی ایک دوسرے سے گتھ گئے۔

تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد حضرت خالدؓ نے اکیدر پر قابو پا لیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کا بھائی حسان جنگ میں مارا گیا۔

حضرت خالدؓ نے اکیدر کی جان بخشی ان شرائط پر کی کہ:

۱۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کی اطاعت قبول کرے گا۔

۲۔ جزیہ کے طور پر دو ہزار اونٹ، ۸۰۰ گھوڑے، ۴۰۰ زرہیں اور ۴۰۰ نیزے دے گا۔

اکیدر نے یہ شرائط قبول کر لیں۔ خالدؓ بن ولید نے خمس نکال کے مالِ غنیمت لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد وہ اکیدر، اس کے دوسرے بھائی مصاد (جو قلعہ میں تھا) اور جزیہ کی مذکورہ چیزیں لے کر تبوک روانہ ہوئے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک میں اب تک ٹھہرے ہوئے رومی لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔ خالدؓ بن ولید نے وہاں پہنچ کے اکیدر کو حضورِ رسولؐ میں پیش کیا۔

اکیدر نے جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت قبول کر لی۔ ہدیہ پیش کیا۔ آپؐ نے اس کا ہدیہ قبول کر کے اس کی صلح قبول کر لی اور اس کے بھائی کی جان بخشی فرما دی۔

اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اکیدر کو اپنی مہر ثبت فرما کر ایک تحریر عطا کی جس میں درج تھا کہ اکیدر کو جان کی امان دی گئی ہے۔ شرائطِ صلح بھی اس میں درج تھیں۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک سے اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ واپس آ گئے۔ خالدؓ بن ولید آپؐ کے ساتھ ہی تھے۔

مدینہ پہنچ کے ابنِ حاتم کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ اس کے آجانے سے نوخا کے گلشنِ حیات میں پھر بہار آگئی تھی مگر مجاہد کی زندگی تو ہر دم نوکِ شمشیر پر رہتی ہے۔ ابنِ حاتم اگرچہ گھر پر اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہا تھا مگر اس کے دل میں ایک بے چینی سی رہتی تھی۔

پھر اس کی یہ بے چینی اس وقت ختم ہو گئی جب لشکرِ اسلام کی خیمہ گاہ سے اُسے بلاوا آیا۔ حضرت خالدؓ نے اسے فوری طور پر طلب کیا تھا۔ انہیں نجران جانے کا حکم ملا تھا اور وہ ابنِ حاتم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

نوخا اور اس کے والدین کے دل تو اس بلاوے پر دھڑکنے لگے تھے مگر ابنِ حاتم کے لیے یہ خبر

ایک مژدۂ جانفزا تھی۔

دراصل لشکرِ اسلام کا ہر فرد میدانِ جنگ میں دشمن سے لڑنے ہی کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتا تھا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو ربیع الاوّل اور بعض روایتوں کے مطابق جمادی الثانی سنہ ۱۰ ہجری میں چار سو مسلمانوں کے ساتھ بنوالحارث بن کعب کی طرف نجران جانے کا حکم دیا۔

اس مختصر لشکر کو رخصت کرتے وقت جنابِ رسولؐ نے خالدؓ بن ولید کو تاکید فرمائی:

"بنوالحارث بن کعب کے لوگوں سے جنگ کرنے سے پہلے انہیں تین مرتبہ دعوتِ اسلام دینا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ان میں رہ کر انہیں کتاب اللہ سنّتِ نبویؐ اور احکامِ اسلام کی تعلیم دینا۔ ہاں، اگر وہ انکار کریں تو پھر ان سے جنگ کرنا۔"

جناب خالدؓ بن ولید، حکمِ رسولؐ پا کر اپنے فوجی دستے کے ساتھ نجران پہنچے۔ وہاں پہنچ کے انہوں نے پہلے ابنِ حاتم کو پوشیدہ طور پر بنوالحارث کے مذہبی خیالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔

ابنِ حاتم نے واپس آکر بتایا کہ:

"بنوالحارث نرم دل ہیں اور اسلام کے بارے میں کچھ باتیں جانتے ہیں۔ اگر ان میں تبلیغ کی جائے تو وہ ضرور مسلمان ہو جائیں گے۔"

پس—

جنابِ خالدؓ نے لشکر کو آبادی سے دور رکھا اور چند لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی صورت میں نجران کی آبادی میں پھیلا دیا۔

یہ لوگ جا بجا کہتے پھرتے تھے:

"اے بنوالحارث! اسلام لے آؤ، تم محفوظ ہو جاؤ گے۔"

تھوڑی سی کوشش ہی سے تمام قبیلہ اسلام لے آیا۔ خالدؓ بن ولید نے فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق وہیں قیام کیا اور انہیں کتاب اللہ، سنّتِ نبویؐ اور احکامِ اسلام کی تعلیم دینا شروع کی۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک خط کے ذریعے قبیلہ کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع دی۔

ان کے اس خط کے جواب میں جنابِ رسولؐ نے ان کو لکھا کہ وہ بنوالحارث کا ایک وفد ہمراہ لے کر

مدینہ آئیں۔

جناب خالدؓ بن ولید ان کے ایک وفد کے ساتھ مدینہ پہنچے اور اس وفد کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور پیش کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وفد سے سوال کیا:

"زمانۂ جاہلیت میں جو کوئی تم سے لڑتا تھا وہ تم پر فتح حاصل نہ کر پاتا تھا بلکہ فتح تمہی کو حاصل ہوتی تھی۔ اس کی وجہ؟"

وفد نے جواب دیا:

"حضور! ہم اکٹھے ہو کر جنگ کرتے تھے۔ ہم میں کبھی تفرقہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم کبھی ظلم کی ابتدا نہ کرتے تھے۔"

تاریخ طبری میں ایک روایت مذکور ہے کہ جنابِ خالدؓ کو سنہ ۱۰ھ میں تبلیغِ اسلام کے لیے یمن بھیجا گیا خالدؓ چھ ماہ یمن میں رہے مگر ایک شخص بھی ان کے ہاتھ پر مسلمان نہ ہوا۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنابِ علی مرتضیٰؓ کو یمن بھیجا۔ ان کے جانے کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

یہ وہی زمانہ ہے جب دوسری تواریخ میں حضرت خالدؓ بن ولید کو نجران بھیجنے کا ذکر ہے۔ اگر یہ سوچا جائے کہ طبری نے نجران کے بجائے غلطی سے یمن لکھ دیا ہے تو بھی یہ درست نہیں کیونکہ نجران میں تو قبیلہ بنوالحارث والے ان کے ہاتھ پر ایمان لے آئے تھے۔

اب اگر یہ سمجھا جائے کہ خالدؓ بن ولید کو پہلے یمن اور بعد میں نجران بھیجا گیا تھا تو یہ بات عقلی اور نقلی دونوں صورتوں میں درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جب حضرتِ خالدؓ بنوالحارث کو مسلمان کرنے میں کامیاب رہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ یمن میں کامیاب نہ ہوتے۔

اس کے علاوہ ایک ہی وقت میں خالدؓ بن ولید کا یمن اور نجران دونوں جگہ موجود ہونا ایک ناممکن سی بات ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے حیاتِ رسول اللہؐ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو جنابِ خالدؓ پر کس قدر اعتماد تھا۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت خالدؓ کو نہ صرف ان کے آبائی اعزاز پر برقرار رکھا بلکہ بیشتر مواقع پر انہیں مقدمۃ الجیش کی سرداری عطا فرمائی۔ چنانچہ حضرت خالدؓ خود فرماتے ہیں:

"جب سے میں نے اسلام قبول کیا، حضورؐ نے مجھے اپنے صحابہؓ سے کبھی الگ نہیں رکھا۔ دوسرے اصحابؓ کو خدمت کے جو مواقع دیے گئے وہ مجھے بھی دیے گئے۔"

حضرت خالدؓ بن ولید، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر غزوہ اور سفر میں ہمراہ رہے اور انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغِ اسلام کی عظیم الشان مثالیں قائم کیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفاتِ اقدس کے بعد بھی حضرتِ خالدؓ کے جہاد اور تبلیغِ اسلام کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور دین کی نصرت اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر آپ نے جو شاندار کارنامے انجام دیے وہ تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب ہیں۔

جنابِ خالدؓ بن ولید کے جو جنگی کارنامے بیان کیے گئے ہیں، ان کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ تک تھا، جسے ہم دورِ اوّل کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی بے مثال جنگی صلاحیتوں کا سلسلہ حضورؐ کے وصال کے بعد بھی جاری رہا۔ اس لیے اسے ہم دورِ ثانی میں تحریر کریں گے۔

یہاں پہ پہلا حصہ ختم کیا جا رہا ہے!



دورِ ثانی



جزیرۂ عرب کے اکثر باشندے خانہ بدوش زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ یہ لوگ تہذیب و تمدن اور معاشرتی و سماجی طور طریقوں اور اصولوں سے قطعی ناواقف تھے۔ اگرچہ انہیں اسلام کے آگے سرِ خم کرنا پڑا تھا لیکن وہ دل سے اپنے قدیم رسوم و رواج اور طرزِ زندگی کو پسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ان کے آباؤ اجداد کی زندگی "آزاد" تھی جبکہ اسلام نے ان پر بعض پابندیاں لگا دی تھیں جو اُن کو شاق گزرتی تھیں۔

مثلاً اسلام میں بطورِ خود قصاص یا انتقام لینے کی ممانعت ہے۔ اس ممانعت کو وہ اپنی فطری آزادی کے خلاف سمجھتے تھے۔

ان کی تربیت میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب کے بیشتر قبائل کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب رہنے کا موقع نہ ملا تھا اور وہ آپؐ کے فیضِ صحبت سے بے بہرہ تھے اور اگر موقع ملا تھا تو بہت قلیل مدت کے لیے۔

یہی وجہ تھی کہ اکثریت کے دلوں میں پاکیزگی اور طبیعتوں میں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی تھی اور وہ مشرکانہ عقاید سے پوری طرح نجات نہ پا سکے تھے۔ ان کے دل اسلام کی سچی محبت سے خالی تھے۔ وہ اپنے سرداروں کے زور دینے پر مجبوراً اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

دین سے بے خبری کی وجہ سے انہوں نے زکات کو ایک طرح کا تاوان سمجھ لیا تھا جو اُن پر عاید کیا گیا تھا۔ انہیں اس کی خبر ہی نہیں تھی کہ زکات تاوان نہیں بلکہ ایک قسم کا صدقہ ہے جو امیروں سے وصول کر کے

ان کے حاجت مند بھائیوں پر صرف کیا جاتا ہے تاکہ دونوں طبقوں میں تعاون کی راہ ہموار ہو سکے اور معاشرہ میں توازن پیدا ہو۔

ایسے ناپختہ ذہن قبائل کو جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی خبر ملی تو انہوں نے اس موقع کو اسلام کی عاید کردہ پابندیوں سے آزاد ہونے کا بہترین اور موزوں ترین وقت تصوّر کیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بعض قبائل نے زکات دینے سے انکار کر دیا۔ بعض نے اسلام کو سِرے سے چھوڑ دیا اور بعض نے جھوٹے نبیوں کی پیروی اختیار کر لی۔

یہ قدم انہوں نے اس خیال سے بھی اٹھایا کہ وہ ان جھوٹے نبیوں کے ذریعے قریش کی برابری کر کے اپنے نبی کو قریش کے نبیؐ کے مقابلہ پر پیش کر سکیں گے۔

پس ــــ

انہوں نے خلیفۂ اوّل کے احکامات کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا اور خلافت کو کھلی دھمکیاں دینے لگے۔

اس طرح جزیرۂ عرب میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور نفاق کا ستارہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ یہود و نصاریٰ کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اُس دور کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی کیفیت بکریوں کے اس ریوڑ کی مانند ہو گئی جو لق و دق صحرا میں بغیر چرواہے کے سرگرداں نظر آتا ہے۔

اُس وقت ارتداد اور الحاد کی کثرت، خدا اور صراطِ مستقیم سے کھلے بندوں انحراف اور شدید ہیجان اور اضطراب کے باعث جزیرۂ عرب ایک آتش فشاں کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

اس فتنہ سے مکہ، مدینہ، طائف اور چند بدوی قبائل کے سوا اور کوئی قبیلہ محفوظ نہ تھا۔ سارے کے سارے قبائل اس طوفان میں بہہ گئے تھے"

اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے ایک صاحبِ کردار، نڈر اور خدا پر پورا بھروسہ رکھنے والے شخص کی ضرورت تھی جو اپنے بے مثال عزم، ہمت اور لاثانی فراست اور تدبّر سے مرتدین کا قلع قمع کر سکے۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔

آپ نے مرتدین کے سلسلہ میں جو مدبرانہ کارروائی کی اور جس بے نظیر لیاقت سے ملک کو اس تباہ کُن

فتنہ سے نجات دلائی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ میں خلافت کا بارِ گراں اٹھانے کی اہلیت تمام تر خصائص کے ساتھ موجود تھی۔

جنابِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا جانکاہ اور المناک حادثہ، اس پہ ارتداد کی ہر طرف سے آنے والی وحشت ناک خبریں اور قبائلِ عرب کی روز افزوں بغاوتیں۔ یہ تمام مشکلات اگرچہ آپ کو ایک ساتھ پیش آئیں مگر آپ کے پائے ثبات میں ذرہ بھر لرزش نہ آئی ـــ اور آپ نے پوری فراست سے ہر فتنہ کو اس کی جگہ ختم کرنے کے انتظامات کیے۔

انہی گھمبیر حالات میں ایک دن جنابِ ابوبکرؓ نے حکم دیا:

"اسامہؓ کا لشکر فوراً روانہ ہو جائے"۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری ایام میں رومیوں سے نپٹنے کے لیے حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر شام کی طرف بھیجنے کے لیے ترتیب دیا تھا مگر وہ لشکر آپؐ کی بیماری اور پھر وفات کی وجہ سے اب تک مدینہ میں رکا ہُوا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے اسی لشکر کی روانگی کا حکم دیا تھا۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا:

"اے خلیفۃ المسلمین! ملکی حالات دگرگوں ہیں۔ جگہ جگہ سے بغاوت کی خبریں آ رہی ہیں عرب قبائل مرتد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مدینہ پر باغیوں کے حملہ کا شدید خطرہ ہے۔

ایسی صورتِ حال میں اسامہؓ کے لشکر کو مدینہ سے دور کرنا اسلامی سلطنت کو کمزور کرنے کے مترادف ہو گا۔ فی الحال اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے تو بہتر ہو گا"۔

"ہرگز نہیں"۔

جنابِ ابوبکرؓ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاری کردہ حکم کو میں کیسے روک سکتا ہوں۔ ملکی حالات خواہ کچھ بھی ہوں، حضورؐ کے حکم کی تعمیل ضرور کی جائے گی"۔

"خلیفۂ محترم!"

ایک دوسرے صحابیؓ نے کہا:

"اگر لشکر کی روانگی ایسی ہی ضروری ہے تو اسامہؓ جیسے ناتجربہ کار سپہ سالار کے بجائے اس لشکر پہ کوئی مشہور اور کہنہ مشق سردار مقرر کیا جائے"۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا"۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منتخب کیے ہوئے سپہ سالار کو میں کیسے بدل دوں۔ یہ بے ادبی تو میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ لشکر شام کی طرف روانہ ہوگا اور اسامہؓ ہی اس کے سپہ سالار ہوں گے"۔

پس۔۔۔

لشکرِ اسامہؓ روانہ ہوا۔ اور لشکر کے جانے کے بعد مدینہ کو کسی قسم کے نقصان کے بجائے فائدہ ہی ہوا۔ مرتدین اور مخالفین کو جب یہ معلوم ہوا کہ مدینہ سے ایک لشکر ملک شام بھیجا گیا ہے تو ان کے دماغ میں فوراً یہ خیال آیا کہ مدینہ میں اس قدر زیادہ عسکری طاقت موجود ہے کہ اس گڑبڑ اور پُرخطر وقت میں بھی خلیفۂ مومنین نے ایک بڑا لشکر شام کی طرف بھیج دیا ہے۔

چنانچہ ان کے حوصلے پست ہو گئے اور بعض قبائل جو مدینہ پہ حملہ کر کے اسلامی حکومت کا خاتمہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے تھے، خوفزدہ نظر آنے لگے۔

کچھ عرصہ کے بعد عبس اور ذبیان نے مدینہ پر حملہ کیا مگر مدینہ کا دفاع اس قدر مضبوط بنا دیا گیا تھا کہ ان کی ایک نہ چلی اور انہیں بری طرح شکست کھا کے پیچھے ہٹنا پڑا۔

اسی دوران اسامہؓ کا لشکر فتح یاب ہو کے شام سے واپس آ گیا۔ خلیفۂ اوّل نے اسے آرام کرنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد آپ نے گیارہ علم اور لشکر تیار کیے اور انہیں مختلف سرداروں کی سرکردگی میں فتنہ ارتداد کے خاتمہ کے لیے مختلف اطراف میں روانہ کیا۔

ان لشکروں کی روانگی سے قبل خلیفہ نے مرتدوں اور باغیوں کے لیے ایک فرمان جاری کیا اور اس کی نقول تمام قبائل کو روانہ کر دیں تاکہ لشکرِ اسلام جب ان کے پاس پہنچے تو وہ اس وقت تک توبہ کر چکے ہوں یا پھر توبہ کے لیے تیار ہوں۔

آپ نے سرداروں کو حکم دیا کہ کسی بھی قبیلہ پر حملہ کرنے سے قبل اسے یہ فرمان پڑھ کر ضرور سنایا جائے تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے۔

یہ تمام لشکر وادیٔ ذی القصہ میں جمع ہوئے۔

یہ مقام مدینہ سے ایک منزل کے فاصلے پر نجد کی طرف واقع ہے۔ یہاں سے لشکر اپنے اپنے سرداروں کی سرگردگی میں ان علاقوں، قبیلوں اور مقامات کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ مرتد اور باغی ہو گئے تھے یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا۔

ذیل میں ہر سردار اور اس کی منزل ظاہر کی گئی ہے:

لشکر نمبر۱: سردار خالدؓ بن ولید

حضرت خالدؓ کو خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ پہلے بزاخہ جا کر طلحہ بن خویلد اسدی سے جنگ کریں۔ وہاں سے فارغ ہو کے بطاح جائیں اور مالک بن نویرہ کی پوری طرح سرکوبی کریں۔

لشکر نمبر۲: سردار عکرمہؓ بن ابوجہل

انہیں مسیلمہ کذاب کی طرف روانہ کیا گیا۔

لشکر نمبر۳: سردار شرجیلؓ بن حسنہ

انہیں عکرمہؓ کے پیچھے ان کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ مسیلمہ بن کذاب سے فارغ ہونے کے بعد حضرموت جائیں اور بنو کندہ پہ حملہ آور ہوں۔

لشکر نمبر۴: سردار مہاجرؓ بن ابی امیہ

انہیں اسود عنسی کی سرکوبی کے لیے صنعاء بھیجا گیا۔

لشکر نمبر۵: سردار حذیفہؓ بن محصن

انہیں عمان کی طرف روانہ کیا گیا۔

لشکر نمبر۶: سردار عرفجہؓ بن ہرثمہ

انہیں اہل مہرہ کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔

حذیفہ اور عرفجہ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ دونوں ساتھ ساتھ رہیں۔ جب دونوں لشکر عمان میں ہوں گے تو سردارِ لشکر حذیفہ ہوں گے اور عرفجہ ان کے ماتحت ہوں گے اور جب مہرہ میں ہوں گے تو عرفجہ امیرِ لشکر ہوں گے اور حذیفہ ان کے ماتحت ہوں گے۔

لشکر نمبر۷: سویدؓ بن مقرن

انہیں یمن جا کر اہلِ تہامہ سے جنگ کرنے کا حکم ہوا۔

لشکر نمبر۸: سردار طریفہؓ بن حاجز

انہیں بنو سلیم اور ان کے شریکِ حال ہوازن سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔

لشکر نمبر۹: سردار علاؓ بن حضرمی

انہیں بحرین بھیجا گیا۔

لشکر نمبر۱۰: سردار عمروؓ بن العاص

انہیں قضاعہ کی گوشمالی پر مامور کیا گیا۔

لشکر نمبر۱۱: سردار خالدؓ بن سعید

یہ خالدؓ بن ولید کے بھائی تھے۔ انہیں ملک شام کی سرحد پر قبائل کو مطیع کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

لشکروں کی اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سردار کے سپرد ایک مہم کی گئی اور بعض مہموں پر دو دو لشکر بھیجے گئے مگر خالدؓ بن ولید وہ واحد سردار ہیں جنہیں دو قبائل کے خلاف جنگ کا حکم ہوا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ پہلے بزاخہ جا کر طلحہ بن خویلد سے جنگ کریں۔ اس کے بعد بطاح جا کر مالک بن نویرہ سے جنگ آزما ہوں۔ یہی نہیں بلکہ جب آپ دونوں مذکورہ قبائل کی سرکوبی سے فارغ ہوں تو آپ کو مسیلمہ کذاب کے مقابلے کے لیے جانے کا بھی حکم تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ وقت کو سیف اللہؓ کی شجاعت، فراست اور ذہانت پر کس قدر اعتماد تھا۔

ہمارے اس ناول کا تعلق خالدؓ بن ولید کے حالات اور ان کے مجاہدانہ کارناموں سے ہے اس لیے ہم سوائے ان کے، دوسرے لشکروں کا فی الحال ذکر نہ کریں گے اور صرف اسی تذکرے تک محدود رہیں گے جو سیف اللہؓ سے متعلق ہے۔

خالدؓ بن ولید کو طلحہ (بعض تذکروں میں اسے طلیحہ بھی لکھا گیا ہے) کی سرکوبی کا حکم دیا گیا تھا۔ طلحہ عرب کے ایک بڑے قبیلے بنو اسد کا سردار تھا اور عرب کا ایک مشہور قبیلہ طے اس کا حلیف تھا۔

طلحہ مسلمان ہو گیا تھا اور حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں موجود تھا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان و شوکت دیکھی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کے دماغ میں یہ خناس سما گیا کہ وہ بھی نبوت کا دعویٰ کر کے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرح جاہ و جلال اور عزت و احترام کا مالک بن جائے۔

پس۔۔۔

حجۃ الوداع سے واپس آتے ہی اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اس کے پاس بھی جبرئیلؑ وحی لے کر آتے ہیں۔

چنانچہ بنو اسد کے تمام لوگ اس پر ایمان لے آئے۔ اس کے حلیف قبیلہ طے کے بہت سے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔

ایک دوسرا بڑا قبیلہ بنو غطفان تھا جس سے ابنِ حاتم کا تعلق تھا، اس کے بہت سے لوگ بھی اسلام چھوڑ کر طلحہ کی جھوٹی نبوت پر ایمان لے آئے اور اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ ظاہرہ کے آخری ایام تھے۔ آپؐ کی طبیعت ناساز تھی مگر جب آپؐ کو بتایا گیا کہ بنو اسد کا سردار اسلام سے باغی ہو کر جھوٹا نبی بن بیٹھا ہے تو آپؐ نے فوراً ضرارؓ بن ازور کو ایک لشکر دے کر اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔

ضرارؓ نے وہاں پہنچ کے بنو اسد پر حملہ کیا اور شدید جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں ایک ایسا موقع آیا کہ جناب ضرارؓ نے تلوار کا ایک بھرپور وار طلحہ پر کیا مگر وہ بچ گیا۔

جو لوگ ضرارؓ اور طلحہ کی دوبدو جنگ دیکھ رہے تھے انہیں خیال تھا کہ طلحہ اس وار سے بچ نہ سکے گا مگر جب وہ بچ گیا تو لوگوں کو اس پر سخت تعجب ہوا۔

انہی ایام میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وصال ہوا اور ضرارؓ بن ازور طلحہ کی مہم ناتمام چھوڑ کر مدینہ لوٹ آئے۔

اس سے طلحہ نہ صرف اور شیر ہو گیا بلکہ اس نے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ اس کے جسم پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔

اس کے اس دعوے کی تصدیق ان لوگوں نے کی جنہوں نے طلحہ اور ضرارؓ بن ازور کی دوبدو جنگ دیکھی تھی۔

انہوں نے قسم کھا کر بتایا کہ:

"ہم طلحہ بن اسد کی نبوت کی تصدیق قسم کھا کر کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ضرارؓ بن ازور نے ہمارے نبی (نعوذ باللہ) طلحہ بن اسد پر تلوار کا بھرپور وار کیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ طلحہ اس وار سے نہ بچ سکے گا مگر ضرارؓ بن ازور کی تلوار کو فرشتوں نے پکڑ کر دوسری طرف کر دیا اور طلحہ کو اس سے ذرا بھی ضرر نہ پہنچا۔

اس تصدیق سے طلحہ بن اسد کی جھوٹی نبوت اور چمک اٹھی۔

جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ مرتدوں کے خلاف فوجی دستے ترتیب دے رہے تھے اس وقت قبیلہ طے کے ایک مشہور سردار عدیؓ بن حاتم طائی مدینہ میں موجود تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا قبیلہ، طلحہ بن اسد کا حلیف ہے اور قبیلہ طے کے بہت سے لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور اب وہ طلحہ کو نبی ماننے لگے ہیں۔ انہیں اپنے قبیلے کے آدمیوں کی فکر پڑ گئی۔

پس وہ دربارِ خلافت میں پہنچے اور حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا:

"اے خلیفۃ المسلمین! میرے قبیلے کے کچھ لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور انہوں نے جھوٹے نبی طلحہ بن اسد کو سچا نبی مان لیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں جا کر اپنے قبیلے والوں کو سمجھاؤں بجھاؤں اور انہیں طلحہ سے الگ کرا دوں"۔

جنابِ ابوبکرؓ نے فرمایا:

"اے عدی! اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہارے کہنے سننے سے تمہاری قوم کے لوگ دائرۂ اسلام میں واپس آ جائیں گے تو ضرور جاؤ اور کوشش کرو۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ کم از کم خونریزی ہو اور لوگ راہِ راست پر واپس آ جائیں"۔

عدی بن حاتم طائی فوراً اپنے قبیلہ عوث[1] میں واپس گئے اور قبیلے والوں کو جمع کر کے کہا:

"خلیفۂ اسلام حضرت ابوبکرؓ ایک عظیم لشکر طلحہ بن اسد کی سرکوبی کے لیے خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں روانہ کر رہے ہیں۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام سے منہ موڑ کے طلحہ بن اسد کی نبوت کے قائل ہو گئے ہیں۔ انہیں تہ تیغ کر دیا جائے۔

میرا مشورہ ہے کہ ایسے لوگ جو طلحہ بن اسد کی نبوت پر ایمان لے آئے ہیں، فوراً توبہ کر کے مسلمان

۱۔ قبیلہ عوث، بڑے قبیلہ طے کی ایک ذیلی شاخ تھی!

ہو جائیں اور مسلمانوں اور طلحہ کی جنگ میں طلحہ کا ساتھ نہ دیں"۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ قبیلہ عوث کے جن لوگوں کے ایمان متزلزل ہو رہے تھے انہوں نے اس فاسد خیال کو دل و دماغ سے نکال دیا اور بنو عوث کے جو لوگ طلحہ کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے وہ خاموشی سے اپنے قبیلے میں واپس آ گئے۔

چنانچہ جب خالدؓ بن ولید قبیلہ عوث کے قریب پہنچے تو عدیؓ بن حاتم اپنے پانچ سو سواروں کو ساتھ لے کر جنابِ خالدؓ سے آ ملے۔

عدیؓ بن حاتم نے کہا:

"یہ وہ سوار ہیں جو مرتد ہو کر طلحہ کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ اب یہ پھر اسلام لے آئے ہیں اور آپ کی طرف سے دشمنانِ اسلام سے جنگ کریں گے"۔

خالدؓ بن ولید، عدیؓ کے اس کارنامہ سے بہت خوش ہوئے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے عدیؓ سے کہا:

"اب مجھے تمہاری دوسری شاخ جدیلہ کی طرف جانا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم جدیلہ والوں کے پاس جاؤ اور انہیں بھی اسی طرح قائل کر کے پھر حلقۂ اسلام میں لے آؤ جس طرح تم نے اپنے قبیلے عوث کو قائل کیا ہے"۔

"سردار کا خیال درست ہے"۔

عدیؓ بن حاتم نے جواب دیا:

"جدیلہ والوں سے میرے زیادہ تعلقات نہیں ہیں مگر صاحب سلامت ضرور ہے۔ میں جا کے کوشش کرتا ہوں۔ امید ہے اللہ بہتر کرے گا"۔

عدیؓ بن حاتم جدیلہ والوں کے پاس پہنچے اور انہیں سمجھایا کہ اسلامی لشکر خالدؓ بن ولید کی سرداری میں ادھر آ رہا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم لوگ دوبارہ اسلام قبول کر لو اور اپنے سواروں کو طلحہ کے لشکر سے چپ چاپ واپس لے آؤ۔ ورنہ وہ سب مارے جائیں گے"۔

جدیلہ والوں کی سمجھ میں بھی عدیؓ کی بات آ گئی۔ انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کر دیا اور چند سواروں کو طلحہ کے لشکر میں بھیج کے اپنے سواروں کو واپس بلا لیا۔

جدیلہ کے یہ تقریباً ۵۰۰ سوار تھے۔ انہیں لشکرِ اسلام کی بابت بتایا گیا تو وہ بھی سیدھے راستے پر آ گئے۔

پھر جب خالدؓ بن ولید کا لشکر مقام النسر پر پہنچا جہاں قبیلہ جدیلہ آباد تھا تو عدیؓ بن حاتم نے ان کا استقبال ۵۰۰ سواروں کے ساتھ کیا اور انہیں بتایا کہ :

"پورا قبیلہ جدیلہ دوبارہ مسلمان ہو چکا ہے اور پانچ سو سوار لشکرِ اسلام کے شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔"

اس طرح خالدؓ بن ولید کو ۵۰۰ قبیلہ عوث سے اور ۵۰۰ سوار قبیلہ جدیلہ سے مل گئے۔ یہ ان کے لشکر میں ایک بڑا اضافہ تھا۔

اب اس لشکر کے ساتھ خالدؓ بن ولید نے مدعیِ نبوت طلحہ بن اسد کی طرف کوچ کیا جس کا مرکز بزاخہ میں تھا۔

بزاخہ سے کچھ ادھر خالدؓ بن ولید نے اپنے لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا اور تین آدمیوں کو جاسوسی کے لیے بزاخہ بھیجا۔

ان میں دو آدمیوں کے نام عکاشہ بن حصن اور ثابت بن اقرم انصاری تھے۔ انہیں بزاخہ کے جنوب کی طرف بھیجا گیا۔

تیسرے آدمی ابنِ حاتم کو حکم دیا گیا کہ وہ مشرق کی طرف سے بزاخہ میں داخل ہو اور ان میں گھل مل کے لوگوں کے خیالات اور طلحہ کے لشکر کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرے۔

عکاشہ اور اقرم جنوب کی طرف سے بزاخہ میں داخل ہوئے۔ دن کا وقت تھا اور ان دونوں میں جاسوسی کرنے کی زیادہ صلاحیت نہ تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بزاخہ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی ان کا سامنا طلحہ کے محافظوں سے ہو گیا۔ وہ تین تھے اور یہ دو۔ اگر یہ چاہتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے۔ کوئی بہانہ بھی کر سکتے تھے۔ گھوڑے دوڑا کر بھاگ بھی سکتے تھے مگر انہوں نے کچھ بھی نہ کیا۔

طلحہ کے سواروں نے انہیں گھیر لیا اور ان پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ گھبرا گئے اور اب انہیں بھاگنے کی فکر ہوئی مگر مخالف سواروں نے انہیں گھیر لیا اور مجبوراً انہیں بھی تلواریں نکالنا پڑیں۔

عکاشہ اور ثابت بڑے اچھے شمشیر زن تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مقابلہ میں طلحہ کے ان تین سواروں میں سے ایک مارا گیا۔ اور دو بھاگ نکلے۔

طلحہ کا جو سوار مارا گیا وہ طلحہ بن اسد کا بھائی حبال بن اسد تھا۔

بھاگنے والوں نے طلحہ کو جا کر بتایا کہ ان کا مقابلہ اسلامی لشکر کے ایک دستے سے ہو گیا تھا اور اس مقابلے میں حبال بن اسد مارا گیا۔

طلحہ بن اسد اپنے بھائی کے مارے جانے سے اس قدر مشتعل ہوا کہ اسی وقت سواروں کا ایک مضبوط دستہ لے کر اس طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کا بھائی مارا گیا تھا۔

اُدھر عکاشہ اور ثابت نے مخالف گروہ کا ایک سوار مار تو دیا مگر اب وہ پریشان ہو گئے۔ انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ بھاگنے والے بدلہ لینے کے لیے سواروں کا دستہ لے کر واپس آئیں گے اس لیے انہوں نے راہِ فرار اختیار کی۔

ایک تو انہیں وہاں کے راستوں کا صحیح طور پر علم نہ تھا۔ دوسرے گھبراہٹ نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راستہ بھول گئے۔ اور بجائے واپس جانے کے دشمن کے علاقے میں گھستے چلے گئے اور ان کا سامنا طلحہ سے ہو گیا جو اپنے بھائی کا انتقام لینے ادھر آ رہا تھا۔

اتنے بہت سے سواروں کو آتا دیکھ کر انہوں نے رخ بدلا اور گھوڑے دوسری طرف بھگا دیے۔ طلحہ نے ان کو دیکھ لیا تھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ ضرور اسی دستہ کے سوار ہیں جس نے اس کے بھائی حبال کو مارا ہے۔

بس ــــ

طلحہ نے ان کا تعاقب کیا اور بہت جلد انہیں جا لیا۔ عکاشہ اور ثابت دونوں نے دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے پر مقابلے کو ترجیح دی۔ انہوں نے گھوڑے روکے اور تلوار کھینچ کے کھڑے ہو گئے۔

ایک طرف دو مسلمان۔ دوسری طرف کفار کا پورا دستہ۔ بے شک وہ بہت شجاع اور جانباز تھے مگر زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور شہید ہو گئے۔

جب شام تک عکاشہ، ثابت اور ابنِ حاتم میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا تو حضرت خالدؓ کو فکر ہوئی اور وہ ایک دستہ لے کر ان کی تلاش میں نکلے۔

وہ بہت سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک تو راستے سے ناواقف، دوسرے رات کا اندھیرا۔ ان کے گھوڑے بار بار ٹھوکر کھاتے تھے۔ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں اس لیے زیادہ روشنی نہیں تھی۔

ایک جگہ خالدؓ بن ولید کے ایک سوار کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ راستہ ہموار تھا اس لیے اسے کچھ شبہ ہوا۔

وہ فوراً گھوڑا موڑ کے واپس آیا تاکہ معلوم کرے کہ گھوڑے نے کس چیز سے ٹھوکر کھائی تھی۔ وہاں پہنچ کے وہ گھوڑے سے اترا۔

اب جو اس نے جھک کے زمین پر دیکھا تو وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ اس نے لاش کو الٹ پلٹ کے دیکھا تو پہچان لیا کہ وہ لاش ان کے ساتھی عکاشہ کی ہے۔

اس نے آواز دے کر دوسرے سواروں کو بھی بلا لیا۔ خالدؓ بن ولید بھی وہاں پہنچے۔ انہیں اپنے جاسوس کی موت کا بے حد افسوس ہوا۔ تھوڑی تلاش کے بعد ثابت بن اقرم کی لاش بھی انہیں قریب ہی پڑی ہوئی مل گئی۔

دونوں شہیدوں کے جسم پر تلوار کے بے شمار زخم تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے دشمن سے سخت مقابلے کے بعد جامِ شہادت نوش کیا ہے۔

خالدؓ بن ولید کو فوراً خطرے کا احساس ہوا۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ طلحہ بن اسد کو ان کے آنے کی نہ صرف اطلاع ہو چکی ہے بلکہ وہ پوری طرح جنگ کے لیے تیار بھی ہے۔

انہوں نے فوراً دستے کو واپسی کا حکم دیا اور وہاں پہنچے جہاں ان کا لشکر خیمہ زن تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے کوچ کا حکم دیدیا اور عدیؓ بن حاتم طائی کے ساتھ اس کے قبیلہ طے میں آگئے۔

خالدؓ بن ولید نے قبیلہ طے کے سرداروں سے مزید امداد طلب کی تاکہ شکست کا امکان باقی نہ رہے انہوں نے طائی سرداروں کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلحہ بن اسد نے جنگ کی پوری تیاری کی ہے کیونکہ اس نے عکاشہ بن حصن اور ثابت بن اقرم کو شہید کرنے کے بعد ان کی لاشیں سرِ راہ ڈال دیں۔

اس کا یہ اقدام درندگی کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ لشکرِ اسلام کی کوئی پروا نہیں کرتا اور جنگ کی دعوت دے رہا ہے"۔

ایک طائی سردار نے جواب میں کہا:

"اے لشکرِ اسلام کے سالار۔ ہم نے پانچ سو سواروں کا دستہ پہلے ہی آپ کو دے دیا ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ اب فرمائیے ہم مزید آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

حضرت خالدؓ نے فرمایا:

"بعض اطلاعات کے مطابق طلحہ بن اسد نے جھوٹا نبی ہونے کا دعویٰ کر کے ایک بڑا لشکر اپنے گرد جمع کر لیا ہے۔ ہمارے پاس بھی اگرچہ ایک مضبوط لشکر ہے۔ پھر بھی ہم کسی غیر معمولی حادثے سے دوچار ہونے کے بجائے اپنے لشکر میں مزید اضافہ چاہتے ہیں تاکہ طلحہ پر فتح کے سوا کسی اور بات کا امکان نہ رہے"۔

"اے لشکرِ اسلام کے سردار"۔

طائی سردار نے جواب دیا:

"بنو قیس کے مقابلہ پر تو ہم آپ کو بہت زیادہ امداد دے سکتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بنو اسد ہمارے حلیف ہیں۔ ہم ان سے لڑنے سے معذور ہیں"۔

خالدؓ بن ولید نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا:

"تم درست کہتے ہو۔ تمہیں اختیار ہے کہ جس قبیلہ سے چاہو لڑو اور جس سے چاہو نہ لڑو۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارا ساتھ دو"۔

خالدؓ بن ولید کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ طائی قبیلہ اگر طلحہ کے خلاف ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تو وہ طلحہ سے مل کر ان کے خلاف بھی جنگ نہ کرے یعنی غیر جانبدار رہے۔

اس وقت عدیؓ بن حاتم کو غصہ آگیا۔ انہوں نے زور دے کر کہا:

"خدا کی قسم! مجھے بنو اسد کے خلاف لڑنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔ جب انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا ہے تو وہ ہمارے حلیف بھی نہیں رہے"۔

"عدیؓ! تم اپنے قبیلے کی مخالفت نہ کرو"۔

خالدؓ بن ولید نے انہیں سمجھایا:

"وہ جس سے چاہیں جنگ کریں اور جس سے نہ چاہیں، نہ جنگ کریں۔ تمہیں دونوں صورتوں میں اپنے قبیلہ کا ساتھ دینا چاہیے"۔

خالدؓ بن ولید کی اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبائل کی نفسیات سے کس درجہ واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ اگر کسی قبیلہ کو کسی قوم کے خلاف زبردستی جنگ میں شامل ہونے پر مجبور کیا جائے تو وہ قبیلہ کبھی دل جمعی، پوری کوشش اور توجہ سے نہ لڑے گا بلکہ بے دلی سے صرف دکھاوے کے لیے جنگ میں حصہ لے گا

اور اس کا نتیجہ عموماً شکست کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

خالدؓ بن ولید اپنے وفادار ساتھی ابنِ حاتم کے بارے میں بہت فکرمند تھے۔ عکاشہ اور ثابت کی تو لاشیں مل گئی تھیں مگر ابنِ حاتم کا کچھ پتہ نہ چلا تھا۔ انہوں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر آدمی دوڑا دیے تھے مگر کچھ خبر نہ مل سکی۔

بنو طے میں قیام کر کے خالدؓ بن ولید نے اپنے لشکر کو پوری طرح مضبوط کیا۔

دوسری طرف طلحہ بن اسد بھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے عیینہ بن حصن کا تعاون بھی حاصل کر لیا تھا۔ عیینہ قبیلہ فزارہ کا سردار تھا اور تقریباً ۷۰۰ سوار ہر وقت اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔

ادھر سے خالدؓ بن ولید بزاخہ کی طرف بڑھے

اُدھر سے طلحہ بن اسد اپنے لشکریوں (جو سب کے سب اسے نبی برحق تسلیم کرتے تھے، نعوذ باللہ) کے عظیم جتھے کے ساتھ مقابلہ پر بڑی شان سے نکلا۔

دونوں لشکروں کا مقابلہ چشمۂ بزاخہ پر ہوا۔

اس چشمے کے کنارے یہ قبیلہ آباد تھا اور چشمے کے نام پر ہی اس بستی کا نام بزاخہ پڑ گیا تھا۔

خالدؓ بن ولید نے جاتے ہی طلحہ کے لشکر پر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ پہلے ہی ہلّہ میں اس کے لشکر کو کافی پیچھے ہٹنا پڑا۔

میدانِ جنگ میں طلحہ کے ساتھ اس کی بیوی نوار بھی موجود تھی۔ جب دوسری مرتبہ طلحہ کا لشکر پسپا ہوا تو نوار نے طلحہ کو مشورہ دیا:

"طلحہ۔ اب بھی وقت ہے کہ تم توبہ کر کے ایمان لے آؤ۔ مسلمانوں کا سالار تمہیں ضرور معاف کر دے گا"۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا نوار"۔

طلحہ نے جواب دیا:

"جن لوگوں کو میں نے اپنے نبی ہونے کا فریب دیا ہے ان سے منہ موڑ کے کیسے بھاگ سکتا ہوں۔ مجھے آخری دم تک خالدؓ بن ولید کا مقابلہ کرنا ہے"۔

"تم بہت ضدی ہو طلحہ"۔

نوار غصہ سے بولی:

"ضدی کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ میں تم سے بھاگنے کو نہیں بلکہ ہتھیار ڈالنے کو کہہ رہی ہوں"۔

"نہیں نوار"۔

طلحہ اسی ہٹ دھرمی سے بولا:

"میں یہ نہیں کر سکتا۔ تم اپنی اور بچوں کی جان بچا کر چاہو تو بھاگ سکتی ہو۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہ ہو گا"۔

نوار کو اور غصہ آیا:

"طلحہ! تو ضدی ہی نہیں، ظالم بھی ہے۔ میں نے تیرے لیے اپنا ایمان چھوڑا۔ اپنی عاقبت بگاڑی۔ اب تو یہ چاہتا ہے کہ میں بیوی کی وفاداری اور عورت کی عزت پر بٹہ لگاؤں۔ تو چاہتا ہے کہ دنیا یہ کہے عورت بے وفا تھی کہ شوہر کو مصیبت میں چھوڑ کے بھاگ گئی"۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے نوار"۔

طلحہ نے تھکے تھکے لہجہ میں نوار کو سمجھانے کی کوشش کی:

"تم واقعی ایک وفادار بیوی ہو۔ مجھے اس بات کا بھی اقبال ہے کہ میں نے اپنے مفاد کے لیے تمہارا ایمان بھی خراب کیا مگر سوال صرف تمہارا نہیں، ہمارے بچوں کا بھی ہے۔ ان کی پرورش اور نگہداشت کے لیے تمہیں زندہ رہنا ہو گا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے لشکر کو بہت جلد شکست ہو جائے گی۔ قبل اس کے کہ لشکر شکست کھا کر بھاگے تم بچوں کو لے کر میدان سے نکل جاؤ"۔

نوار مجبور ہو گئی۔

وہ اپنے بچوں کے پاس پہنچی جو میدانِ جنگ کے ایک کونے پر ایک غلام کے ساتھ سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ طلحہ کے دو لڑکے تھے۔

نوار نے سہارا دے کر دونوں لڑکوں کو ایک گھوڑے پر سوار کیا۔ دوسرے گھوڑے پر خود سوار ہونا چاہتی تھی کہ کچھ خیال آیا۔

وہ غلام کی طرف پلٹ کر بولی:

"تم نے بڑی وفاداری کا مظاہرہ کر کے ہمارا ساتھ دیا مگر ہمارا وقت بگڑ گیا ہے۔ ہمیں شکست ہو

رہی ہے۔ اب میں تمہاری حفاظت کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی اور تمہیں آزاد کرتی ہوں۔ تم اپنی جان بچا کر جدھر چاہو جا سکتے ہو"۔

وفادار غلام نے رقت آمیز آواز میں کہا:

"مالکن! آپ نے مجھے آزاد کیا، اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں مگر میں اس مصیبت میں آپ کو تنہا چھوڑ کر اپنی جان بچانا نہیں چاہتا۔ میرا جینا مرنا اب آپ کے ساتھ ہے۔ جو آپ پر گزرے گی وہ مجھ پر گزر جائے گی تو میں سمجھوں گا میں نے حقِ نمک ادا کر دیا"۔

غلام کی اس وفاداری پر نوار کا دل بھر آیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا تمہیں اس کا اجر دے گا"۔

پھر وہ سنبھل کر بولی:

"وقت بہت کم ہے۔ تمہارے آقا میدان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ میں ایک بار پھر جا کر انہیں منانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اگر وہ آمادہ نہ ہوئے تو پھر میں بچوں کو لے کر تمہارے ساتھ کسی طرف نکل جاؤں گی۔

تم تھوڑی دیر میرا انتظار کرو۔ اگر میں جلد تک واپس نہ آؤں تو تم بچوں کو لے کر ملک شام چلے جانا۔ ہم زندہ بچے تو تمہیں ڈھونڈ لیں گے"۔

نوار تیز تیز قدم اٹھاتی طلحہ کی طرف چل پڑی۔

طلحہ نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بعد یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ وہ کبھی کبھی اپنے اوپر چادر ڈال کے بیٹھ جاتا اور لوگوں سے کہتا کہ:

"مجھ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور جبریلؑ آ رہے ہیں"۔

پھر کچھ دیر بعد وہ چادر ہٹا کر کوئی من گھڑت بات لوگوں کو سنا کر مطمئن کر دیتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ طلحہ بڑا زبان داں اور لسان تھا اور بڑی عالمانہ اور مسجع اور مقفیٰ گفتگو کیا کرتا تھا۔

نوار جب طلحہ کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر چادر اوڑھے ایک طرف بیٹھا ہے اور اس سے کچھ دور قبیلہ فزارہ کا سردار عیینہ بن حصن فزاری بے چین اور پریشان کھڑا ہے۔

نوار سمجھ گئی کہ لشکر کو شکست ہو رہی ہے۔ فزاری سردار طلحہ سے پوچھنے آیا ہو گا کہ فتح کی "وحی" کیوں نازل نہیں ہو رہی۔ طلحہ ہر جنگ کے موقع پر کہتا تھا کہ فتح کی وحی اس پر نازل ہوتی ہے۔

طلحہ نے چادر سر سے ہٹائی۔

فزاری سردار نے بے تابی سے پوچھا:

"کیا جبریلؑ وحی لے آئے؟"

"نہیں"۔

طلحہ نے سرد مہری سے جواب دیا:

"کوئی وحی نہیں۔ کوئی خبر نہیں"۔

عیینہ فزاری چیخ اٹھا:

"تو کیا وحی ہماری شکست کے بعد نازل ہو گی؟"

بڑبڑاتا ہوا عیینہ بن حصن ایک طرف چلا گیا اور پھر جنگ میں مصروف ہو گیا۔

"طلحہ!"

نوار نے اپنے شوہر سے کہا:

"اب بھی وقت ہے۔ اس فریب کاری کو چھوڑو یا مسلمان ہو جاؤ یا میرے ساتھ نکل چلو"۔

"کس طرح نکل چلوں"۔

طلحہ بے بسی سے بولا:

"میرے پیروکار مجھے جانے دیں گے کیا؟"

"طلحہ!"

نوار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

"تمہیں جنگ کرتے اتنا زمانہ گزر گیا مگر جنگ کرنے والوں کی نفسیات سے تم آگاہ نہ ہو سکے۔ میں کبھی عملاً جنگ میں شریک نہیں ہوئی لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ لشکر کو جب فتح کا یقین ہو جائے تو وہ صرف آگے کی طرف دیکھتا ہے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا مگر جب لشکر کو اپنی شکست محسوس ہونے لگے تو اس کی نظریں آگے کے بجائے بار بار پیچھے کی طرف اٹھتی ہیں۔

لشکری اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب ان کا سپہ سالار میدان چھوڑے اور وہ بھی پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوں۔

تم میدان چھوڑو گے تو وہ شکر ادا کریں گے اور تم سے زیادہ تیز رفتاری سے میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے"۔

طلحہ نے مرے ہوئے لہجے میں کہا:

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو نوار"۔

اسی وقت طلحہ نے عیینہ بن حصن فزاری کو پھر اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے فوراً اپنے اوپر چادر ڈال لی اور سمٹ کر بیٹھ گیا جیسے نعوذ باللہ اس پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

عیینہ کے قریب آنے پر طلحہ بن اسد نے چادر جسم سے الگ کر دی۔

عیینہ نے فوراً سوال کیا:

"کیا جبریلؑ کوئی وحی لائے؟"

"ہاں"۔

طلحہ نے پُروقار لہجے میں جواب دیا:

"جبریلؑ وحی لائے ہیں"۔

"کیا؟" عیینہ مزید بے چین ہو گیا۔

طلحہ نے جواب دیا:

"یہ وحی آئی ہے کہ تیرا ذکر بھی ایسا ہے جسے تو کبھی نہیں بھولے گا"۔

یہ جواب سن کر عیینہ کو بہت طیش آیا۔ اس نے طلحہ سے کہا:

"بے شک خدا کو معلوم ہے کہ عنقریب ایسے واقعات رونما ہونے والے ہیں جنہیں تو کبھی فراموش نہ کر سکے گا"۔

یہ کہہ کر عیینہ میدانِ جنگ میں آیا اور چلا کر بولا:

"اے بنی فزارہ! خدا کی قسم طلحہ نبی نہیں ہے بلکہ کذّاب ہے۔ جھوٹا ہے۔ مکار اور فریبی ہے۔ لڑائی بند کر دو اور نکل چلو"۔

بنی فزارہ یہ آواز سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔

ادھر بہت سے لشکری طلحہ کے گرد جمع ہو گئے اور پوچھا:

"اے ہمارے نبی۔ بتا ہم اب کیا کریں؟"

طلحہ فوراً اچک کے گھوڑے پر بیٹھا اور نوار کو اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ پھر پُر رعب اور [illegible] لہجے میں بولا:

"اے میری قوم! تم میں سے جو شخص میری طرح اہل و عیال کو لے کر فرار ہو سکے وہ فرار ہو جائے"۔

یہ کہہ کر گھوڑا اس نے اپنے بچوں کی طرف بڑھایا۔

غلام بچوں کو لے کر پہلے ہی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ طلحہ کے اشارے پر اس نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور طلحہ، نوار، اپنے دونوں بچوں اور غلام کے ساتھ گھوڑا اڑاتا ہوا میدانِ بزاخہ سے نکل گیا۔





نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا طلحہ بن خویلد اسدی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بزاخہ کے میدان میں شکست کھا کر شام کی طرف بھاگ گیا تھا۔ چنانچہ خالدؓ بن ولید اپنے فاتح لشکر کے ساتھ طلحہ کی بستی بزاخہ میں داخل ہوئے۔

پوری بستی ویران پڑی تھی۔ طلحہ کے حلیف قبائل کو جب معلوم ہوا کہ طلحہ میدان چھوڑ گیا ہے تو انہوں نے بھی پیٹھ دکھائی اور اپنے اپنے قبیلوں کا رخ کیا۔ باقی رہے طلحہ کے قبیلہ بنو اسد والے تو جنگ کا رخ دیکھ کر وہ پہلے ہی بستی چھوڑ گئے تھے۔

پوری بستی میں صرف چار گھر ایسے تھے جن میں ایک ایک دو دو آدمی رہ گئے تھے۔ حضرت خالدؓ جب فاتحانہ بستی میں داخل ہوئے تو صرف سات مرد اور عورتیں ان کے استقبال کو نکلے۔

ایک ادھیڑ عمر کا شخص جو اپنی بیٹی کو ساتھ لیے تھا، حضرت خالدؓ بن ولید کے گھوڑے کے قریب پہنچا اور کہا:

"خدائے وحدہٗ لاشریک نے اس بستی پر کرم فرمایا کہ مسلمانوں کے قدم یہاں آئے اور نورِ اسلام ظلمتِ کفر پر غالب آیا۔"

خالدؓ بن ولید نے گھوڑا روکا۔ نیچے اترے۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولے:

"کیا تم واقعی مسلمان ہو؟"

"الحمدللہ!" اس نے جواب دیا:

"میں صرف مسلمان نہیں بلکہ پیدائشی مسلمان ہوں"۔

"وہ کیسے؟" جنابِ خالدؓ نے حیران ہو کے پوچھا:

"اسلام کو پھیلے تو ابھی دس سال بھی نہیں ہوئے۔"

ادھیڑ عمر آدمی کے چہرے پر ایک پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی:

"اے جوان عمر اور جوان ہمت سپہ سالار۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ کفر کا اندھیرا دور ہوئے اور اسلام کا اجالا پھیلے واقعی دس سال بھی نہیں ہوئے مگر میرے آقا! فاتحِ بزاخہ! دینِ براہیمیؑ تو ہزاروں سال سے موجود ہے اور ہر زمانہ میں اس کے ماننے والے موجود رہے ہیں۔

مجھے فخر ہے کہ میرا باپ دینِ براہیمی کا پابند تھا۔ اس نے بتوں کو نہ خود سجدہ کیا اور نہ ہی مجھے کرنے دیا۔"

خالدؓ بن ولید اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نزار"۔

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"میری بیٹی "حوریہ" ہے"۔

"اس کا شوہر کہاں ہے؟"

"محترم سپہ سالار!"

بوڑھے نے جواب دیا:

"یہ بے ماں کی بچی کنواری ہے ابھی"۔

خالدؓ نے دلچسپی سے پوچھا:

"تم نے اس کی شادی کیوں نہیں کی؟"

"میں غریب آدمی ہوں سپہ سالار"۔

نزار نے جواب دیا:

"پھر کوئی معقول رشتہ بھی نہیں ملا جو میں اس کی شادی کرتا"۔

خالدؓ بن ولید کا ماتھا ٹھنکا:

"اس لڑکی میں کیا صفت ہے جو پورے بزاخہ میں اس کا جوڑ نہیں ملا"۔

"محترم سپہ سالار"۔

نزار کا انداز اور بھی پُر اسرار ہو گیا:

"طلحہ بن خویلد نے اس بستی کے تمام لوگوں کے ایمان خراب کر دیے ہیں۔ نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد اس نے نماز کا طریقہ تک بدل دیا ہے۔ وہ ....."

"طریقہ بدل دیا ہے!"

خالدؓ بن ولید نے اسے ٹوکا:

"وہ کیسے؟"

"اس نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے"

نزار نے بتانا شروع کیا:

"کہ وہ کھڑے کھڑے نماز پڑھا کریں۔ گھٹنے موڑنے اور نیچے بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"اور کوئی بات؟"

"جی ہاں"۔

نزار نے سر ہلا کر کہا:

"جھوٹے نبی نے یہ تعلیم عام کی ہے کہ اللہ کے بعد "طلحہ بن خویلد" کہا جائے اور جو دعا مانگی جائے اس میں طلحہ بن خویلد کا واسطہ دیا جائے۔

ایک عورت جتنے مردوں سے چاہے شادی کر سکتی ہے اور جس وقت چاہے کسی بھی مرد کو چھوڑ سکتی ہے"۔

خالدؓ بن ولید نے اس سے ایک ٹیڑھا سا سوال کیا:

"تم نے طلحہ کو نبی تسلیم کر لیا تھا؟"

"ہرگز نہیں"۔

بوڑھے نزار نے پُر زور انداز میں کہا:

"میں نے اسے نبی نہیں مانا"۔

"بہت خوب"۔

حضرت خالدؓ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا:

"تو تم نے اسے نبی ماننے سے انکار کر دیا!"

"جی سپہ سالار"۔

نزار نے جواب دیا:

"میں نے انکار کر دیا تھا"۔

"اسے گرفتار کر لو"۔ خالدؓ بن ولید نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔

"سپہ سالار۔ سپہ سالار"۔

نزار زور سے چیخا:

"میری کیا خطا ہے۔ میں تو مسلمان ہوں"۔

"تم جھوٹے ہو۔ مکار ہو"۔

خالدؓ نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا:

"تم کہتے ہو کہ طلحہ کو تم نے نبی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس نے تمہیں زندہ کیسے چھوڑ دیا؟ وہ تو انکار کرنے والوں کو قتل کرا دیا کرتا تھا۔ تم زندہ کیسے بچ گئے؟"

نزار کا سارا فتور ہرن ہو گیا۔ وہ روانی میں کہہ گیا تھا کہ اس نے طلحہ بن خویلد کو نبی ماننے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ طلحہ بن خویلد کے لیے یہ بات دور دور تک مشہور ہو چکی تھی کہ وہ ہر اس فرد کو قتل کرا دیتا تھا جو اسے نبی نہ مانتا۔ چنانچہ بزاخہ میں صرف وہی لوگ رہتے تھے جو طلحہ کو نعوذ باللہ نبی مانتے اور اس کے احکام کی پابندی کرتے تھے۔

نزار کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس کی مبینہ بیٹی حوریہ نے باپ کی گرفتاری پہ کوئی احتجاج نہ کیا۔ وہ چپ چاپ کھڑی ان کی گفتگو سنتی رہی تھی۔

نزار کی گرفتاری کے بعد اس نے جناب خالدؓ سے کہا:

"میرے لیے کیا حکم ہے سپہ سالار؟"

اس کے لہجے میں بلا کی استقامت تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید اس کے لہجے کی کھنک اور تمکنت پہ چونک اٹھے۔

انہوں نے دریافت کیا:

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"بے سہارا ہوں۔ مجھے سہارا چاہیے مسلم سپہ سالار"۔ حوریہ نے بڑے ناز سے کہا۔

"تم اپنے باپ کے بارے میں کیا کہتی ہو؟" خالدؓ بن ولید نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

حوریہ گھبرا گئی:

"جی — میں سمجھ نہیں سکی مسلم سردار"۔

خالدؓ بن ولید نے لہجہ ذرا سخت کر کے کہا:

"کیا تمہیں انکار ہے کہ تمہارا باپ جھوٹا اور مکار ہے"۔

حوریہ نے خالدؓ بن ولید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا:

"وہ میرا باپ نہیں ہے"۔

جنابِ خالدؓ چونک پڑے:

"پھر وہ کون ہے؟" ان کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

"وہ نزار ہے مسلم سردار۔"

اس نے بے خوفی سے جواب دیا:

"ایک خود غرض اور مفاد پرست آدمی۔ نہ جانے اس نے مجھے کہاں سے حاصل کیا۔ اس نے مجھے پالا ضرور ہے مگر میرا دل ابھی تک اسے اپنا باپ تسلیم نہیں کر سکا۔"

حوریہ کے لہجے میں اچانک تھکن اور کسک سی اتر آئی:

"نزار نے مجھے سب کچھ دیا مگر ایک باپ کا پیار نہ دے سکا۔ اس نے شروع ہی سے مجھے اپنی روش پر لگا لیا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ وہ جس ملک یا شہر میں جاتا ہے وہاں کے لوگوں کا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ نزار نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملاؤ اور اپنے آپ کو کسی پر ظاہر نہ کرو"۔

خالدؓ بن ولید کو اس سے الجھن ہونے لگی۔

"فضول باتیں کر کے تمہیں کچھ حاصل نہ ہو گا"۔

انہوں نے حوریہ کو مزید بولنے سے روک کر کہا:

"میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں کہانیاں سنتا پھروں۔ صرف یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

حوریہ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ افسردگی سے بولی:

"مسلم سردار! آپ اسے کہانی کہتے ہیں۔ یہ تو اس ظلم کی حقیقی باتیں ہیں جو نزار نے مجھ پر توڑے ہیں

میں ایک ظالم کے ساتھ رہتے ہوئے بھی مظلوم ہوں۔

نزار نے ان گنت قتل کیے ہیں۔ اس نے مجھ سے بھی کئی قتل کرائے۔ وہ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کا ہر مذہب جھوٹا ہے۔ اس کے خیال میں سچا مذہب یہ ہے کہ تمام مذاہب کو جھوٹا کہا جائے اور ہر مذہب والے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے —"

"چپ ہو جاؤ"۔

جنابِ خالدؓ نے اسے پھر روکا:

"مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو میں تمہاری شادی کسی اچھے آدمی سے کرا دوں"۔

"شادی!"

حوریہ دیوانوں کی طرح ہنس پڑی:

"نہیں سردار۔ مجھ سے اب یہ ظلم نہیں ہو گا"۔

"تم شادی کو ظلم کہتی ہو؟"

جنابِ خالدؓ نے تعجب سے پوچھا:

"کیا تمہیں اس کا تجربہ ہے!؟"

"جی ہاں۔ مسلم سردار"

حوریہ نے سنبھل کے کہا:

"میں نزار کے حکم پر کئی خوبصورت جوانوں سے شادی کر چکی ہوں اور پہلی ہی شب اپنے شوہر کے سینے میں خنجر اتار چکی ہوں"۔

"تم اپنے سر قتل کا الزام لے رہی ہو"۔

خالدؓ بن ولید نے اسے خبردار کیا:

"اس کی سزا موت ہو سکتی ہے"۔

"اسی لیے تو میں اپنے جرم کا اقبال کر رہی ہوں"۔

حوریہ نے بڑے حوصلے سے کہا:

"میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی مگر مجھے جس مرد نے چاہا۔ اسے میں نے نزار کے حکم پر قتل کر دیا"۔

جنابِ خالدؓ نے پوچھا:

"آخر نزار لوگوں کو قتل کیوں کراتا تھا؟"

حوریہ نے جواب دیا:

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی، سوائے اس کے کہ بہتا ہوا، خاص کر کسی جوان کا بہتا ہوا خون دیکھ کر وہ بے انتہا مسرور ہوتا تھا"۔

"اس لڑکی کو بھی اس کے باپ کے ساتھ قید میں رکھا جائے"۔

حضرت خالدؓ نے حکم دیا:

"یہ قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی مریض بھی ہیں۔ انہیں دربارِ خلافت میں بھیجا جائے گا۔ ان کا فیصلہ وہیں ہوگا"۔

"مسلم سردار"۔

اس حکم پہ حوریہ نے احتجاج کیا:

"مجھے اس کے خیمے میں مت قید کیجیے۔ وہ میرا باپ نہیں ہے"۔

"قاتل صرف قاتل ہوتے ہیں"۔

جنابِ خالدؓ نے سرد لہجے میں کہا:

"ان دونوں کی اچھی طرح حفاظت کی جائے۔ یہ صرف اسلام ہی کے دشمن نہیں ہیں بلکہ انسانیت کے بھی دشمن ہیں"۔

حوریہ کو بھی نزار کے خیمے میں قید کر دیا گیا۔

دوسری صبح کو ایک عجب واقعہ پیش آیا۔

جس خیمے میں نزار اور حوریہ قید تھے، اس کے ایک محافظ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو آ کے یہ اطلاع دی کہ:

"سپہ سالار۔ دونوں قیدی مردہ پڑے ہیں"۔

"مردہ پڑے ہیں!"

حضرت خالدؓ اٹھ کر کھڑے ہوگئے:

"انہیں کس نے مارا ہے۔ پہرے پہ کون تھا؟"

سپہ سالار"۔

پہرے دار نے بتایا:

"آدھی رات کے بعد میں اور میرا ساتھی، جسے میں وہاں چھوڑ کے آیا ہوں، پہرے پہ آئے تھے۔ اس وقت دونوں قیدیوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بات پہ جھگڑ رہے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ خیمے میں خاموشی طاری ہوگئی۔

صبح کو میرے ساتھی نے جھانک کے دیکھا تو وہاں خون ہی خون تھا۔ میں یہ دیکھ کے سیدھا آپ کو اطلاع دینے چلا آیا"۔

خالدؓ بن ولید، پہریدار کے ساتھ اس خیمہ پر گئے جہاں نزار اور حوریہ کو رکھا گیا تھا۔ خیمے کے اندر خون ہی خون بکھرا ہوا تھا اور دونوں لاشیں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔

جنابِ خالدؓ نے پہرے داروں کو حکم دیا کہ لاشوں کو الٹ پلٹ کے دیکھا جائے۔ ایسا کرنے پر لاشوں کے نیچے سے دو خنجر برآمد ہوئے۔ دونوں خنجر ایک ہی ساخت اور یکساں شکل کے تھے۔

لاشوں پر خنجر کے نشانات دیکھے گئے تو پتہ چلا کہ نزار کے سینے میں خنجر مارا گیا تھا اور حوریہ کی پیٹھ میں خنجر دستے تک گھسا ہوا تھا۔

جنابِ خالدؓ نے فوجی جراح کو بلوا کر معائنہ کرایا تو اس نے انکشاف کیا:

"سردارِ محترم۔ خنجر زہر میں بجھے ہوئے ہیں اور زہر اس قدر ہلاہل معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے اُف تک نہ کر سکے اور ختم ہو گئے"۔

جنابِ خالدؓ نے کھوجیوں کو بلا کر حکم دیا:

"معلوم کرو کہ باہر کسی کے قدموں کے نشان تو نہیں ہیں؟"

انہوں نے دیکھ بھال کے بعد بتایا کہ سوائے پہریداروں کے اور کسی کے قدموں کے نشان دور دور تک موجود نہیں۔

لاشوں کے پاس خنجروں کا پایا جانا ہی یہ ظاہر کرتا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر حملہ کیا اور زہر نے دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ پھر بھی حضرت خالدؓ نے احتیاط کے طور پہ اپنی پوری تسلی کر لی کہ ان پر کسی نے باہر سے حملہ تو نہیں کیا۔

نزار اور حوریہ دونوں ہی واجب القتل تھے اور اگر وہ دربارِ خلافت میں پیش ہوتے تو وہاں سے بھی انہیں قتل ہی کی سزا ملتی مگر یہ قتل بڑا گھناؤنا تھا۔

خالدؓ بن ولید کی طبیعت بےحد مکدر تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ ایک گڑھا کھود کے ان دونوں کو اسی طرح زمین میں دبا دیا جائے کیونکہ وہ دونوں منافق، مرتد اور کافر تھے۔

جناب خالدؓ بن ولید یہ حکم دے کر اپنے خیمے میں جانے ہی والے تھے کہ انہیں اطلاع دی گئی کہ طلحہ بن خویلد کا حلیف عیینہ بن حصن فزاری گرفتار کر لیا گیا ہے۔

عیینہ بن حصن فزاری مرتد ہو کر طلحہ بن اسدؓ پر ایمان لے آیا تھا مگر جب طلحہ کو شکست ہونے لگی تو اس نے طلحہ سے جا کر پوچھا:

"اے نبی! کیا تیرے اوپر فتح کی وحی نازل ہوئی کہ نہیں؟"

طلحہ نے اسے گول مول جواب دیا۔

طلحہ کے بے تکے جواب پر عیینہ اس نتیجے پر پہنچا کہ طلحہ جھوٹا نبی ہے۔ پس اس نے طلحہ کی جھوٹی نبوت کا بھانڈا میدانِ جنگ ہی میں پھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں کو لے کر لشکر سے الگ ہو گیا۔

پھر جب طلحہ میدانِ جنگ سے بھاگا تو اس کا تعاقب کیا گیا۔ وہ تو بچ کے نکل گیا مگر عیینہ بن حصن گرفتار کر لیا گیا جو میدانِ جنگ سے تھوڑی دور ٹھہرا ہوا جنگ کے نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے تیس ساتھی بھی پکڑے گئے۔

عیینہ بن حصن کی گرفتاری کی اطلاع پا کر خالدؓ بن ولید اسی جگہ بیٹھ گئے جہاں نزار اور حوریہ کی لاشیں وہاں رکھی گئی تھیں۔

حضرت خالدؓ نے حکم دیا:

"عیینہ کو یہیں پیش کرو"۔

چنانچہ عیینہ کو جناب خالدؓ کے سامنے لایا گیا۔

عیینہ ابھی مسلم سپہ سالار کو سلام بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی نظر حوریہ اور نزار کی لاشوں پر پڑی وہ چونک کر رک گیا۔

ایک لمحہ لاشوں کو دیکھنے کے بعد عیینہ، مسلم سپہ سالار کے سامنے پہنچا۔ اور بڑے مہذب طریقہ سے کہا:

"میں اسلامی لشکر کے سالار کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میں نے اگرچہ آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ بانیٔ اسلام حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے آپ کو آپ کی بہادری کے صلہ میں سیف اللہ کا خطاب عطا فرمایا تھا"۔

"میں تم سے اپنی تعریف سننا نہیں چاہتا"۔

خالدؓ بن ولید نے سرد لہجے میں کہا:

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم پہلے مسلمان تھے۔ پھر جب ہمارے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انتقال فرمایا تو تم اسلام سے پھر گئے اور تم نے جھوٹے نبی طلحہ پر ایمان لانے کا گناہ کیا؟"

"اے مسلم سردار سیف اللہ!"

عیینہ نے بڑے اطمینان سے کہا:

"میں جھوٹ بول کر اپنی جان نہیں بچانا چاہتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں پہلے مسلمان تھا پھر ہادیٔ برحق محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال پر گمراہ ہو گیا اور میں نے اسلام سے منہ موڑ لیا۔

یہ بھی سچ ہے کہ میری گمراہی نے مجھے طلحہ بن خویلد کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا اور میں طلحہ کے فریب میں کل تک گرفتار رہا۔ مگر کل میں نے طلحہ کی نبوت سے انکار کر دیا تھا"۔

"اس لیے کہ کل طلحہ کو شکست ہو گئی تھی"۔

خالدؓ بن ولید نے فوراً لقمہ دیا:

"اور تمہیں اس کی نبوت سے انکار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا!"

"مسلم سردار"۔

عیینہ بن حصن نے احتجاج کیا:

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جھوٹ بول کر اپنی جان نہیں بچانا چاہتا اس لیے کہ میرے قتل کے لیے صرف یہی جرم کافی ہے کہ میں نے اسلام سے منہ موڑا تھا۔

مگر مسلم سردار — میں آپ سے اختلاف کی معافی مانگ کر یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے کل طلحہ کی شکست سے پہلے ہی اس کی نبوت سے انکار کر دیا تھا اور میدان میں پکار پکار کے کہا تھا کہ طلحہ جھوٹا نبی ہے۔

اس کے علاوہ میں نے اپنی قوم یعنی بنو فزارہ کے تمام لوگوں کو طلحہ کے لشکر سے نکال لیا تھا اور میں شکست سے بہت پہلے طلحہ کے لشکر کو چھوڑ کر اس جگہ پہنچا تھا جہاں سے مجھے گرفتار کیا گیا ہے"۔

خالدؓ بن ولید نے اسے ٹوکا:

"اس کا مطلب ہے تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب تم مسلمان ہو گئے ہو؟"

"مسلم سردار"۔

عیینہ نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا:

"مسلمان تو میں اسی وقت ہو گیا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ طلحہ کاذب اور مکار ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔

جنابِ خالدؓ نے نرم پڑتے ہوئے کہا:

"تم مسلمان ہو گئے ہو تو میں تمہیں قتل نہیں کروں گا لیکن تمہیں اپنے خط کے ساتھ دربارِ خلافت میں بھیجوں گا۔ تمہارا فیصلہ وہیں ہوگا"۔

"مجھے دربارِ خلافت سے ہونے والے فیصلے کا کوئی گلہ نہ ہوگا"۔

عیینہ نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا:

"اس لیے کہ میں مرتد رہا ہوں۔ میرے قتل کے لیے یہی جواز کافی ہے مگر مجھے ایک بات کی خوشی ضرور ہے مسلم سردار"۔

خالدؓ نے دلچسپی سے پوچھا:

"وہ کیا بات ہے؟"

"خوشی مجھے ان دونوں لاشوں کو دیکھ کر ہوئی ہے"۔

عیینہ نے بشاشت سے کہا:

"آپ نے ان کو قتل کر کے پوری انسانیت پر احسان کیا ہے"۔

جنابِ خالدؓ نے پوچھا:

"کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"اسے کون نہیں جانتا مسلم سردار"۔

عیینہ بن حصن نے جواب دیا:

"یہ بہت بڑا منافق تھا۔ طلحہ سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ طلحہ اس کے ذریعے اپنے مخالفوں کو قتل کرا یا تھا اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سے پوچھ سکے یا طلحہ سے شکایت کرے۔

اس کا نام نزار ہے اور اس کی فرضی بیٹی کو لوگ حوریہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ ان دونوں نے اب تک دو درجن سے زائد جوانوں کو اپنے جال میں پھانس کر قتل کر دیا ہے"۔

خالدؓ بن ولید کسی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر وہ ایک دم چونکے جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا ہو۔

"عیینہ!"

انہوں نے یکایک کہا:

"تم فزارہ قبیلے کے سردار ہو۔ اور تمہارا قبیلہ بنو غطفان کی ایک ذیلی شاخ ہے؛"

"جی ہاں سردار"۔

عیینہ نے جنابِ خالدؓ کی بات کی تصدیق کی:

"آپ بالکل درست فرما رہے ہیں"۔

"تو پھر تم نعیم بن مسعود اشجعی کو ضرور جانتے ہو گے؟" آپ نے دوسرا سوال کیا۔

"کیوں نہیں سردار"۔

عیینہ نے کہا:

"نعیم بن مسعود اشجعی بنو غطفان کے سردار ہونے کے علاوہ بہت بڑے رئیس بھی ہیں۔ کسی زمانے میں ابو سفیانؓ سے ان کی بہت دوستی تھی"۔

"تو تم نعیم بن مسعود کے بھتیجے ابنِ حاتم کو بھی جانتے ہو گے؟" جنابِ خالدؓ نے عیینہ کی پوری بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اگلا سوال کر دیا۔

خالدؓ بن ولید دراصل ابنِ حاتم کے لیے بہت بے چین اور پریشان تھے جس کا چار دن سے کوئی پتہ نہ چل رہا تھا۔

"آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں سردار"۔

عیینہ نے جواب میں کہا:

"میں ابنِ حاتم کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ اس کے بارے میں مجھے بہت سی معلومات بھی ہیں!"

"تم کیا جانتے ہو عیینہ!"

حضرت خالدؓ نے بے چینی سے پوچھا:

"کیا ابنِ حاتم زندہ ہے؟"

"مسلم سردار"۔

عیینہ بن حصن نے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے کہا:

"تین چار دن پہلے تو میں نے اسے زندہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے پتہ نہیں"۔

"کہاں دیکھا تھا؟"

جنابِ خالدؓ کی بے تابی کچھ اور بڑھ گئی:

"کس جگہ تھا وہ۔ جلدی بتاؤ عیینہ۔ ابنِ حاتم ہمارا خاص آدمی ہے"۔

"مسلم سردار"۔

عیینہ بن حصن نے انکشاف کیا:

"آپ میری بات کا یقین کیجیے، میں نے ابنِ حاتم کو تین دن پہلے اسی بدبخت نزار کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا کہ مسلم لشکر بزاخہ کے قریب پہنچ گیا ہے اور نعیم بن مسعود کا بھتیجہ ابنِ حاتم جاسوسی کی غرض سے بستی بزاخہ میں آیا ہے۔

میں نے اس کی اطلاع طلحہ بن خویلد کو بھی دی تھی مگر اس نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اس نے نزار کو مسلمان جاسوس کی گرفتاری کا کام سونپا ہے"۔

اس انکشاف نے خالدؓ بن ولید کو ایک نئی الجھن میں ڈال دیا:

"عیینہ!"

انہوں نے نرمی سے کہا:

"میں خلیفہ سے سفارش کروں گا کہ تمہیں معاف کر دیا جائے مگر تمہیں میرا یہ کام کرنا ہو گا کہ تم ابنِ حاتم کو کسی طرح بھی ڈھونڈ نکالو"۔

"آپ اطمینان رکھیے سردار"۔

عیینہ نے حضرتِ خالدؓ کو یقین دلایا:

"میں ابنِ حاتم کو تلاش کرنے کی اپنی امکانی کوشش کروں گا۔ اس لیے نہیں کہ آپ خلیفہ سے میری سفارش کریں بلکہ اس لیے کہ کل تک جو مسلمان میرے لیے بے حقیقت تھے اب وہی مسلمان میرے بھائی ہیں اور اسی جذبہ کے تحت میں ابنِ حاتم کو ڈھونڈ نکالنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا"۔

جنابِ خالدؓ نے عیینہ کے ساتھ پانچ سوار کر دیے اور کہا:

"عیینہ! یہ نہ سمجھنا کہ میں نے یہ سوار تمہارے ساتھ اس وجہ سے کیے ہیں کہ تم کہیں بھاگ نہ جاؤ بلکہ شاید تمہیں کسی موقعہ پہ طاقت کی ضرورت پڑے۔ اس وقت یہ سوار تمہارے کام آئیں گے"۔

"میں سمجھتا ہوں سردار"۔ عیینہ نے کہا۔

پھر وہ پانچوں سواروں کو ساتھ لے کر ابنِ حاتم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

نزار کا مکان ایک عام سی قلعہ نما حویلی تھی۔ اس میں صرف ایک بڑا دروازہ تھا۔ دیواریں مٹی کی مگر بہت موٹی اور بھدی تھیں۔

دروازے پر دو مسلح پہریدار تھے۔ ان کے پاس تلوار کے علاوہ تیر کمان بھی تھے۔ عیینہ بن حصن نے ایک سوار سے کہا:

"تم جا کر پہریدار سے پوچھو کہ اس کا آقا نزار کہاں ہے۔ جب وہ جواب دے کہ اس کا آقا موجود نہیں ہے تو اسے کہنا کہ بزاخہ کے حاکم کا ایک سردار نزار سے ملاقات کو آیا ہے اس لیے دروازہ کھول دیا جائے وہ انتظار کر لے گا"۔

عیینہ چار سواروں کے ساتھ دور کھڑا ہو گیا۔

اس کا بھیجا ہوا سوار پہریداروں کے پاس گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے سوار اور پہریداروں میں کچھ تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ شاید پہرے دار دروازہ کھولنے پہ آمادہ نہ تھے۔

عیینہ بھی باقی سواروں کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں پہریدار؟" اس نے سوار سے پوچھا۔

سوار نے عیینہ کو بتایا:

"سردار۔ یہ دونوں یا تو واقعی گونگے ہیں یا پھر اپنے آپ کو گونگا بہرہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا کوئی اشارہ سمجھ میں نہیں آتا۔

جب میں نے ان سے کہا کہ دروازہ کھول دیں تو انہوں نے قبضۂ شمشیر پہ ہاتھ رکھ لیے جیسے ابھی لڑ پڑیں گے"۔

عیینہ نے اپنے سواروں سے کہا:

"جاؤ۔ اور ان پہریداروں سے دروازہ کھلنے کو کہو۔ اگر وہ انکار کریں تو انہیں قابو میں کر کے دروازہ کھول دو۔"

سب سوار پیدل ہو گئے۔ پھر تلواریں سونت کر پہریداروں کی طرف بڑھے اور اس انداز سے کہ جیسے جاتے ہی ان پر حملہ کر دیں گے۔

مثل مشہور ہے کہ مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے۔ یہی حال ان پہریداروں کا ہوا۔ ایک اکیلے سے تو وہ اکڑ رہے تھے مگر اب پانچ کو دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے۔

پھر جب ان کے قریب پہنچ کر ایک سپاہی نے انہیں شمشیر کی نوک سے دروازہ کھولنے کا حکم دیا تو ایک گونگا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور جیب سے چابی نکال کر تالہ کھول دیا۔

حویلی میں جانے سے پہلے عبینیہ نے حکم دیا:

"ان دونوں کے ہتھیار چھین کر ان کے ہاتھ پاؤں ان کی پگڑیوں سے اچھی طرح باندھ دو۔ دشمن کو کسی طرح بھی کمزور نہ سمجھنا چاہیے۔"

سپاہیوں نے عبینیہ کے حکم کی تعمیل کی اور دونوں کو مضبوطی سے باندھ کے دروازے کے ایک کنڈے سے کس دیا۔

پھر عبینیہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

باہر سے ٹوٹی پھوٹی نظر آنے والی یہ حویلی اندر سے شاہی محل کی طرح سجی ہوئی تھی۔ حویلی میں چار بڑے اور چار چھوٹے کمرے تھے۔ درمیان میں ایک بہت بڑا ہال تھا۔

تمام کمرے آراستہ و پیراستہ تھے۔ جب یہ لوگ ہال میں پہنچے تو انہیں ایک تخت پر کوئی لیٹا ہوا دکھائی دیا۔

یہ سب دبے پاؤں تخت کی طرف بڑھے۔ تخت پر پڑا ہوا شخص شاید سو رہا تھا۔ یہ لوگ تخت کے قریب پہنچ گئے مگر اسے کوئی خبر نہ ہوئی۔

عبینیہ نے جھک کر دیکھا، وہ مرد نہیں بلکہ ایک عورت تھی۔ بوڑھی عورت، جو واقعی بے خبر سو رہی تھی۔

عبینیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے ہلایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی اور گھبرا کے ہال کے ایک کونے کی طرف دیکھنے لگی۔

عبینیہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو پتہ چلا کہ وہ ہال کے کونے میں ایک بند دروازے کو

دیکھ کے گھبرا رہی ہے۔

عبینیہ نے ڈپٹ کر پوچھا:

"اس کمرے میں کون ہے جس میں تالا پڑا ہے؟"

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا بس اس کا منہ تکتی رہی۔

عبینیہ نے اپنا سوال دہرایا مگر اسے پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرایا اور خود کلامی کے انداز میں بولا:

"معلوم ہوتا ہے کہ نزار نے اپنے تمام ملازم گونگے اور بہرے رکھے تھے۔"

عبینیہ نے بڑھیا سے اشارہ میں پوچھا کہ اس دروازے کی چابی کہاں ہے؟ بڑھیا اس کا اشارہ سمجھ گئی مگر چابی دینے کے بجائے اس نے اپنی جیب مضبوطی سے پکڑ لی۔

عبینیہ نے ایک سپاہی کو حکم دیا:

"اس سے چابی حاصل کرو۔"

سپاہی نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے تو اس نے فوراً چابی جیب سے نکال کے دیدی۔ عبینیہ نے اسے بھی ایک ستون سے بندھوا دیا۔

پھر اس کونے والے کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔

یہ بہت بڑا کمرہ تھا اور پوری طرح آراستہ تھا۔ اس کے اندر ایک اور دروازہ تھا اور اس میں بھی تالا پڑا ہوا تھا۔

عبینیہ نے ایک سپاہی سے کہا:

"جا کر بڑھیا کی اچھی طرح تلاشی لو۔ شاید اس کمرے کی چابی بھی اس کے پاس ہو۔"

سپاہی نے جا کر بڑھیا کی تلاشی لی مگر دوسری کوئی چابی نہ ملی۔ تب عبینیہ نے حکم دیا:

"تالا توڑ دو۔"

ذرا سی کوشش کے بعد تالا ٹوٹ گیا۔ عبینیہ نے دروازہ کھول کے دیکھا تو اسے ایک زینہ نیچے کی طرف جاتا دکھائی دیا۔

عبینیہ نے آواز دی:

"کوئی اندر ہے تو بول دے۔ ہم اس کے ہمدرد ہیں اور اس کی جان بچانے آئے ہیں۔"

اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

عیینہ نے شمع منگائی اور اس کی روشنی میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ سیڑھیوں کے بالکل ساتھ ہی کوئی شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔

عیینہ نے اسے پلٹ کر دیکھا تو اس کے منہ سے نکلا:

"تم یہاں ہو ابنِ حاتم؟"

عیینہ نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض چل رہی تھی۔

"خدا کا شکر ہے تم زندہ ہو"۔

عیینہ بڑبڑایا پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا:

"اسے اوپر لے چلو"۔

عیینہ نے شمع کی مدھم روشنی میں تہ خانہ میں ایک نظر ڈالی۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ تہ خانہ بھی حویلی کے دوسرے کمروں کی طرح سجا ہوا تھا۔

مزید یہ کہ اس میں ایک بڑا سا چھپر کھٹ بھی بچھا تھا جس پر اعلیٰ قسم کا بستر تھا اور کئی ریشمی تکیے رکھے تھے۔

ابنِ حاتم تہ خانے سے باہر نکلتے ہی ہوش میں آ گیا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ عیینہ بن حصن نے قریب آ کر اسے تسلی دی:

"گھبراؤ نہیں ابنِ حاتم۔ ہم خالدؓ بن ولید کے آدمی ہیں۔ تمہیں تلاش کرنے نکلے تھے۔ الحمد للہ کہ ہم تم تک پہنچ گئے"۔

ابنِ حاتم نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ دل ہی دل میں خدائے وحدہٗ لاشریک کا شکر ادا کر رہا ہو۔

خالدؓ بن ولید نے ابنِ حاتم کی بازیابی پہ عیینہ بن حصن کا ذاتی طور پر شکر ادا کیا مگر اس کی جان بخشی کے لیے دو شرائط رکھیں:

پہلی شرط یہ کہ وہ اپنے آدمیوں میں سے وہ افراد، خالدؓ بن ولید کے حوالے کر دے جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا یا انہیں اذیتیں اور تکلیفیں دی ہیں۔

دوسری شرط یہ تھی کہ جب وہ ایسے افراد کو ان کے حوالے کر دے گا تو اسے دربارِ خلافت میں بھیج دیا جائے گا۔ آخری فیصلہ خلیفۂ وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی کریں گے۔

عیینہ نے یہ شرائط مان لیں۔



بنو عامر بن صعصعہ بھی طلحہ کے طرفداروں میں تھے مگر جنگ کے دوران انہوں نے طلحہ کی طرف سے حصہ نہیں لیا تھا۔

بنو عامر چشمۂ بزاخہ سے کچھ فاصلہ پر آباد تھے۔ وہ جنگ کے زمانہ میں اس انتظار میں رہے کہ جو فتح حاصل کرے گا یہ اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔

طلحہ کی طاقت زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ قبائل بھی زیادہ تھے۔ بنو عامر کا خیال تھا کہ طلحہ جنگ جیت جائے گا مگر اسے شکست ہو گئی۔

بنو عامر، طلحہ کی غیر متوقع شکست سے بہت پریشان ہوئے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ لشکرِ اسلام میں جا کر مسلمان ہو جانے کا اعلان کریں۔

چنانچہ بنو عامر نے جناب خالدؓ بن ولید کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کر لیا۔

بیعت کے الفاظ اس طرح تھے:

"ہم اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔ نماز برابر پڑھیں گے اور زکات ادا کرتے رہیں گے۔

انہی الفاظ کے ساتھ ہم اپنے لڑکوں اور عورتوں کی طرف سے بھی بیعت کرتے ہیں"۔

خالدؓ بن ولید کے کہنے پر بنو اسد، بنو عامر اور فزارہ قبائل کے ان لوگوں کو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا یا جلایا تھا جناب خالدؓ کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے انہیں قتل کرا دیا۔

اس کے بعد عیینہ بن حصن کو قرہ بن ہبیرہ کے ساتھ پہرے میں دربارِ خلافت روانہ کیا اور ساتھ ہی ایک خط بھی بھیجا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

"بنی عامر ارتداد کے بعد اسلام لے آئے لیکن میں نے ان کی جان بخشی اس وقت تک نہیں کی جب تک انہوں نے ان لوگوں کو میرے حوالے نہیں کر دیا جنہوں نے بے کس مسلمانوں پر مظالم ڈھائے تھے۔ میں نے ایسے تمام

لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔

اس خط کے ہمراہ میں قرہ بن ہبیرہ اور عیینہ بن حصن کو ان کے ساتھیوں سمیت روانہ کر رہا ہوں۔"

جب ان لوگوں کو دربارِ خلافت میں پیش کیا گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے انہیں معاف کر دیا اور جناب خالدؓ بن ولید کو خط لکھا کہ:

"خدا تعالیٰ اپنے انعامات سے تمہیں بہرہ ور کرتا رہے۔ میری تمہارے لیے نصیحت ہے کہ تم اپنے معاملات میں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور ہمیشہ تقویٰ کی راہ پر چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور لوگوں پر احسان کرتے ہیں۔"



ابنِ حاتم چار دن اور چار راتیں بے آب و دانہ قید خانہ میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔ اس کی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی۔ لشکری حکیم نے اسے کئی طاقت ور مشروب پلوائے۔ تب دو دن بعد جا کر اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔

جنابِ خالدؓ کے دریافت کرنے پر ابنِ حاتم نے اپنے قید و بند کے بارے میں مختصر طور پر انہیں اس طرح بتایا:

"میں بزاخہ کی بستی میں بڑی احتیاط سے داخل ہوا مگر ایک ادھیڑ عمر آدمی نے میرا اس طرح استقبال کیا جیسے وہ مجھے عرصے سے جانتا تھا۔ اسے لشکرِ اسلام کے تمام بڑے بڑے سرداروں کے نام اور لشکر کی صحیح تعداد کا بھی علم تھا۔

میں اس کی معلومات پر حیران ہو رہا تھا کہ اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ اس نے مجھ سے رازدارانہ انداز میں کہا:

"اے مسلم نوجوان! مجھے معلوم ہے کہ تم اس بستی میں کیوں آئے ہو۔ تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں چونکہ دل سے مسلمان ہوں اس لیے لشکرِ اسلام کے بارے میں مجھے تمام باتوں کا علم ہے۔

اسی طرح چونکہ مجھے طلیحہ بن خویلد اسدی سے نفرت ہے کہ اس نے ہمارے نبی محمدؐ کے مقابلہ پر خود نبی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ وہ میرا اور میں اس کا دشمن ہوں۔ پس میں طلیحہ اس کے

حواریوں اور ان تمام قبائل کے کچے چٹھے سے واقف ہوں جس سے شاید ہی کوئی اور یہاں واقف ہو"۔

وہ اس قدر چرب زبان تھا کہ میں نہ صرف اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا بلکہ اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

اس نے مزید کہا کہ:

"اے نوجوان! تم ایک صحیح آدمی سے ملے ہو۔ اس لیے اب تمہیں کسی بات کی نہ تو فکر ہونی چاہیے اور نہ تردد کرنا چاہیے۔

میں نے بہت دن حالتِ کفر اور شرک میں گزارے ہیں۔ چنانچہ اب میں اسلام کی خدمت کرکے اپنے پچھلے گناہوں کو دھونا چاہتا ہوں"۔

یقین کیجیے سردارِ معظم! میں اس کی باتوں میں ایسا کھو یا کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ اس نے مجھے گھر چلنے کو کہا اور میں بغیر کسی عذر کے اس کے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے اس نے مجھ پہ سحر کر دیا ہو۔

پھر جب میں اس کی حویلی پہ پہنچا تو مجھے کچھ شک ہوا۔ کیونکہ حویلی کے دروازے پہ دو مسلح پہریدار تھے جن سے وہ اشاروں میں باتیں کر رہا تھا۔

شاید اسے میرے دل کا حال معلوم ہو گیا۔ اس لیے اس نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ:

"میرے دونوں ملازم گونگے اور بہرے ہیں مگر بہت وفادار، ہمدرد اور مونس ہیں۔ اسی لیے انہیں ملازم رکھا گیا ہے۔

گھر کے اندر ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے اپنا نام نزار اور لڑکی کا نام حوریہ بتایا تھا۔

نزار نے بتایا کہ:

"طلحہ بن خویلد اسدی کو یہ شبہ ہے کہ بزاخر میں مدینہ کے مسلمانوں کے جاسوس گھس آئے ہیں۔ اس نے اپنے تمام جاسوسوں کو مسلمان جاسوسوں کا کھوج لگانے پہ مامور کر دیا ہے۔

اس کے جاسوس گھر گھر جھانکتے پھر رہے ہیں اس لیے میں گھر کے اندر بیٹھ کر باتیں نہیں کرتا بلکہ میں نے گفتگو کے لیے تہ خانے کا انتخاب کیا ہے جو اس گھر میں موجود ہے"۔

سردارِ محترم!

اس وقت میں نے زبان کھولی اور اس سے پوچھا:

"آخر تم نے کس سے گفتگو کے لیے تہ خانے کا انتخاب کیا ہے؟"

میرے اس سوال پہ وہ مسکرایا اور بولا:

"بزاخر میں میرے خیالات کے کئی مسلمان موجود ہیں جو صلاح مشورے کے لیے میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ انہیں ساتھ لے کر میں تہ خانے میں چلا جاتا ہوں اور وہیں گفتگو ہوتی ہے"۔

اس کے بعد نزار اور اس کی لڑکی حوریہ مجھے تہ خانے میں لے گئے۔ نزار مجھے اور حوریہ کو چھوڑ کر کسی کام سے اوپر چلا گیا۔

اس وقت حوریہ نے مجھ سے لگاوٹ کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا ــ اور دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ! نزار جلد آجائے تا کہ اس چڑیل سے میری جان چھوٹے۔ مگر نزار پتہ نہیں اوپر جا کر کہاں مر گیا تھا۔

میں حوریہ سے جتنا دور ہونے کی کوشش کر رہا تھا وہ اتنی ہی مجھ سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

گھبراہٹ اور پریشانی میں میرا گلا خشک ہونے لگا اور میں نے حوریہ سے پانی مانگا۔

اس نے جواب میں کہا:

"پانی تو یہاں نہیں ہے۔ ہاں انار کا شربت ضرور موجود ہے"۔

میرے گلے میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میں نے مجبوراً کہا:

"وہی لے آؤ"۔

وہ اٹھکیلیاں کرتی اٹھی اور بلوریں صراحی سے گلاس میں شربت انڈیل کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

پیاس کے مارے میری جان نکل رہی تھی۔ میں نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس حلق سے اتار لیا۔

شربت پینے کے دوران مجھے شربت میں کچھ تلخی سی محسوس ہوئی مگر پیاس اس شدت

کی تھی کہ میں نے تلخی کو بھی گوارا کر لیا اور گلاس خالی کر دیا۔

گلاس خالی کرتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ مجھے شربت کے بجائے یا تو تیز شراب دی گئی ہے یا پھر اس میں بے ہوشی کی دوا ملائی گئی ہے۔

یہ خیال آتے ہی مجھے سخت غصہ آیا اور شاید میں نے حوریہ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ تب معلوم ہوا کہ میرا ہاتھ میرے قابو میں نہیں ہے۔

میں نے جسم کو ہلا جلا کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میرا پورا جسم جیسے سُن ہو گیا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ اس وقت حوریہ نے کہا تھا:

"مسلم نوجوان! تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں سُلا دیتی ہوں۔ آؤ میرا سہارا لے کر بستر پر لیٹ جاؤ۔"

قریب ہی ایک مسہری بچھی تھی جس پہ سفید یا رنگین بستر بچھا تھا۔ حوریہ مجھے سہارا دے کر یا گھسیٹ کر مسہری تک لے گئی اور مجھے لٹا دیا۔ اور . . . . . اور . . . . . پھر وہ میرے برابر ہی لیٹ گئی۔ میں اس سے الگ نہ ہو سکا۔ اس کی طرف سے کروٹ بھی نہ بدل سکا۔ میری آنکھیں شدید دباؤ سے بند ہو رہی تھیں۔ پھر میں بے خبر ہو گیا اور مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا۔"

خالدؓ بن ولید نے ابنِ حاتم کا حکیم سے پوری طرح معائنہ کرایا۔ حکیم نے معائنہ کرنے کے بعد خالدؓ بن ولید کو بتایا کہ:

"ابنِ حاتم کو شراب یا شربت میں کوئی ایسی زہریلی چیز دی گئی ہے جس نے اس کے اعضاء کو بری طرح مضمحل کر دیا ہے۔ اس لیے ابنِ حاتم کی تندرستی کے لیے دو تین ماہ تک مکمل آرام اور بے حد احتیاط کی ضرورت ہے"۔

جنابِ خالدؓ نے اسی دن ابنِ حاتم کو مدینہ بھجوا دیا اور اسے پیار سے حکم دیا:

"وہاں جا کر پوری طرح آرام کرو"۔

اس طرح ابنِ حاتم میدانِ جنگ سے کچھ عرصہ کے لیے دور ہو گیا۔ اس کا دل تو نہ چاہتا تھا لیکن اس کی جسمانی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ جہاد میں حصہ لے سکتا۔ چنانچہ بادلِ نخواستہ وہ اپنے مشفق و مہربان سپہ سالار کے حکم پہ مدینہ روانہ ہو گیا۔

خالدؓ بن ولید نے تقریباً ایک ماہ بزاخہ میں گزارا جس کے دوران انہوں نے ارد گرد کے علاقوں میں امن و امان قائم کیا اور لوگوں سے مطلوبہ زکات کا کام نپٹایا۔

اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ طلحہ بن خویلد اسدی کے قبیلہ کے بہت سے لوگ بھاگ کر بنو فزارہ کے قبیلے میں پہنچ گئے ہیں اور بنو فزارہ کی ایک سردارنی ام زمل سلمٰی بنت مالک بن حذیفہ نے انہیں اپنے پاس پناہ دی ہے۔

ام زمل بڑی خوبصورت عورت تھی۔

قبیلہ بنو فزارہ کے اصل سردار عیینہ بن حصن اپنے تین آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے تھے اور اب ان کی جگہ ام زمل نے قبیلہ کی سرداری سنبھال لی تھی۔

سردار ہوتے ہی ام زمل نے لشکر بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ عرب کے دوسرے قبائل کے شکست خوردہ لوگ بھاگ بھاگ کے ام زمل کے پاس جمع ہو رہے تھے اور اب اس مرتد عورت کو اس قدر طاقت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ پوری تیاری کے بعد حضرتِ خالدؓ بن ولید سے مقابلہ کو نکلی۔

خالدؓ بن ولید کو ام زمل کے ارادوں کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ بزاخہ سے لشکر کے ساتھ بنو فزارہ کی آبادی کی طرف آ رہے تھے۔

ام زمل سلمٰی کو مسلم سردار خالدؓ بن ولید کے اِدھر آنے کی خبر ہوئی تو وہ اپنے مستقر سے جتنا آگے بڑھ آئی تھی وہیں رک گئی اور اسلامی لشکر سے مقابلہ کے لیے کوئی مناسب مقام تلاش کرنے لگی۔

چنانچہ جب لشکرِ اسلام خالدؓ بن ولید کی سپہ سالاری میں مرتدین کے سامنے پہنچا تو ام زمل جنگ کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

ام زمل کے ساتھ گھڑ سواروں کے علاوہ اونٹ سواروں کی بھی ایک کثیر تعداد تھی۔ خود ام زمل ایک اونٹ پہ کجاوے کے اندر بیٹھی اپنی فوج کی کمان کر رہی تھی۔

ام زمل کا خیال تھا کہ اسلامی لشکر تھکا ہوا ہے۔ وہ رات کو آرام کرنے کے بعد کل میدان میں نکلے گا مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اور حضرتِ خالدؓ نے جاتے ہی ام زمل پہ ایک زبردست حملہ کر دیا۔

خلافِ امید بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ ام زمل اور اس کا لشکر اس بہادری سے لڑا کہ مسلمانوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ ام زمل دو سو اونٹوں کے حلقے میں گھری ہوئی میدان میں جمی کھڑی تھی۔

لڑتے لڑتے دوپہر سے شام ہو گئی مگر ام زمل کے قدم میدان میں اسی طرح جمے تھے جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔

وہ اونٹ کے اوپر سے مسلمانوں پر تیر برسا رہی تھی اور قریب آنے والوں کو زخمی کر کے پسپا ہونے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ دائیں بائیں جھک کر پوری آواز سے اپنے لشکریوں کو جوش دلا رہی تھی۔

جنابِ خالدؓ بن ولید نے سوچا کہ جب تک ام زمل کی اونٹنی کھڑی ہے اس وقت تک مرتدین اور کفار بھی میدان میں جمے رہیں گے۔

یہ سوچ کر انہوں نے حکم دیا کہ ام زمل کی اونٹنی کی کوچیں کاٹ دی جائیں تاکہ دشمنوں پر نفسیاتی حملہ کیا جا سکے۔

دس سواروں کا ایک جتھا دشمن کی صفیں توڑتا ام زمل کی اونٹنی کی طرف بڑھا اور لڑتا بھڑتا، زخم کھاتا آخر اونٹنی تک پہنچ گیا۔

وہاں پہنچتے ہی اس دستے والوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں۔ اونٹنی بلبلا کے منہ کے بل زمین پر گری ام زمل بھی محمل سے قلابازیاں کھاتی زمین پر آ رہی۔

ام زمل زمین پر پڑی تھی کہ اپنے اور پرائے پچاسوں گھوڑے اسے روندتے ہوئے نکل گئے اور اس کا کچومر بن گیا۔

ام زمل کی اونٹنی گرتے ہی خالدؓ بن ولید نے ایک زبردست حملہ کیا اور ام زمل کے گرد لڑنے والے سینکڑوں اونٹوں اور اونٹنیوں کی کوچیں کاٹ کر انہیں گرا دیا۔

نصف گھنٹے کے اندر ہی اندر میدان دشمنوں سے پاک ہو گیا۔ بہت سے تو مارے گئے۔ کچھ جان بچا کر میدان سے نکل گئے اور باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور خالدؓ بن ولید نے ان کی جان بخشی کی۔

مرتدین کے خلاف خالدؓ بن ولید کی یہ ایک عظیم فتح تھی۔ اس فتح کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ جہاد میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اگر جنگ میں کام آئے تو شہید اور زندہ بچے تو غازی کے اعزاز سے سرفراز ہوں گے اس لیے وہ جان توڑ کر لڑتے تھے اور ان کی زبانوں پر یہ آیت رہتی تھی:

ترجمہ: "اگر تم دین کے لیے لڑو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم میدان میں مضبوطی سے جما دے گا۔"

برخلاف اس کے مرتدین محض قومی عصبیت کی خاطر لڑتے تھے۔ ان کے حلیف بھی اسی جذبے کا شکار تھے۔

۲۔ سپہ سالار لشکرِ اسلام خالدؓ بن ولید نے طلیحہ پر حملہ سے پہلے عکاشہ بن محصن اور ثابت بن اقرم انصاری کو طلیحہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا اور اسے یہ پیغام دیا تھا کہ اگر وہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائے تو اس کی جان بخشی کر دی جائے گی مگر طلیحہ نے ان دونوں سفیروں کو قتل کر دیا۔

جب مسلمانوں کو ان کی لاشیں ویرانے میں پڑی ملیں تو وہ غیظ و غضب سے بھر گئے اور اس قدر جواں مردی سے جنگ کی کہ طلیحہ کو میدان سے بھاگنا پڑا۔

۳۔ قبیلہ فزارہ کے سردار عیینہ بن حصن فزاری پر جب یہ عقدہ کھلا کہ طلیحہ نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو اس نے میدانِ جنگ ہی میں اپنے قبیلہ والوں کو چیخ چیخ کر مطلع کیا:

"اے اہلِ فزارہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ طلیحہ جھوٹا نبی ہے اس لیے تم اس کی حمایت سے دستبردار ہو کر جنگ سے باز آ جاؤ۔"

عیینہ کے یہ کہتے ہی طلیحہ کے لشکر میں بد دلی پیدا ہو گئی اور اسے شکستِ فاش ہو گئی۔

۴۔ قبیلہ طے کے ایک سردار عدی کی کوشش سے اس قبیلے نے طلیحہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور مسلمانوں کے لشکر سے آملا۔ اس سے طلیحہ کے لشکر میں کمی اور لشکرِ اسلام میں اضافہ ہوا۔

۵۔ جب لشکر کا روحِ رواں اور ان کا (جھوٹا) نبی خود ہی میدان چھوڑ گیا تو اس کا لشکر سوائے شکست کھانے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

اس بات کا خیال رہے کہ اس جھوٹے نبی یعنی طلیحہ بن خویلد اسدی کا انجام بخیر ہوا۔

طلیحہ معہ بیوی بچوں کے میدانِ بزاخہ سے جان بچا کر ملک شام پہنچا۔ وہاں اس نے مسلمانوں کے خلاف ایک لشکر ترتیب دینے کی کوشش کی مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

جب اسے ہر طرف سے ناکامی ہوئی تو اس پر خوفِ خدا کا غلبہ ہوا۔ اور وہ اسلام لے آیا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اسلامی لشکر میں شامل ہوا اور دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایرانیوں سے جنگ کرتے ہوئے بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔

عرب قبائل میں بنو تمیم ایک بہت بڑا قبیلہ تھا اور اس کی بہت سی شاخیں تھیں۔ عہدِ نبوی میں اس قبیلہ کا ایک وفد مدینہ پہنچا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دستِ مبارک پر اسلام لایا تھا۔ چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس قبیلہ کی شاخوں پہ چار امیر مقرر کیے تھے۔

یہ امیر مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ زبرقان بن بدر
۲۔ صفوان بن صفوان
۳۔ قیس بن عاصم
۴۔ مالک بن نویرہ

وفاتِ رسولؐ پر ان میں بعض امیر اسلام پر قائم رہے اور خلیفۂ اوّل جناب ابوبکر صدیقؓ کو زکات برابر بھیجی بعض نے تردد کیا۔ پھر اسلام لے آئے اور زکات بھیجنا شروع کر دی اور بعض اسلام سے باغی ہو گئے اور زکات دینا موقوف کر دیا۔ یہ باغی مسلمانوں سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس گروہ مرتدین میں مالک بن نویرہ بھی شامل تھا۔

طلحہ بن خویلد سے فارغ ہونے کے بعد جنابِ خالدؓ بن ولید نے بطاح کا رخ کیا تاکہ مالک بن نویرہ کی گوشمالی کریں۔

مالک بن نویرہ کو حضرت خالدؓ کے ارادے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ مرتد تو ہو گیا تھا مگر لشکرِ اسلام سے مقابلہ کی اس میں سکت نہ تھی اس لیے اس نے اپنے قبیلہ کو ادھر ادھر منتشر کر دیا اور جب حضرت خالدؓ بطاح پہنچے تو بستی خالی پڑی تھی۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جناب خالدؓ بن ولید نے گرد و نواح میں فوجی دستے روانہ کیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ جس شخص سے ملیں اسے اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ قبول کرے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دیں۔ حضرت خالدؓ نے یہ حکم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم کے تحت دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسلمانوں کے گیارہ لشکروں کے سامنے روانگی سے پہلے فرمایا تھا کہ:

"جب تم کسی بستی کے قریب پہنچو تو اذان دو۔ اگر بستی والے جواب میں اذان دینے لگیں تو ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔ اگر وہ اذان نہ دیں تو انہیں قتل کر دو۔ اور ان کا مال و اسباب چھین لو۔

جو قبیلہ اسلام لے آئے اس سے زکات طلب کرو۔ اگر وہ دیدے تو ٹھیک ورنہ اسے بھی قتل کر ڈالو۔"

جنابِ خالدؓ بن ولید نے مالک بن نویرہ اور دوسرے مرتدین قبائل کی تلاش میں جو فوجی دستے روانہ کیے تھے وہ ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں مالک بن نویرہ اپنے ایک ہم خیال قبیلے بنو ثعلبہ بن یربوع کے ساتھ موجود تھا۔ یہ فوجی دستے والے مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر جنابِ خالدؓ بن ولید کے پاس لے آئے۔

مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے سلسلے میں گرفتار کرنے والے دستہ میں دو رائیں تھیں دستہ کے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جب ہم نے بستی کے قریب پہنچ کے اذان دی تو بستی والوں نے اذان کا جواب اذان سے دیا۔

دستے کے زیادہ لشکریوں کا یہ بیان تھا کہ اذان کے جواب میں بستی والوں نے اذان نہیں کہی تھی۔ اس لیے ہم نے انہیں گرفتار کر لیا۔

اس خیال کے جو لوگ مخالف تھے یعنی کہتے تھے کہ انہوں نے اذان کے جواب میں اذان کی آواز سنی ہے ان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک بڑے زبردست صحابی ابوقتادہؓ بھی تھے۔

جنابِ خالدؓ کے سامنے جب یہ دو رائیں پیش کی گئیں تو وہ فوری طور پہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ انہوں نے حکم دیا کہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو قید میں رکھا جائے۔

وہ رات بہت سرد تھی۔ بعض روایات کے مطابق جنابِ خالدؓ بن ولید نے ایک شخص کے ذریعے لشکر میں منادی کرائی:

"اپنے قیدیوں کو گرمی پہنچاؤ۔"

مگر کنانہ کی زبان میں "مدافعاۃ" کے معنی قتل کرنے کے ہوتے ہیں۔ پس انہوں نے اس منادی کے یہ معنی لیے کہ "اپنے قیدیوں کو قتل کر دو"۔

اس غلط فہمی کی بنا پر قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان میں مالک بن نویرہ بھی شامل تھا۔ جب شور و غوغا کی آوازیں بلند ہوئیں تو حضرت خالدؓ اپنے خیمے سے باہر آئے۔

دریافتِ حال پر انہیں بتایا گیا کہ غلط فہمی کی بنا پر مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو گرمی پہنچانے کے بجائے قتل کر دیا گیا ہے۔

ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت خالدؓ نے کہا:

"جب خدا کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے"۔

مالک بن نویرہ جس شخص کے ہاتھوں قتل ہوا اس کا نام ضرار بن ازور تھا۔ ضرار بن ازور اور ان کی بہن خولہ بنت ازور نے آگے چل کر صلیبی جنگوں میں بہت نام پیدا کیا۔

صحابیِ رسول حضرت ابو قتادہؓ کو جنابِ خالدؓ کی بات بہت ناگوار گزری اور وہ سپہ سالار لشکرِ اسلام حضرت خالدؓ بن ولید کو بغیر اطلاع دیے مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر حضرت ابو قتادہؓ نے مالک بن نویرہ کے قتل کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کا الزام حضرت خالدؓ پر لگایا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کا بیان بڑے غور سے سنا مگر اس پر کوئی کاروائی نہ کی بلکہ ابو قتادہؓ کو اپنے سپہ سالار فوج کو اطلاع دیے بغیر لشکر سے واپس آنے پر ناراضگی کا اظہار کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ واپس جا کر حضرت خالدؓ بن ولید کی ماتحتی میں حسبِ سابق کام کرتے رہیں۔

ابو قتادہؓ کے واپس جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے خلیفۂ اوّل سے کہا:

"مالک بن نویرہ کو قتل کر کے خالدؓ نے بہت بُرا کیا ہے۔ آپ ان سے مالک بن نویرہ کے قتل کا قصاص لیجیے اور انہیں معزول کر دیجیے"۔

جناب ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے مگر جب حضرت عمرؓ نے خالدؓ بن ولید کی معزولی اور قصاص پر بہت اصرار کیا تو خلیفۂ اوّل نے فرمایا:

"عمرؓ! خالدؓ نے ایک اجتہادی غلطی کی ہے اس لیے تم اب ان کے بارے میں زبان سے کچھ نہ نکالو۔ اللہ کی اس تلوار کو جسے خالدؓ کافروں پر مسلط کیے ہوئے ہے میں نیام میں ڈالنے والا کون ہوتا ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی جناب ابو بکرؓ نے ایک خط کے ذریعے جنابِ خالدؓ بن ولید کو دربارِ خلافت میں

طلب کر لیا۔

جب حضرت خالدؓ مدینہ پہنچے اور مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوئے تو ان کا سامنا حضرت عمرؓ سے ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں مالک بن نویرہ کے سلسلے میں بہت سخت سست کہا۔ مگر جنابِ خالدؓ اس وجہ سے خاموش رہے کہ شاید خلیفہ کے بھی ان کے بارے میں ایسے ہی خیالات ہوں۔

پھر حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے۔ جنابِ خالدؓ نے ان کے سامنے پوری طرح اپنی صفائی پیش کی اور اپنا عذر بیان کیا۔

جنابِ ابو بکرؓ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے بیت المال سے مالک بن نویرہ کا خون بہا ادا کر دیا۔ یوں یہ معاملہ نپٹ گیا۔

جنابِ خالدؓ بن ولید پر یہ الزام بھی تھا کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کے قتل کے بعد اس کی بیوہ ام تمیم سے شادی کر لی تھی۔

اس سلسلے میں خلیفۂ رسولؐ نے خالدؓ بن ولید پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور ان سے کہا تھا کہ وہ ام تمیم کو طلاق دے دیں۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ خالدؓ نے ام تمیم کو کچھ عرصہ بعد ہی طلاق دے دی تھی۔

اس مسئلہ کو بھی خواہ مخواہ طول دیا گیا اور بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ دراصل اگر کسی عام لشکری نے یہ کام کیا ہوتا تو اس پر کوئی توجہ نہ دی جاتی مگر یہ بات اسلامی لشکر کے ایک بڑے سردار سے متعلق تھی اس لیے اسے خوب اچھالا گیا۔

راقم الحروف کے خیال میں جب خلیفۂ اوّل نے مالک بن نویرہ کے قتل سے خالدؓ بن ولید کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے بیت المال سے خون بہا ادا کر دیا۔ اور انہیں ان کے عہدے پر برقرار رکھا تو خالدؓ پر الزام ختم ہو جاتا ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی اعتراض کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابو بکرؓ کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا اور میرے نزدیک یہ ایک بڑا گناہ ہے۔

بالکل اسی طرح خلیفۂ اوّل کا خالدؓ بن ولید کی ام تمیم سے شادی پر ان کی سرزنش کرنا اور انہیں حکم دینا کہ وہ اسے چھوڑ دیں، اس قضیے کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے اور پھر تاریخ شاہد ہے کہ جنابِ خالدؓ نے ام تمیم کو جلد یا بدیر خلیفۂ وقت کے حکم پر طلاق دے دی تھی۔

اس سلسلے میں ایک خیال یہ بھی ہے (اور وہ حقیقت اور انسانی نفسیات کے بہت قریب ہے) کہ جنابِ خالدؓ نے ام تمیم سے اس لیے شادی کی تھی کہ ام تمیم کے اس غم کو دور کرنے کی کوشش تھا جو اسے اپنے

شاعر اور بہادر شوہر کے مارے جانے پر ہُوا تھا۔

اس شادی سے جناب خالدؓ بن ولید نے ام تمیم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کا غم نہ کرے کیونکہ اسے مالک بن نویرہ سے زیادہ عظیم شخصیت نے اپنی بیوی کا درجہ دیا ہے۔

مالک بن نویرہ کے سلسلے میں ایک عیسائی حسینہ سجاح بنت حارثہ کا قصہ بھی بہت مشہور ہے۔ سجاح قبیلہ بنو تمیم کی ایک شاخ بنو یربوع سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا قبیلہ بنو تغلب تھا جس میں اکثر بت عیسائیوں کی تھی اور یہ لوگ عراق میں آباد تھے۔

روایت ہے کہ سجاح بہت خوبصورت تھی۔ بے حد ذہین و فطین تھی۔ تخت و تاج حاصل کرنے کا سودا بچپن ہی سے اس کے دماغ میں سمایا ہُوا تھا۔

پس۔۔۔

اپنے حسن و جوانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اوباش نوجوانوں کا ایک بڑا حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا۔ پھر اسے کسی نوجوان نے مشورہ دیا، یا خود اس کے دل میں فتور آیا کہ وہ بھی عرب کے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح نبوت کا دعویٰ کرے اور ایک بڑی طاقت کی مالک بن جائے۔

سجاح نے اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے قبیلے کے جوانوں کے سامنے یہ دعوٰے کیا کہ:

"یہ کیا ضروری ہے کہ نبوت ہمیشہ مردوں ہی کو ملتی رہے اور عورتوں کو اس حق سے محروم رکھا جائے۔

چنانچہ خدا نے اس دفعہ اس ناانصافی کا خاتمہ کرتے ہوئے ایک عورت کو یعنی مجھے، سجاح بنت حارثہ کو نبوت کے عہدے پہ فائز کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں ملک عرب پہنچ کر مدینہ کو اپنا مرکز بناؤں۔"

سجاح بنت حارثہ کے دعوائے نبوت کرتے ہی اس کے قبیلہ بنو تغلب کے تقریباً تمام لوگ اس پر ایمان لے آئے۔ جس جس نوجوان نے بھی سجاح کے حسن و جمال اور فراخدلی کا چرچا سنا وہ اس کے حلقہ بگوش ہونے کے لیے اپنا قبیلہ اور ایمان چھوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے نتیجہ میں اس کے گرد نوجوانوں کا ایک بڑا لشکر اکٹھا ہو گیا جو اس کے حسن کی وجہ سے اس کی نبوت پہ ایمان لے آیا تھا۔

مرتد مالک بن نویرہ کا تعلق بھی بنو تمیم سے تھا اس لیے سجاح بنت حارثہ نے اسے حکم بھیجا کہ:

"میری نبوت اور سیادت پر ایمان لے آؤ ورنہ میرا لشکر تم پہ حملہ کر کے تمہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔"

مالک بن نویرہ بہت چالاک آدمی تھا۔ پھر اس کے قبیلہ کی ایک لڑکی نے مدعیۂ نبوت ہو کر اتنا بڑا لشکر جمع کر لیا تھا اس لیے اس نے اپنے ہی آدمیوں سے جنگ کرنا مناسب خیال نہ کیا اور دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے سجاح کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔

جب سجاح اپنے لشکر کے ساتھ مالک بن نویرہ کے علاقے میں داخل ہوئی تو وہ اس کی شان و شوکت اور تعداد لشکر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مالک بن نویرہ مرتد تو ہو ہی چکا تھا اب وہ سجاح کا حلقہ بگوش بھی ہو گیا اور اس نے سجاح کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔

پھر جب دونوں کی گفتگو ہوئی تو سجاح نے اس سے کہا:

"مجھے فرشتہ کے ذریعے یسوع مسیح نے حکم دیا ہے کہ میں ملک عرب میں پہنچ کے مدینہ کو اپنا مرکز بناؤں پھر تمام عرب کو اپنے حلقے میں سمیٹ لوں۔"

مالک کو اس کے خیالات پہلے ہی سے معلوم ہو چکے تھے۔

"آپ سچی نبیہ ہیں۔"

اس نے بڑی مکاری سے کہا:

"خداوند یسوع مسیح نے آپ کو جو حکم دیا ہے اس پر آپ ضرور عمل کریں لیکن آپ کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ مدینہ اور اس کے اردگرد نئے مذہب اسلام کا بڑا بول بالا ہے۔ پھر ان کے پاس لشکر بھی بہت بڑا ہے۔ مدینہ کو آپ صرف اس لشکر کے زور پر تو فتح نہیں کر سکتیں۔"

سجاح بنت حارثہ نے گھبرا کر پوچھا:

"پھر تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

مالک بن نویرہ نے اسے مشورہ دیا:

"میرے خیال میں آپ مدینہ کا رخ کرنے کے بجائے پہلے بنو تمیم کی دوسری شاخوں اور ان قبائل کو زیر کریں جو مسلمانوں کے مخالف ہیں۔ ان قبائل کا تعاون جنگ سے بھی اور دوستی سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

سجاح کو مالک بن نویرہ کا یہ مشورہ بہت پسند آیا۔

"مجھے تمہاری رائے سے پورا اتفاق ہے۔"

اس نے مالک سے کہا:

"میں مدینہ جانے کا ارادہ ترک کرتی ہوں۔ اب بتاؤ مجھے کس سے جنگ کرنا چاہیے۔"

مالک بن نویرہ کو طلیحہ بن خویلد اسدی اور مسیلمہ کذاب سے زیادہ خطرہ تھا۔ ان دو طاقتوں کی موجودگی میں مالک بن نویرہ کا چراغ نہ جل سکتا تھا۔

طلیحہ کی طاقت کچھ ایسی زیادہ نہ تھی مگر مسیلمہ کذاب اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ اس کا خاتمہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔

لیکن اس نے سب سے پہلے مسیلمہ کے خاتمہ کا فیصلہ کیا اور سجاح کو مشورہ دیا:

"اے میری خوبصورت اور پری جمال بنتِ! یوں تو عربوں کے بیشتر گروہ ایسے ہیں جن سے دوستی کر کے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے مگر حاکم یمامہ مسیلمہ جو بنو بکر کی شاخ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا ہے، ایک ایسی طاقت ہے کہ اگر اسے زیر کر لیا جائے تو پھر آپ کے لیے مدینہ کا راستہ کھل جاتا ہے۔

مگر یہ پستہ قامت اور بدشکل مسیلمہ، جس نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا ہے، اس قدر چالاک اور مکار ہے کہ بہت مشکل سے قابو میں آئے گا۔

میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ اس کا خاتمہ کر کے اس کے لشکر پر قبضہ کر لیں۔ پھر آپ دنیا کا کوئی بھی کام کر سکتی ہیں۔"

سجاح بنت حارثہ جو مالک بن نویرہ کی لمبی چوڑی تقریر سے الجھ رہی تھی، اس نے مالک کے خاموش ہوتے ہی بڑے جوش سے کہا:

"میں مسیلمہ پر حملہ کر کے اس کی طاقت کو ملیا میٹ کر دوں گی۔"

"نہیں میری گلفام بنتِ!"

مالک بن نویرہ نے اسے ٹوکا:

"مسیلمہ کو شکست دینا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ کو

اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگانا پڑے گا اور اپنے لشکر میں انتہائی جوش و خروش پیدا کرنا ہوگا۔"

"پھر تم ہی بتاؤ۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

سجاح کا لہجہ بے حد پژمردہ تھا۔

مالک بن نویرہ خود بڑا دل پھینک اور حسن پرست واقع ہوا تھا۔ وہ ایک اچھا شمشیر زن اور اتنا ہی اچھا شاعر بھی تھا۔

مالک کا دل، سجاح بنت حارثہ جیسی خوبصورت دوشیزہ کو دیکھ کر ڈول کر رہ گیا تھا مگر وہ اسے حاصل نہیں کر سکتا تھا اور کسی لاحاصل چیز کے لیے کوشش کرنا بھی وہ حماقت سمجھتا تھا۔

اس کے دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ اگر مسیلمہ کذاب کا خاتمہ ہو جائے تو شاید وہ سجاح کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

اسی خیال کے تحت وہ مسیلمہ کو سجاح کے ان جوشیلے جوانوں کے لشکر سے شکست دینا چاہتا تھا جو سجاح پر جان دیتے تھے۔

مالک بن نویرہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ سجاح نے اسے چونکا دیا:

"تم کس سوچ میں پڑ گئے مالک؟"

مالک نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

"سوچ یہ رہا ہوں کہ شاید تم اس مکروہ انسان کو قابو میں نہ کر سکو۔"

"کیوں؟"

سجاح نے بڑے غرور سے کہا:

"کیا وہ حسن اور خوبصورتی کو پسند نہیں کرتا؟"

"بہت پسند کرتا ہے۔ پھر بھی . . . . ." مالک جھجک کے رک گیا۔

"پھر تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

سجاح بڑے ناز سے بولی:

"میرا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ جو شخص شکل و صورت میں جس قدر بدہیئت، خوفناک اور مکروہ ہوتا ہے، اس کا دل خوبصورتی اور حسن کو اسی قدر پسند کرتا ہے۔

تم میری بات کا یقین کرو مالک۔ سانپ کا ڈسا شاید پانی مانگ سکے مگر میرے سحر کا ڈسا دم نہیں لیتا۔"

پھر اس شب سجاح بنت حارثہ تمام رات مالک بن نویرہ سے نہ معلوم کیا کیا مشورے کرتی رہی اور اس کے جوان اور نوجوان لشکری، جو کہ اس کے سچے جاں نثار تھے، وہ شب بھر میدان میں بے چینی سے ا بیں گھومتے رہے۔

سجاح بنت حارثہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو اٹھتے ہی اپنے لشکریوں کو اپنا دیدار کرائی تھی۔

ان دونوں اوقات میں پورا لشکر دس قطاروں میں صف بستہ ہو جاتا تھا اور سجاح ایک شانِ بے نیازی سے ان کے درمیان سے مسکراتی اور لجاتی گزرا کرتی تھی۔

اس کے شیدائیوں کے لیے اس کی یہ مسکراہٹ ہی ان کی جان کی قیمت تھی جس کے سہارے وہ خوشی خوشی اس پر نثار ہو جاتے تھے۔

یہاں اس بات کا خیال رہے کہ یہ واقعات، خالدؓ بن ولید کے طلحہ بن خویلد اسدی اور مالک بن نویرہ پر حملوں سے پہلے کے ہیں۔ جھوٹی مدعیۂ نبوت اور جنابِ خالدؓ کا کسی وقت بھی میدانِ جنگ میں آمنا سامنا نہیں ہُوا۔ جس وقت جنابِ خالدؓ اس جھوٹی نبیہ کو سزا دینے اس کے قبیلہ بنو تغلب میں گئے تو انہیں معلوم ہُوا کہ نہ ان مدعیۂ نبوت سجاح بنت حارثہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ یمامہ کے حاکم مسیلمہ کے پاس جا چکی ہے جس نے سجاح کی طرح نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

سجاح بنت حارثہ اور مسیلمہ کذاب کے گٹھ جوڑ، جو شادی کی صورت اختیار کر گیا تھا، اس کے تفصیلی ذکر سے پہلے مسیلمہ کا کچھ ذکر کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس کے لیے ہم ایک بار پھر آپ کو حیاتِ نبویؐ میں لیے چلتے ہیں۔

مسیلمہ علاقہ یمامہ کے قبیلہ بنو بکر کی شاخ بنو حنیفہ کا سردار تھا۔ یہ بے حد بدصورت، پستہ قد اور کریہہ المنظر آدمی تھا۔

عرب کے دیگر قبائل کی طرح اس قبیلہ کا ایک وفد بھی دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہُوا تھا۔ اس وفد میں مسیلمہ بھی شامل تھا۔

مدینہ پہنچ کے وفد کے دوسرے ارکان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں چلے گئے مگر مسیلمہ ان کے سامان کی رکھوالی کے لیے ڈیرے پر ہی ٹھہرا رہا۔

وفد نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ آپؐ نے وفد کو کچھ مال مرحمت فرمایا۔

اس وقت وفد کے ارکان نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ ہم اپنے ایک ساتھی کو سامان کی حفاظت کے لیے پڑاؤ پہ چھوڑ آئے ہیں۔

چنانچہ آپؐ نے اس کا حصہ بھی وفد والوں کو عطا فرمایا۔ پھر ارشاد کیا:

"وہ ایسا شخص نہیں ہے جسے سامان کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑا جائے"۔

صحیح مسلم میں مسیلمہ کا ابتدائی حال اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"سنہ ۹ھ میں بنو حنیفہ کا سردار مسیلمہ ایک وفد کے ساتھ مدینہ آیا۔ مسیلمہ بدصورت، پستہ قد، چالاک اور مکار تھا۔ اس نے آنحضورؐ سے عرض کیا:

"اگر آپؐ مجھے اپنا جانشین منظور فرمالیں تو میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا:

"میں اللہ کے احکام سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اس شرط پہ اگر تم کھجور کی یہ چھڑی بھی مانگو تو میں نہ دوں گا"۔

اس وقت حضورؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی۔ اس چھڑی کو دکھاتے ہوئے آپؐ نے مندرجہ بالا جواب ارشاد فرمایا تھا۔

جب یہ وفد بنو حنیفہ واپس گیا تو وہاں پہنچتے ہی مسیلمہ نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا اور وفد سے کہا:

"کیا رسول اللہؐ نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شخص ایسا نہیں ہے جسے سامان کی رکھوالی کے لیے پیچھے چھوڑ دیا جائے۔ وہ میرا مرتبہ پہچانتے تھے اور انہیںؐ معلوم تھا کہ میں انؐ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں"۔

مسیلمہ نے بعض مقفّٰی اور مسجّع عبارتیں گھڑ کے اپنے قبیلے والوں کے سامنے پیش کیں اور انہیں بتایا کہ اس پر آسمان سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسیلمہ نے شراب، زنا اور تمام بُرے کاموں کو ان پر حلال قرار دے دیا۔

ان باتوں کو سنتے ہی اس کے قبیلے والے اس پہ ایمان لے آئے اور انہوں نے اسے نبی تسلیم کر لیا اور

وعدہ کیا کہ وہ اس کا ہمیشہ ساتھ دیں گے۔

اپنی قوم کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مسیلمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو درج ذیل مضمون کا خط بھیجا۔

ترجمہ:

یہ خط مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام ہے۔

آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے نبوت میں آپؐ کا شریک کیا گیا ہے۔ نصف زمین میری ہے اور نصف قریش کی ہے لیکن قریش بہت زیادتی کرنے والی قوم ہے"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے اس خط کا جواب ان الفاظ میں بھیجا:

ترجمہ:

یہ خط محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے مسیلمہ کذاب (جھوٹا) کے نام ہے۔

سلامتی ہو اس پر جس نے حق کی پیروی کی۔ اس کے بعد واضح ہو کہ زمین خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ انجام انہی کا بہتر ہو گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب کا فتنہ بہت زور پکڑ گیا۔ اس فتنہ کو بھڑکانے میں الرجال بن عنفوہ کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔

الرجال ہجرت کر کے مدینہ مقیم ہو گیا تھا حضورؐ کی صحبت میں رہ کر اس نے قرآن اور دین کی تعلیم حاصل کی۔ پھر جب بنو حنیفہ کا وفد یمامہ واپس جانے لگا تو آپؐ نے وفد کے ساتھ الرجال بن عنفوہ کو کر دیا کہ یہ شخص انہیں دینی تعلیم دے گا۔

اس بے دین نے بنو حنیفہ اور خاص کر مسیلمہ کو سیدھا راستہ دکھانے کی بجائے خود بھی ان کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی اور مسیلمہ کے جھوٹے نبی ہونے کا اعلان ہوتے ہی الرجال اس کے ساتھ ہو گیا اور اس نے بنو حنیفہ کے سامنے یہ شہادت دی کہ:

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مسیلمہ کو آپؐ کے ساتھ نبوت میں

شریک کیا گیا ہے"۔

بنو حنیفہ کے لیے الرجال سے بڑی اور کونسی شہادت ہو سکتی تھی۔ پس اہل یمامہ نے جوق در جوق مسیلمہ کی اطاعت شروع کر دی اور ایک زبردست فتنہ کھڑا ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسیلمہ کذاب کی طاقت میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا اور وسطی عرب کے بے دین قبیلے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔

پھر عراق کی حسینہ سجاح بنت حارثہ اسے مغلوب کرنے کے لیے مسیلمہ کے مرکز یمامہ کی طرف روانہ ہوئی۔ مالک بن نویرہ نے سجاح کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ مسیلمہ کو شکست دیدے تو پھر اس کے لیے مدینہ پر قبضہ کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا۔





جنابِ ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا عہدہ سنبھالتے ہی منکرین، کفار اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے جو گیارہ لشکر تیار کرائے تھے ان میں ایک لشکر عکرمہؓ بن ابوجہل کی سرکردگی میں یمامہ کی طرف روانہ کیا گیا تھا۔ جنابِ ابوبکرؓ کو مسیلمہ کذاب کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ تھا اس لیے عکرمہؓ کے لشکر کے پیچھے ایک اور لشکر شرجیلؓ بن حسنہ کی سالاری میں یمامہ روانہ کیا۔

اس سلسلے میں جنابِ ابوبکرؓ نے عکرمہؓ اور شرجیلؓ دونوں ہی کو تاکید کی تھی کہ وہ دونوں باہم مل کر مسیلمہ کذاب پر حملہ کریں۔

عکرمہؓ نے خلیفۂ اول کی تاکید سے انحراف کیا اور یہ سوچتے ہوئے کہ وہ مسیلمہ کذاب پر حملہ کر کے اسے شکست دیدیں تو اس فتح کا سہرا صرف انہی کے سر بندھے گا، انہوں نے شرجیلؓ کے لشکر کا انتظار نہ کیا اور مسیلمہ پر حملہ کر دیا۔

مسیلمہ کی قوت اس وقت تک بہت بڑھ چکی تھی۔ وسط عرب کے بیشتر قبائل نے اسے نبی برحق (نعوذ باللہ) تسلیم کر لیا تھا۔

مسیلمہ نے زمانۂ جاہلیت کے رنگ میں رنگے ہوئے قبائل کو نماز اور زکات کی پابندی سے آزاد کر کے انہیں شراب، زنا اور غبن کی اجازت دیدی تھی۔ وحشی قبائل اس وجہ سے بھی اس کے اور زیادہ ہمنوا ہو گئے تھے۔

جب عکرمہؓ نے مسیلمہ کذاب کے لشکر پر حملہ کیا تو اس کے لشکر نے عکرمہؓ کے لشکر کو زیادہ دیر تک میدان میں ٹھہرنے نہ دیا اور زبردست دباؤ ڈال کر میدان سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا چنانچہ عکرمہؓ پسپا ہو کر کئی میل پیچھے ہٹ آئے۔

یہ ایک ایسی شکست تھی جو اگر مدینہ والوں کے کان تک پہنچتی تو اس سے مسلمانوں میں زبردست بددلی اور ہیجان پیدا ہونے کا امکان تھا۔

جنابِ ابوبکرؓ کو اس شکست کی خبر ملی تو انہوں نے اسے عام نہیں ہونے دیا اور ایک تیز رفتار سوار بھیج کے عکرمہؓ کو حکم دیا کہ:

"مدینہ واپس آنے کے بجائے نجران کی طرف چلے جاؤ۔ تمہارے اس حالت میں مدینہ آنے سے بددلی پھیل سکتی ہے۔"

عکرمہؓ کے بعد شرجیلؓ بن حسنہ یمامہ پہنچے۔ شرجیلؓ کو بھی جنابِ ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کے وہاں پہنچنے تک انتظار کا حکم دیا تھا مگر شرجیلؓ نے بھی عکرمہؓ بن ابوجہل والی غلطی دہرائی اور جنابِ خالدؓ کا انتظار کرنے کے بجائے مسیلمہ کے لشکر پر جا پڑے۔

مسیلمہ کے مضبوط لشکر نے شرجیلؓ کو بھی شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم وہ خالدؓ بن ولید کے لشکر سے جا ملے۔

یہ وہی وقت تھا جب عراق کی حسینہ سجاح بنت حارثہ اپنے جوان شیدائیوں کے لشکر کے ساتھ مسیلمہ کذاب سے ٹکر لینے یمامہ کی طرف آ رہی تھی۔

مسیلمہ اس وقت دوسرا محاذ کھولنے پر تیار نہ تھا۔ وہ لشکر لے کر سجاح کے مقابلہ پر آیا ضرور۔ مگر اس نے جنگ چھیڑنے کے بجائے تحفے تحائف بھیج کر سجاح کو صلح کا پیغام دیا۔

آخر دونوں میں دُو بدُو گفتگو کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کے لیے دونوں لشکروں کے درمیان ایک بڑا خیمہ نصب کیا گیا۔

مسیلمہ کذاب اور سجاح بنت حارثہ کی اس گفتگو کو بعض کتابوں میں بڑے رنگین انداز میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس ملاقات کا نتیجہ واقعی بڑا دلچسپ اور پُرعیش نکلا تھا۔

کہتے ہیں صلح کی گفتگو کے لیے مسیلمہ کذاب نے جو خیمہ نصب کرایا تھا اس میں نہایت اعلیٰ قسم کی اور عجیب خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ یہ خوشبوئیں ایسی تھیں جو انسان کو مست اور بے خود کر دیتی ہیں اس پر طرّہ یہ کہ خیمے کے اندر پردوں پر ایسی تصاویر آویزاں کی گئی تھیں جنہیں دیکھ کر انسان بے خود بلکہ بے قابو ہو جاتا ہے۔

ایک بیان یہ بھی ہے کہ خیمے کے اندر آویزاں کی جانے والی تمام تصاویر بالکل عریاں تھیں اور ان میں مرد اور عورت کو عجیب عجیب انداز سے محوِ اختلاط دکھایا گیا تھا۔

خیمہ کا ماحول اس قدر سحر انگیز تھا کہ کیا مرد اور کیا عورت جو بھی اسے دیکھ لیتا وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکتا تھا۔

مسیلمہ کذاب اور سجاح میں یہ پہلے ہی طے پا گیا تھا کہ چونکہ یہ ایک نبی اور ایک نبیّہ (نعوذ باللہ) کے درمیان ہو رہی ملاقات اور گفتگو ہے اس لیے اس میں کسی تیسرے کی گنجائش نہ ہوگی اور خیمہ سے سو سو گز دور تک کوئی غلام یا کنیز بھی آنے کی مجاز نہ ہوگی۔ اور یہ کہ جب گفتگو ختم کر کے نبی اور نبیّہ خود باہر نہ آئیں انہیں کوئی بلانے کی کوشش نہ کرے۔

چونکہ گفتگو بہت اہم تھی اور اس کے طول پکڑنے کا بھی امکان تھا اس لیے کھانے کے لیے خشک میوے اور تازہ پھل اور پینے کے لیے ہر قسم کی شراب خیمہ کے اندر رکھ دی گئی تھی۔

مقررہ وقت پر مسیلمہ کذاب اپنے لشکر سے اور سجاح بنت حارثہ اپنی خیمہ گاہ سے خیمے کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ مسیلمہ کذاب خیمے میں پہلے پہنچا اور اس نے سجاح کا خیمے کے دروازے پر استقبال کیا اور

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دونوں میں کیا گفتگو ہوئی۔ ایک جھوٹے نبی نے دوسری جھوٹی نبیّہ سے کیا کہا۔ دونوں فریبیوں نے ایک دوسرے کو فریب دینے کی کس طرح کوشش کی۔ کیا کیا دلیلیں پیش ہوئیں کونسی دلیل کس جواز سے رد کی گئی؟

پھر جب چھتیس اور بعض روایتوں کے مطابق ۴۸ گھنٹوں کے بعد مسیلمہ کذاب اور سجاح بنت حارثہ خیمے سے باہر آئے تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

دونوں طرف کے سردارانِ فوج بھاگ کے خیمے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ مسیلمہ کذاب نے بولنے میں پہل کی:

اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"میں مسیلمہ نبی برحق (نعوذ باللہ) اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ بنو تغلب کی حسین دوشیزہ سجاح بنت حارثہ واقعی ایک سچی نبیّہ ہے۔ میں اس کی نبوت پر ایمان لاتا ہوں۔"

اس کے بعد سجاح بنت حارثہ نے زبان کھولی:

"میں بنو تمیم کی شاخ بنو تغلب کی بیٹی سجاح بنت حارثہ جو ایک سچی نبیہ ہے (نعوذ باللہ) اس بات کی تصدیق کرتی ہوں کہ بنو حنیفہ کا سردار مسیلمہ حقیقت میں نبی برحق ہے۔ میں اس کی نبوت پر ایمان لاتی ہوں۔"

دونوں طرف کے سرداروں نے ان کے اس بیان پر اپنی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا اور دونوں کے حق میں نعرے بلند کیے۔

پھر مسیلمہ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے خاموش کیا اور کہا:

"میرے پیروکارو۔ تمہیں یہ سن کر اور زیادہ خوشی ہوگی کہ میں نے سجاح بنت حارثہ کو اپنی نبوت میں شریک کرنے کے لیے اس سے شادی کر لی ہے اور اب وہ میری بیوی ہے۔"

اس پر خوشی کا ایک اور غلغلہ بلند ہوا۔

پھر سجاح بنت حارثہ نے کہا:

"میرے لشکری اور شیدائی یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں مسیلمہ کی نبوت میں شریک ہو گئی ہوں۔ میں نے ان سے شادی کر لی ہے اور اب وہ میرے شوہر ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں اعلان کرتی ہوں کہ میرا لشکر مسیلمہ کے لشکر میں شریک ہو جائے اور جو شامل نہ ہونا چاہے وہ اپنے وطن واپس جا سکتا ہے۔"

کہتے ہیں کہ سجاح بنت حارثہ کے اس اعلان سے اس کے جوان لشکری، جو دراصل اس کے عاشق تھے، بہت مایوس ہوئے اور انہوں نے بغاوت کر دی۔ مسیلمہ کذاب کے لشکریوں نے ان میں سے بیشتر کو تہ تیغ کر دیا سوائے ان کے جو اس کے لشکر میں شریک ہو گئے۔ اس طرح دو جھوٹے مدعیانِ نبوت یک جان دو قالب ہو گئے۔

مسیلمہ کذاب اور سجاح بنت حارثہ کی شادی یمامہ پر عکرمہ بن ابی جہل اور شرجیل بن حسنہ کے حملوں سے پہلے ہو چکی تھی۔ عکرمہ، مسیلمہ کذاب سے شکست کھانے کے بعد جنابِ ابوبکرؓ کے حکم پر عمان کی طرف چلے گئے تھے اور جب شرجیل بن حسنہ کو شکست ہوئی تو وہ پسپا ہو کر خالدؓ بن ولید کے لشکر سے جا ملے جو اُس وقت

مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے یمامہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

یمامہ کا علاقہ خلیج فارس سے یمامہ تک پھیلا ہوا تھا اور نہایت زرخیز ہونے کی وجہ سے یہ سرزمین بہت امیر تھی۔

خالدؓ بن ولید کے آنے کی خبر جب مسیلمہ کذاب تک پہنچی تو وہ چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے بڑھا۔ اس وقت حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس صرف پندرہ ہزار مجاہدین پر مشتمل اسلامی فوج تھی۔

مسیلمہ اپنے مستقر یمامہ سے نکلا اور بناج کے راستے میں عقرباء نامی ایک بستی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ ضلع العرض میں "قرقری" کے قریب واقع بستی تھی۔ کہتے ہیں کہ یمامہ کا زرخیز علاقہ اس کے درے ہیں۔ یہاں پڑاؤ ڈالنے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان یمامہ سے باہر ہی رہیں اور ان کے گھوڑے یمامہ کی زمین کو نہ روند سکیں۔

جناب خالدؓ بن ولید بھی عقرباء پہنچے اور انہوں نے مسیلمہ کذاب کے سامنے لشکر کو صف آرا کیا۔ انہوں نے میمنہ پر زید بن خطاب اور میسرہ پر ابو حذیفہ کو مقرر کیا جبکہ خود قلبِ فوج میں ٹھہرے۔

شرجیل بن حسنہ جو مسیلمہ کذاب سے شکست کھا کر جنابِ خالدؓ سے آملے تھے انہیں بھی حضرتِ خالدؓ نے اپنے ساتھ قلب میں رکھا۔

مسیلمہ کذاب نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا کہ خود قلب میں رہا۔ میمنہ کا سردار محکم الیمامہ کو بنایا اور میسرہ پر الرجال بن عنفوہ کو مقرر کیا۔

الرجال وہی منافق اور مرتد ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنوحنیفہ کے ساتھ اسلامی درس و تدریس کے لیے بھیجا تھا مگر وہاں پہنچ کے یہ بدذات مسیلمہ کا دست و بازو بن گیا۔ مسیلمہ کو اس پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے لشکر کے بائیں بازو (میسرہ) پر اسے سردار مقرر کر دیا۔

الرجال بن عنفوہ اپنے ارتداد میں اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ مسیلمہ کو خوش کرنے کے لیے جنگ شروع ہونے سے پہلے یہ صفوں سے آگے آیا اور لشکرِ اسلام سے اپنا مدِمقابل طلب کیا۔ چنانچہ اس کی دعوتِ مبارزت پر عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ گھوڑا بڑھا کر اس کی طرف چلے۔

الرجال نے فوراً کمان میں تیر جوڑا اور چلّہ کھینچ کر عبدالرحمٰنؓ کو نشانہ بنایا۔ عبدالرحمٰنؓ نے اس کا تیر ڈھال پر روکا اور فوراً ہی جوابی حملہ کیا۔

یہ حملہ عبدالرحمٰنؓ نے بھی تیر چلا کر کیا۔ اس تیر پر منافق الرجال بن عنفوہ کی موت کا نام لکھا تھا۔ پس تیر سیدھا اس کے سینے کو چیرتا ہوا دل میں اتر گیا۔ الرجال ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ گھوڑے کی زین سے لٹک کر رہ گیا۔

اب دونوں لشکر ایک دوسرے سے مل گئے اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ تیز ہوتی جا رہی تھی اور لڑنے والوں کا جوش وخروش بڑھتا جا رہا تھا۔

یہ بڑی گھمسان کی جنگ تھی۔ کوئی لشکر بھی ایک قدم پیچھے ہٹنے پر آمادہ نظر نہ آ رہا تھا۔ لشکریوں کے جوش میں وحشت شامل تھی۔

خالدؓ بن ولید نے صورتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر جنگ کچھ دیر اور اسی شدت سے جاری رہی تو ان کے ساتھ آنے والے مہاجر اور انصار پر تو کوئی اثر نہ ہو گا مگر وہ دوسرے قبائل جو راستے میں آن کے ساتھ ہو گئے تھے، پیٹھ دکھا جائیں گے اور اس کا اثر مہاجر اور انصار پر پڑے گا۔

یہ نتیجہ اخذ کرتے ہی انہوں نے اپنا گھوڑا میمنہ کی طرف اور پھر میسرہ کی طرف دوڑایا اور اعلان کیا کہ ہر قبیلہ علیحدہ ہو کر دشمن کا مقابلہ کرے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کونسا قبیلہ کتنی بہادری سے لڑ رہا ہے۔

خالدؓ بن ولید کی اس حکمتِ عملی نے بڑا کام کیا۔ قبیلوں نے جب الگ الگ ہو کر لڑنا شروع کیا تو ان میں زیادہ جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم نے کمزوری دکھائی تو دوسرے قبیلے والے ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ اس لیے انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ جوش وخروش سے لڑنا شروع کر دیا۔

خالدؓ بن ولید کو لشکر میں کمزوری کے جو آثار نظر آئے تھے وہ اس حکمتِ عملی سے ختم تو ہو گئے مگر مسیلمہ کذاب کا لشکر پہلے ہی کی طرح میدان میں ڈٹا کھڑا تھا۔

اب جنابِ خالدؓ کو دوسری تدبیر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے یہ کیا کہ اپنا گھوڑا دشمن کی صفوں میں ڈال کے آگے بڑھے اور لڑتے بھڑتے مسیلمہ کذاب کے قریب پہنچ گئے۔

جنابِ خالدؓ نے جاتے ہی مسیلمہ کذاب کو آواز دی:

"او نابکار، خلقِ خدا کو کیوں قتل کراتا ہے۔ میرے مقابلے پہ خود آ۔ تاکہ معلوم ہو کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟"

مسیلمہ جو اپنے سرداروں میں گھرا ہوا تھا، اسے شرم آ گئی اور وہ گھوڑا بڑھا کر جنابِ خالدؓ بن ولید کے مقابل ہوا۔

اس وقت جنابِ خالدؓ نے بڑی حکمتِ عملی سے کام لیا اور اسے باتوں میں لگا لیا۔ اسے گفتگو میں مصروف رکھنے کے لیے انہوں نے چند شرطیں اس کے سامنے رکھیں مگر اس انداز سے کہ آپ ایک شرط اس کے سامنے

پیش کرتے اور اس سے پوچھتے:

"کیا تمہیں یہ شرط منظور ہے؟"

شرطیں اس طرح کی تھیں کہ جو سراسر مسیلمہ کذاب کے حق میں جاتی تھیں۔ پس اس نے ان کی شرطیں ماننا شروع کر دیں۔

مسیلمہ کے گرد چونکہ اس کے آدمی موجود تھے اس لیے وہ ہر شرط سن کر دوسری طرف یوں منہ گھماتا جیسے خدا سے مشورہ کر رہا ہو۔

دراصل وہ حضرت خالدؓ اور اپنے آدمیوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کا خدا سے براہ راست رابطہ ہے اور وہ ہر شرط پر خدا سے مشورہ کرتا ہے۔

دوسری طرف خالدؓ بن ولید کا اصل مقصد مسیلمہ سے شرائط منوانا نہیں بلکہ اسے گفتگو میں الجھانا تھا تاکہ انہیں مسیلمہ پر وار کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔

پس جب مسیلمہ نے دو شرطوں پر بار بار منہ گھما کر خدا سے مشورہ کرنے کا فریب دیا تو تیسری بار اس کے منہ گھماتے ہی خالدؓ اس پر جھپٹ پڑے۔

مسیلمہ بڑا مکار تھا۔ وہ منہ گھماتے وقت بھی ہوشیار رہتا تھا۔ چنانچہ جب خالدؓ بن ولید نے اس پر وار کیا تو اس نے وار خالی دیا۔ مگر خالدؓ نے فوراً ہی اس پر دوسرا وار کر دیا۔ مسیلمہ گھبرا گیا اور گھوڑا اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مسیلمہ کو بھاگتا دیکھ کر اس کے لشکر کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ وہ جان بچا کر بھاگا تو قریب ہی ایک قلعہ نما باغ میں گھس گیا۔

اس باغ کی اونچی اونچی دیواریں تھیں اور اس کا دروازہ بہت بڑا اور بے حد مضبوط تھا۔ مسیلمہ نے اس باغ کا نام حدیقۃ الرحمٰن رکھا تھا۔

دراصل یہ مسیلمہ کی عشرت گاہ تھی جہاں وہ اکثر عورتوں کے ساتھ آتا اور عیش و عشرت کی رنگا رنگ محفلیں سجاتا تھا۔

مسیلمہ کذاب کے میمنہ کے سردار محکم الیمامہ نے اپنے نبی کو بھاگ کے باغ میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ بھی فوراً باغ کے دروازے پر پہنچ گیا اور اس نے آوازیں لگانا شروع کر دیں۔

"اے لوگو! تم بھی حدیقۃ الرحمٰن میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارے نبی مسیلمہ اس باغ میں آ گئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔"

محکم کی اس آواز پر مسیلمہ کا پریشان اور شکست خوردہ لشکر بھی دھکم پیل کرتا ہوا باغ میں گھسنا شروع ہو گیا۔ جب کافی لشکر باغ میں پہنچ گیا تو محکم نے باغ کا دروازہ بند کرا دیا۔

مسیلمہ کذاب نے شکست کھانے کے بعد نہ صرف اپنی جان بچالی بلکہ اس باغ میں اب وہ اور اس کا لشکر دونوں بالکل محفوظ ہو گئے تھے۔

اس وقت تک جنگیں کھلے میدانوں میں ہوتی تھیں۔ فصیلوں اور مضبوط دروازوں کے توڑنے کا سامان ہر لشکر کے ساتھ نہ ہوتا تھا۔

جناب خالدؓ بن ولید کو اب یہ فکر ستا رہی تھی کہ وہ فتح حاصل کرنے کے بعد بھی مسیلمہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور وہ باغ کی اونچی دیواروں کے پیچھے محفوظ ہو کر بیٹھ گیا۔

جناب خالدؓ ابھی الجھن میں غلطاں و پیچاں تھے کہ ایک ادھیڑ عمر صحابیؓ اُن کے پاس تشریف لائے جن کا نام براءؓ بن مالک تھا۔

انہوں نے حضرت خالدؓ سے کہا:

"اے مسلم سپہ سالار! اس قلعہ میں داخل ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ مجھے رسیوں کا جھولا بنا کر دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دیں۔

میں اندر پہنچ کے مرتدوں کو مارتا کاٹتا صدر دروازے پر پہنچوں گا اور اسلامی لشکر کے داخلے کیلئے دروازہ کھول دوں گا۔"

خالدؓ بن ولید کو بزرگ صحابیؓ کے جوش و خروش اور جرأت پر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ وہ یہ بات اس انداز سے کہہ رہے تھے جیسے کوئی بہت آسان کام ہو۔

پھر انہوں نے جناب براءؓ بن مالکؓ سے کہا:

"میرے بزرگ! میں آپ کی جرأت اور شجاعت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہو سکتا ہے آپ اندر پہنچ کر باغ کا دروازہ کھولنے میں کامیاب بھی ہو جائیں مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ایک بزرگ صحابیٔ رسول ﷺ کو گیند کے مانند باغ کے اندر پھینک دوں۔ میں یہ گستاخی کیسے کروں۔ آخر مجھے بھی تو میدانِ حشر میں خدا کا سامنا کرنا ہے۔"

حضرت خالدؓ بن ولید کا یہ جواب سن کر حضرت براؓ بن مالکؓ کا چہرہ اتر گیا۔ مسلم سپہ سالار کی طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنے طور پر کوشش کی۔

ایک روایت کے مطابق ان کے چند ساتھیوں نے انہیں رسی کے جھولے میں رکھ کر باغ کے اندر پھینک دیا اور جناب براؓ بن مالک بالکل اسی طرح مرتدوں سے لڑتے بھڑتے آخر دروازے تک پہنچ گئے جیسے کہ انہوں نے کہا تھا' اور پہریداروں کو قتل کر کے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔

دروازے کے باہر تو مسلمانوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ سیلاب کے ریلے کی طرح اندر داخل ہو گئے۔

اس وقت مسیلمہ کے لشکری جو حضرت براؓ بن مالک کے آنے سے گھبرا گئے تھے' اب ان کے ہوش درست ہو گئے اور باغ میں داخل ہوتے ہی وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس جگہ بڑی شدید جنگ ہوئی۔ مسیلمہ کذاب کے پیروکار جی توڑ کر لڑے مگر مسلمان انہیں کب چھوڑتے تھے۔ مرتدین اور مشرکین کی اس قدر لاشیں گریں کہ باغ لاشوں سے پٹ گیا۔

شرجیل بن حسنہ کے جس لشکر نے مسیلمہ کذاب سے شکست کھائی تھی اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت امیر حمزہؓ کا قاتل وحشی بھی موجود تھا۔ وحشی اس کا نام بھی تھا اور وہ نسلاً بھی وحشی تھا۔

ایک جنگ میں گرفتار ہو کر وہ غلام بنا لیا گیا تھا۔ اس کا مالک جبیر بن مطعم تھا۔ جنگِ اُحد کے موقع پر مشرکینِ مکہ کا سردار ابوسفیان تھا جو مسلمانوں سے جنگِ بدر میں شکست کھا چکا تھا۔ اس کی بیوی ہندہ نے وحشی کو اس کے مالک جبیر بن مطعم سے خرید لیا تھا اور اسے یہ لالچ دیا تھا کہ اگر وہ جنگِ اُحد میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کر دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔

چنانچہ یہ افسوسناک واقعہ جنگِ اُحد میں پیش آیا۔

وحشی کے پاس لوہے کا ایک گول پہیہ تھا جس میں دندانے بنے ہوئے تھے۔ یہ دندانے تیز اور بے حد دھاردار تھے۔ جنگلیوں کا یہ خاص ہتھیار تھا۔ اس حربے کو ایک خاص انداز سے تاک کر دشمن کی طرف پھینکا جاتا تھا۔ یہ تیز دندانے دار پہیہ ہوا میں اڑتا ہوا جاتا اور جس جسم سے ٹکراتا اسے چیر پھاڑ کے رکھ دیتا تھا۔

وحشی نے اسی خاص ہتھیار کے ذریعے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ اس کی تفصیل جنگِ اُحد کے باب میں لکھی جا چکی ہے۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد جب وحشی مسلمان ہوا اور اسے معلوم ہوا کہ اس نے جس شخص کو شہید کیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے تو وہ اس قدر جذباتی ہیجان کا شکار ہوا کہ اس نے اس خطرناک ہتھیار کو صاف کر کے قسم کھائی کہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک اپنے اس گناہ کا کفارہ نہ ادا کر لے۔

وحشی اس صدمہ میں حواس باختہ بلکہ بڑی حد تک پاگل سا ہو گیا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں گھلتا رہتا کہ وہ کونسا ایسا اہم کام ہے جسے کر وہ اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کر سکتا ہے تاکہ اسے کچھ سکون مل سکے۔

پھر جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نائبِ رسولؐ کی حیثیت سے خلیفۂ اوّل کا عہدہ سنبھالا اور انہوں نے مرتدین سے جنگ اور ان کی سرکوبی کے لیے گیارہ لشکر تیار کیے تو اس کے دل میں ایک خیال نے جنم لیا۔

اس نے سوچا:

"اگر میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن اور جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کا خاتمہ کر دوں'
تو شاید خدا میرا وہ گناہ معاف کر دے جو میں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر کے اپنے
نامۂ اعمال میں لکھوا لیا ہے۔"

چنانچہ — اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وحشی، شرجیل بن حسنہ کے لشکر میں شامل ہو کر یمامہ پہنچا۔

شرجیل نے مسیلمہ کذاب سے شکست کھائی اور وحشی کو مسیلمہ کذاب تک پہنچنے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر وہ اپنے خاص ہتھیار کو سینے سے لگائے شرجیل کے ساتھ لگا رہا کہ کبھی بھی مسیلمہ کذاب اس کے نشانے پر آ سکتا تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ مسیلمہ کذاب شکست کھا کر باغ میں گھس گیا تھا۔ مسلمان باغ میں داخل ہو چکے تھے۔ دست بدست جنگ شروع ہو چکی تھی

وحشی نے سوچا کہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا اس سے بہتر اور صحیح موقع اسے زندگی بھر نہ مل سکے گا۔

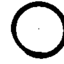
پس —
وہ گھمسان کی اس جنگ میں بچتا بچاتا' آہستہ آہستہ مسیلمہ کو تلاش کرتا ہوا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

اس نے دیکھا کہ مسیلمہ کذاب اپنی جان بچانے کے لیے ایک ستون کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہے۔

وحشی نے فوراً اپنی جگہ بدلی۔ شست باندھی اور تاک کر پوری طاقت سے لوہے کا وہ خطرناک پہیہ مسیلمہ کی طرف کھینچ مارا۔

پہیہ تیزی سے کسی لٹو کی طرح چکر کھاتا ہوا، ہوا میں رقصاں، مسیلمہ کذاب کے سینے سے جا ٹکرایا اس کے ساتھ ہی مسیلمہ کذاب کا سینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چیتھڑوں کی طرح ہوا میں بکھر گیا۔

یہ ظالم اور جھوٹا داعیٔ نبوت ایک چیخ تک نہ نکال سکا اور زمین پر کسی بھینسے کی طرح گر کے ہمیشہ کے لیے جہنم واصل ہو گیا۔





شجرِ اسلام کی جڑیں جب جزیرۂ عرب میں مضبوط ہوئیں اور خلیفۂ اوّل جناب ابوبکرؓ کی فراست اور اعلیٰ حوصلگی کی وجہ سے فتنۂ ارتداد کا مکمل خاتمہ ہو گیا تو مسلمانوں کی نظریں عرب کے شمال میں پھیلی ہوئی دو عظیم سلطنتوں کی طرف اٹھیں۔

یہ ایران اور روم کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں۔

ایران کی سرحد عراق میں اور روم کی سرحد شام میں عرب کی نئی سلطنتِ اسلام کی سرحدوں سے ملتی تھیں۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سلطنتِ ایران اور سلطنتِ روم کی بادشاہتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے کیونکہ مسلمانوں کو اور خاص کر جناب خالدؓ بن ولید کو اپنی آیندہ زندگی میں انہی طاقتوں سے جنگیں لڑنا پڑی تھیں۔

ایران کی سلطنت جسے فارس بھی کہا جاتا ہے، اس زمانہ کی سب سے قدیم و متمدن سلطنت کہی جاتی تھی۔ اس پر کبھی کسی دوسرے ملک کا قبضہ نہیں ہوا۔ صرف سکندرِ اعظم ایک ایسا فاتح تھا جس نے شہنشاہِ دارا کو شکست دے کر ایران پر قبضہ کیا تھا مگر یہ قبضہ زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا اور سکندر کے مرنے کے بعد ایران پھر سے ایک آزاد مملکت میں تبدیل ہو گیا۔

سلطنتِ ایران میں افغانستان، عراق عرب بھی شامل تھے۔ ایران کے حکمرانوں کو شہنشاہ کہا جاتا تھا۔ اور اس کے صوبیدار جو اندرونی معاملات میں آزاد اور خود مختار تھے "بادشاہ" کہلاتے تھے۔ شہنشاہِ ایران

کو کسریٰ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

ایران یا فارس پہ آخری زمانہ میں ساسانی خاندان کی حکمرانی تھی۔ ساسانی خاندان کی بنیاد اردشیر بابکان نے ۲۳۰ء میں ڈالی تھی۔

اس سلطنت کا دارالسلطنت مدائن کا شہر تھا۔ یہ خوبصورت شہر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پہ آباد تھا۔ یہیں پہ وہ "قصرِ کسریٰ" تھا جو اپنی خوبصورت تعمیر کی وجہ سے عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت باسعادت کے زمانہ میں تختِ فارس پہ کسریٰ نوشیرواں عادل متمکن تھا۔ اس کے بعد کسریٰ ہرمز تخت نشین ہوا۔ پھر کسریٰ پرویز۔ ایران کے اس شہنشاہ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔

شیرویہ بہت ظالم تھا۔ اس نے صرف ایک سال نو ماہ حکومت کی لیکن اس مختصر عرصہ میں اس نے اپنے خاندان اور لواحقین کو بے انتہا تکلیفیں دیں۔ پھر مر گیا۔

شیرویہ کی موت پہ امرائے سلطنت نے اس کے شیر خوار بیٹے اردشیر کو تخت پہ بٹھایا اور ایک امیر کو اس کا نائب السلطنت بنا دیا گیا مگر اس معاملہ میں امراء ایکدوسرے کے خلاف ہوگئے اور ایک دوسرے امیر شہر بزار نے مدائن پر حملہ کیا اور اردشیر کو قتل کر کے خود شہنشاہ بن بیٹھا۔

ایران کے عوام صدیوں سے شاہ پرست تھے۔ شہر بزار کا تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا۔ پس اُمرا نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور صرف ۴۰ دن حکومت کرنے کے بعد شہر بزار قتل ہوگیا۔

اب کسریٰ پرویز کی بیٹی بوران دخت کے سر پہ تاجِ شاہی رکھا گیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دورِ حیات کے آخری ایام میں بھی بوران دخت فارس کی حکمران تھی لیکن صرف ایک سال اور چار ماہ کے بعد اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

پھر کسریٰ کے چچا زاد بھائی جوان شیر کو شہنشاہ بنایا گیا مگر وہ ایک ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔

اس کے بعد پرویز کی دوسری بیٹی آزرمی دخت کو تخت پہ بٹھایا گیا۔

ایران کی یہ شہنشاہیت آزرمی دخت کو بھی راس نہ آئی اور اسے ایرانی سپہ سالار رستم نے اپنے باپ کے قصاص میں قتل کر دیا۔ اور اس کی جگہ اردشیر بابکان کے خاندان کے ایک شخص کسریٰ بن مہر کو تخت نشین کیا گیا۔ تخت کی نحوست کسریٰ بن مہر کو بھی کھا گئی اور وہ بھی صرف چند ماہ ہی حکومت کر سکا۔

آخر یزدگرد بن شہریار کو سلطنت فارس کا فرمانروا منتخب کیا گیا۔

ایران کا یہی شہنشاہ ساسانی شہنشاہیت کی آخری کڑی ثابت ہوا اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں فارس کی عظیم الشان سلطنت یزدگرد کے ہاتھ سے نکل کر سلطنتِ اسلامیہ کا حصہ بن گئی۔

اب آیئے سلطنتِ روما کو دیکھتے ہیں۔

سکندرِ اعظم یونانی کی عالمگیر سلطنت کے بعد یورپ میں جو عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی وہ سلطنتِ روما تھی۔ اس کا صدر مقام اٹلی کا شہر روما تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ جب ایران، ہندوستان، چین اور ترکستان کو چھوڑ کر باقی تمام دنیا روما کے زیرِ نگیں تھی۔ یہ گریٹ رومن ایمپائر کے نام سے یاد کی جاتی تھی اور ہر جگہ اس کی تہذیب و تمدن اور قانون کا لوہا مانا جاتا تھا۔

لیکن ــــ

۳۹۵ء میں آپس کی خانہ جنگی کی وجہ سے اس سلطنت کے دو ٹکڑے ہوگئے:

۱۔ مشرقی سلطنتِ روم

۲۔ مغربی سلطنتِ روم

مغربی سلطنتِ روم کا دارالسلطنت تو شہر "روما" ہی رہا مگر مشرقی روم کا دارالسلطنت قسطنطنیہ قرار پایا۔

مغربی سلطنتِ روم پہ یورپ اور روس کی وحشی قومیں بار بار حملہ آور ہوئیں جس کے نتیجے میں یہ بڑی سلطنت ٹوٹ پھوٹ کر کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی مگر مشرقی سلطنتِ روم روز بروز ترقی کرتی اور مضبوط ہوتی رہی۔

مشرقی سلطنت روم میں یورپ کے ممالک کے علاوہ ایشیائے کوچک، شام اور مصر بھی شامل تھے۔ ان ملکوں میں اگرچہ دیسی حکومتیں قائم تھیں لیکن قانون اور مذہب وغیرہ میں یہ حکومتیں سلطنتِ روما کی پیروی کرتی اور قسطنطنیہ کے قیصرِ روم کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتی تھیں۔ اسے یورپ میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

پھر جب اس سلطنت نے "عیسائی مذہب" قبول کیا تو ایشیا اور یورپ میں اس سلطنت کو "دینِ عیسوی" کا محافظ تسلیم کیا گیا اور اس کی اشاعت اور ترویج کی ذمہ داری اسی سلطنت کو سونپی گئی۔

چنانچہ مرکزِ دینِ عیسوی بیت المقدس بھی مشرقی روما کے زیرِ نگیں تھا۔ عیسائیت کی تبلیغ اور اس کی حفاظت اس سلطنت کی ذمہ داری تھی اور اس کے ایک ادنی اشارے پر لاکھوں تلواریں نیام سے باہر آجاتی تھیں۔

آغازِ اسلام میں اس سلطنت کا تاجدار شہنشاہ ہرقل تھا۔ یہ پہلے مصر کا گورنر تھا۔ پھر اس نے ۶۱۰ء میں شہنشاہ "فوقا" کو قتل کیا اور خود مشرقی روم کا شہنشاہ بن گیا۔

ہرقل نے ۶۱۰ء سے ۶۴۱ء تک حکومت کی اور اسی شہنشاہ کے دورِ حکومت میں ملک شام کا سرسبز علاقہ سلطنتِ روما سے نکل کر اسلامی جھنڈے کے نیچے آیا۔

ملک گیری کی ہوس اور آزاد قوموں کو غلام بنانے کا جذبہ ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر میں یکساں طور پر موجود تھا اس لیے ان دونوں میں ہمیشہ جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا تھا اور ان کا میدانِ جنگ شام اور عراق کے ممالک ہوتے تھے۔ اگر ایرانی حاوی ہوتے تو وہ بحیرۂ روم تک پہنچ جاتے اور اگر رومی بھاری پڑتے تو ان کا لشکر دجلہ اور فرات تک آ جاتا تھا۔

عہدِ اسلامی سے کچھ ہی عرصہ پہلے ایران کے کسریٰ نوشیرواں اور روم کے قیصر فوقا کے لشکروں میں ایک طویل جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ایرانیوں کو روم پر پے در پے فتوحات حاصل ہوئیں۔ انہوں نے رومیوں کو "جزیرہ" سے نکال دیا اور فینیقیا اور فلسطین کو تہ و بالا کرتے ہوئے آبنائے باسفورس تک پہنچ گئے تھے۔

اس کے بعد ایرانیوں نے ہرقل کے عہد میں رومیوں پر دوبارہ حملہ کیا اور بیت المقدس کو تاراج کر کے صلیب کی "متبرک" لکڑی چھین لے گئے اور بہت سے عیسائی تبرکات تلف کر دیے۔

پھر ایرانیوں نے مصر پر چڑھائی کی جو رومیوں کا باجگذار تھا اور اسکندریہ کو فتح کر لیا۔ یہ فتح انہیں ۶۱۶ء میں حاصل ہوئی تھی۔

اس جنگ سے پہلے یعنی ۶۲۲ء عیسوی میں مسلمانوں کے رہبرِ شریعت، نبوت کے حامل، سرتاجِ مدینہ اور رحمت للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم منصۂ شہود پر آ چکے تھے اور آپؐ کی بعثت کا اعلان ہو چکا تھا۔ مشرکینِ عرب میں سے کچھ لوگ نورِ اسلام سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایرانیوں کی فتح اور رومیوں کی شکست کی خبر مکہ معظمہ میں پہنچی تو مشرکین نے اس پر خوشی کا اظہار کیا مگر مسلمانوں نے اس پر افسوس کیا۔

یہ افسوس اس وجہ سے نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم یا مسلمانوں کو رومیوں سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ رومی عیسائی مذہب کے پیروکار تھے اور ان کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آسمانی کتاب "انجیل" نازل ہوئی تھی اور ایرانی اُس وقت تک بت پرست تھے۔ مسلمانوں کو صرف اس وجہ سے اس شکست کا افسوس ہوا تھا کہ یہ "اہلِ کتاب" کی "بے کتاب اور بے دین" لوگوں کے ہاتھوں شکست تھی۔

اس جگہ میں دست بستہ اور معافی کے ساتھ عرض کر دوں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی بعثت کے لیے "اعلان" کا لفظ استعمال کیا ہے جبکہ عام طور پر یہ لکھا جاتا ہے کہ فلاں نبی کی بعثت ہوئی یا فلاں نبی کو پیغمبری ملی یا عطا ہوئی۔

میرے خیال میں (اگر خیال غلط ہو تو اصلاح فرمائی جائے) نبی کو نبوت ملتی یا عطا نہیں ہوتی بلکہ ہر نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے اور جس نبی کو شریعت عطا کی جانا ہوتی ہے وہ شریعت مکمل طور پر نبی کی پیدائش کے وقت اس کے حافظہ اور ذہن میں محفوظ کر دی جاتی ہے۔

میں اپنی اس گزارش کے لیے آپ کی توجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے واقعہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

جس وقت حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو لوگوں نے حضرت مریمؑ پر الزام عاید کیا اور کہا:

"تم تو اعلیٰ نسب ہو۔ تمہارے والدین تو ایسے نہ تھے۔ پھر تم نے یہ نازیبا حرکت کیوں کی؟"

اس وقت حضرت مریمؑ نے نوزائیدہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا کہ:

"یہ سوال اس بچے سے کرو"۔

اس وقت حضرت عیسیٰؑ جن کی عمر صرف تین دن تھی، اِحکمِ خداوندی سے بولے اور فرمایا:

"میں خدا کا بندہ ہوں اور کتابِ شریعت اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہوں"۔

حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں کو جو جواب دیا تھا، یہاں میں نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے۔ اصل الفاظ اور اس کا ترجمہ کلامِ پاک میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، اس کے لیے مجھے معاف کیا جائے اور اگر میں نے غلط کہا ہے تو میری ضرور اصلاح کی جائے۔

اب پھر آمدم برسرِ مطلب!

جب مسلمان ایرانیوں کی فتح اور رومیوں کی شکست پر غمزدہ ہوئے تو وحی نازل ہوئی کہ مسلمانوں کو غمگین نہیں ہونا چاہیے:

ترجمہ:

قریب کی سرزمین میں اس وقت رومی مغلوب ہوگئے ہیں لیکن وہ جلد چند ہی سال میں غالب ہو جائیں گے۔ اس واقعہ سے پہلے اور بعد حکومت اللہ ہی کی ہے۔"

اس کے بعد مشرکین کا رد کرتے ہوئے جنہوں نے ایرانیوں (بے کتاب) کی فتح سے اپنی فتح پر دلیل قائم کی تھی، پیشین گوئی فرمائی گئی کہ:

"اور اس دن مسلمان اللہ کی مدد پر، جو کافروں کے مقابلہ پہ انہیں حاصل ہوگی، خوش ہو رہے ہوں گے۔ وہ جس کی مدد کرنا چاہتا ہے، کرتا ہے۔ وہی عزت والا اور رحمت والا ہے۔"

وحیِ الٰہی کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

دس سال بعد جب قیصر ہرقل نے ایرانیوں پر زبردست حملے کیے اور ۶۲۴ء میں عین اس وقت جب مسلمان بدر کے میدان میں مشرکین عرب پر فتح کی خوشیاں منا رہے تھے تو اس وقت رومی، ایرانیوں پر فتح کے شادیانے بجا رہے تھے۔

عرب ایک انتہائی بہادر اور شجاع قوم تھی۔ ایران کے کسراؤں اور قسطنطنیہ کے قیصروں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ اس قوم میں اتحاد نہ پیدا ہونے دیا جائے بلکہ انہیں گروہوں اور ٹکڑیوں میں تقسیم کرکے خانہ جنگی میں مبتلا رکھا جائے۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہِ صفا کی بلندیوں پر کھڑے ہوکر اعلانِ حق کیا اور لوگوں کو بتایا کہ تمام دنیا کے لوگ ایک گھرانے کے افراد ہیں اور انہیں آپس میں محبت اور مساوات قائم کرنی چاہیے کیونکہ ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔

اس نئی آواز اور تحریک کو ایران اور روم دونوں نے اپنے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھا کیونکہ ان کی شہنشاہیت تو عوام کی چوسی ہوئی ہڈیوں پر قائم تھی اور اگر مساوات اور محبت کی یہ تحریک کامیاب ہوتی تو ان کے مفتوحہ علاقوں کے علاوہ خود ان کی قوم کے لوگ بھی ان کے قبضۂ اقتدار سے باہر ہو جائیں گے۔ پس وہ اپنی اپنی جگہ محتاط ہوگئے۔

رومیوں نے اپنا کچھ لشکر شام منتقل کیا اور ایرانیوں نے اپنی فوجیں عراق میں جمع کردیں تاکہ اس تحریک کو عرب سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

مگر —

حق کی آواز کس نے دبائی ہے اور سچائی کے امڈتے دریا پہ کس نے بند باندھا ہے۔

ان دونوں طاقتوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسلام بڑی تیزی سے پھیلا۔ ۶ھ میں اس کی دھاک قسطنطنیہ اور مدائن کے ایوانوں میں سنائی دی۔

اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایران کے کسریٰ پرویز کے نام دعوتِ اسلام کا خط بھیجا۔ یہ خط پڑھ کر شہنشاہِ ایران کسریٰ پرویز کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے خط کے پرزے پرزے کر دیے اور عاملِ یمن کو حکم بھیجا کہ:

"مدینہ کے جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اسے گرفتار کرکے ہمارے حضور روانہ کرو۔" (نعوذ باللہ)

یمن کے عامل نے جس کا نام باذان تھا، اس حکم کے مطابق دو آدمی مدینہ روانہ کیے کہ وہ وہاں جاکر اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس امر کی اطلاع دیں کہ شہنشاہِ ایران نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔

باذان کے بھیجے ہوئے آدمی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ پہنچے اور انہوں نے کسریٰ پرویز کا حکم آپ کے گوش گزار کیا تو آپ نے ان دونوں سے فرمایا:

"جاؤ، تمہارا شہنشاہ جس نے میری گرفتاری کا حکم دیا تھا، قتل ہوگیا ہے۔ یاد رکھو دینِ اسلام کا غلبہ وہاں تک پہنچے گا جہاں تک تمہاری سلطنت ہے بلکہ وہاں تک جہاں تک کوئی اونٹ یا گھوڑا پہنچ سکتا ہے۔"

باذان کے دونوں آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سن کر چپ چاپ یمن لوٹ گئے۔ وہاں جاکر انہیں معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ درست ہے۔ ایران کے شہنشاہ کسریٰ پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا ہے اور خود تخت نشین ہوگیا ہے۔

اس کے بعد ایران خانہ جنگی میں مبتلا ہوگیا اور کسی نئے کسریٰ کو عرب کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصرِ روم کو دعوتِ اسلام کا خط بھیجا تھا تو اس کے سرداروں اور امرا نے سخت مخالفت کرتے ہوئے اس دعوت کو رد کر دیا تھا۔ اور جب مسلمان قاصد وہاں سے واپس ہوا تھا تو ملک شام میں اسے لوٹ لیا گیا تھا۔

اسی زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ اسلام کا ایک خط شرجیل بن عمرو غسانی کو بھیجا، جو سلطنتِ روم کی طرف سے بصرہ کا حاکم تھا۔ اس بدبخت نے نہ صرف دعوتِ اسلام کو رد کر دیا بلکہ قاصدِ رسولؐ جناب حارث بن عمیرؓ کو قتل بھی کر دیا۔ ۸ھ کا سریۂ موتہ اسی ظلم کا انتقام تھا جس میں دو لاکھ سے زیادہ شامیوں اور رومیوں سے صرف تین ہزار مسلمانوں کا مقابلہ تھا۔ اور خالدؓ بن ولید اگرچہ رومیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے نرغے سے نکال لائے تھے، پھر بھی بہت سے اکابر صحابہؓ اسلام کی عزت پہ قربان ہو گئے تھے۔

اس سے اگلے ہی سال یعنی ۹ھ میں حاکمِ بصرہ نے شہنشاہِ روم کی مدد سے مدینہ منورہ پر حملے کا قصد کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ "تبوک" کے مقام پر پہنچ گئے اور دشمن کا انتظار کرتے رہے مگر حاکم بصرہ کو جنگ کی ہمت نہ ہوئی اور آپؐ مدینہ لوٹ آئے۔

ان واقعات سے ظاہر تھا کہ یہ دونوں بڑی طاقتیں یعنی روم اور ایران جب بھی اپنی خانہ جنگیوں سے فرصت پاتی ہیں تو مسلمانوں پہ حملوں کے منصوبے بنانے لگتی ہیں۔

اس خیال کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے حضرت اسامہؓ بن زید کی سرداری میں ملک شام پر حملہ کے لیے ایک لشکر ترتیب دیا تھا جس کی تعمیل جنابِ ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالنے کے فوراً بعد کر دی تھی۔

جنابِ ابوبکرؓ رومیوں اور ایرانیوں کے ارادوں سے واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فوراً بعد جب عربوں میں ارتداد کا ہنگامہ برپا ہوا تھا تو ان سلطنتوں نے اس موقع کو غنیمت جانا تھا اور ایک طرف شہنشاہ روم ہرقل کی فوجیں شام میں اور دوسری طرف ایران کی فوجیں عراق میں مسلسل جمع ہو رہی تھیں۔

چنانچہ خلیفۂ اول نے ایک بہادر شخص مثنیٰ بن حارثہ کو کچھ فوجی دستوں کے ساتھ عراق روانہ کیا اور یہ حکم

دیا تھا کہ وہ عراقی فوجوں سے جنگ نہ کریں بلکہ ان پہ چھاپے ماریں تاکہ وہ عرب پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

پھر جب فتنۂ ارتداد کا خاتمہ ہو گیا تو مثنیٰ بن حارثہ نے دربارِ خلافت سے درخواست کی کہ انہیں فوجی کمک روانہ کی جائے تاکہ وہ فارس (ایران) کے شاہانِ کسریٰ کی عظیم سلطنت سے دو دو ہاتھ کریں۔

یہ بہت بڑا کام تھا۔ اور اس کے لیے بڑی طاقت اور سمجھداری کی ضرورت تھی۔ پس خلیفۂ اول نے اس مہم کے لیے جنابِ خالدؓ بن ولید کا انتخاب کیا۔

جنابِ خالدؓ بن ولید فتنۂ ارتداد کے خاتمہ کے بعد وادیٔ الویر میں مقیم تھے اور دربارِ خلافت سے نئے احکام کے منتظر تھے۔

۱۲ محرم الحرام ۱۲ھ کو خالدؓ بن ولید کو دربارِ خلافت سے حکم پہنچا کہ وہ اپنے لشکر کو لے کر زیریں عراق پہنچیں اور اُبلہ کی سرحد سے عراق پر یلغار کریں۔

دوسری طرف عیاض بن غنم، جو اس وقت نجد میں مقیم تھے، کو حکم ملا کہ وہ شمال کی جانب سے عراق پہ حملہ آور ہوں اور حملہ کا آغاز مصیخ سے کریں۔

دربارِ خلافت سے جنابِ خالدؓ اور عیاضؓ کو یلغار کے جو احکامات بھیجے گئے ان میں اس بات کا سختی سے حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ساتھ صرف ان مسلمانوں کو لیں جو فتنۂ ارتداد میں شامل نہ تھے یعنی کسی مرتد کو اس مہم میں شامل نہ کیا جائے۔

دونوں سپہ سالاروں کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ اس مہم کے لیے کسی شخص پہ جبر نہ کیا جائے بلکہ صرف ان لوگوں کو لشکر میں رکھا جائے جو اپنی خوشی سے اس مہم میں شامل ہوں۔

لشکروں میں جب اس بات کا اعلان کیا گیا تو بہت سے لوگوں نے مہم پہ جانے کے بجائے پیچھے رہنے کو ترجیح دی اور اس طرح لشکروں میں کمی واقع ہو گئی۔ تب سپہ سالاروں نے دربارِ خلافت سے مدد کے لیے درخواست کی۔

اس درخواست پہ خلیفۃ المسلمین نے عبد غوث حمیری کو عیاض بن غنم کی امداد کے لیے اور قعقاع بن عمروؓ کو خالدؓ بن ولید کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

واضح رہے کہ ان دونوں کے ساتھ کوئی فوج نہیں بھیجی گئی تھی بلکہ ان دونوں کو تنہا عیاضؓ اور خالدؓ کی اعانت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ کہتے ہیں دربارِ خلافت میں اس پہ چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔

ایک شخص نے خلیفۂ محترم سے عرض کیا:

"اے محترم خلیفہ! آپ ان سپہ سالاروں کے لیے جن کے اکثر آدمیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے صرف ایک ایک آدمی بطور فوجی کمک روانہ فرما رہے ہیں؟"

جنابِ خلیفہؓ نے ارشاد فرمایا:

"یاد رکھو جس لشکر کے سپہ سالار خالدؓ بن ولید اور عیاض بن غنم جیسے فرد ہوں وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا"۔

اللہ اللہ! کس قدر اعتماد تھا جنابِ ابوبکرؓ کو لشکرِ اسلام اور اس کے سپہ سالاروں پر۔ ان کے اس اعتماد کو واقعی ان لشکروں نے کوئی ٹھیس نہیں پہنچائی بلکہ اس پہ پورا اترے۔





جنابِ خالدؓ بن ولید نے عراق روانہ ہونے سے پہلے حاکمِ اُبلہ ہُرمز کو ایک تہدیدی خط روانہ کیا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

"ہُرمز کو واضح ہو کہ اگر تم لوگ سلامتی چاہتے ہو تو اسلام لے آؤ۔
اگر اسلام نہیں لاتے تو اسلامی حکومت کے ماتحت ہو کر رہنے اور جزیہ
دینے کا اقرار کرو۔ ایسا نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔ اس لیے کہ
تمہارے مقابلہ پر ایک ایسی قوم ہے جو موت کو اسی قدر پسند کرتی ہے
جس قدر تمہیں زندگی پسند ہے"۔

جنابِ خالدؓ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا۔ جب آپ عراق پہنچے تو مثنیٰ بن حارثہ اپنے آٹھ ہزار کے ساتھ آ کر مل گئے۔

جنابِ خالدؓ نے لشکر کے تین حصے کیے۔ ایک پر مثنیٰ بن حارثہ، دوسرے پر عدی بن حاتم کو سردار مقرر کیا اور تیسرا حصہ اپنے پاس رکھا

تینوں لشکروں کا مقامِ اجتماع "حفیر" قرار پایا۔ پھر ان لشکروں کو آپ نے دائیں بائیں سے ایک ایک دن کے وقفے سے روانہ کیا۔

اُبلہ کے حاکم ہُرمز کو جنابِ خالدؓ کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً شہنشاہِ ایران کو فوجی مدد کے لیے قاصد روانہ کیا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ کواظم کی طرف روانہ ہوا۔

کواظم خلیج فارس کے کنارے بحرین اور بصرہ کے درمیان واقع تھا۔ بصرہ سے اس کا فاصلہ دو منزل کا تھا۔ کواظم میں بے شمار چشمے ہیں جن کا پانی میٹھا ہوتا ہے۔ شاعروں نے اس سرسبز و شاداب اور پُر فضا مقام کی بہت تعریف کی ہے۔

ہُرمز جب کواظم پہنچا تو جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ جنابِ خالدؓ کا لشکر حفیر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہُرمز نے فوراً اپنے لشکر کا رخ ادھر موڑ دیا اور جنابِ خالدؓ کے وہاں پہنچنے سے پہلے اپنے لشکر سمیت وہاں پہنچ گیا۔

حفیر بابلہ گاؤں کے ایک چشمہ کا نام ہے اور یہ بصرہ سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ہرمز نے حفیر پہنچتے ہی اپنے لشکر کی ترتیب شروع کر دی۔

اس نے اپنے دو بھائیوں قباد اور انوشجان کو مقدمہ پر مقرر کیا۔ یہ دونوں اردشیر اکبر کی اولاد میں سے تھے۔

ہُرمز کے لشکر کے ایک حصہ نے اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لیا تاکہ میدانِ جنگ میں جمے رہیں اور بھاگنے کے امکانات ختم ہو جائیں۔

خالدؓ بن ولید کو ہرمز کے حفیر پہنچنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنا راستہ بدل دیا اور کاظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہرمز کے جاسوس حضرت خالدؓ کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ خالدؓ کے لشکر کا رخ کاظمہ کی طرف ہوا تو انہوں نے فوراً ہرمز کو ان کے ارادے سے باخبر کر دیا۔

یہ خبر پاتے ہی ہرمز نے بھی اپنا راستہ بدل دیا اور ایک دوسرے مختصر راستے سے خالدؓ بن ولید سے پہلے کاظمہ پہنچ گیا۔

ہرمز نے چشمہ پر قبضہ کر کے اپنے لشکر کو نسبتاً نرم زمین پر اتارا۔ خالدؓ کو مجبوراً سخت زمین پر قیام کرنا پڑا جہاں پانی بھی نہ تھا۔

لشکریوں نے اپنے سپہ سالار سے شکوہ کیا:

"اے سپہ سالار۔ آپ نے ہمیں اس جگہ قیام کا حکم دیا ہے جہاں کی زمین سخت ہے اور دور دور تک پانی کا پتہ نہیں۔ چشمہ پر دشمن پہلے ہی قبضہ کر چکا ہے"۔

جنابِ خالدؓ نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا:

"اے مسلمانو! فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ دونوں لشکروں میں سے جو بہادر ہوگا چشمے پر اُسی کا

قبضہ رہے گا"۔

جنابِ خالدؓ نے بھی لشکر کی صفیں درست کیں۔ پھر جنگ شروع ہوئی۔

کچھ دیر کی جنگ کے بعد ہرمز اپنے لشکر سے آگے آیا اور خالدؓ بن ولید کو "دعوتِ مبارزت" دی۔ جنابِ خالدؓ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر ہرمز کی طرف چلے۔

ہرمز نے اپنے لشکر میں ایک سازش تیار کی تھی۔ اس نے ایرانی بہادروں کا ایک دستہ تیار کر کے اسے حکم دیا تھا کہ جب اس کی اور جنابِ خالدؓ کی جنگ شروع ہو تو وہ فوراً بڑھ کے جنابِ خالدؓ کو گھیر کر قتل کر دیں۔

چنانچہ جب حضرتِ خالدؓ، ہرمز کے قریب پہنچے تو سواروں کا ایک دستہ ایرانی لشکر سے نکل کر ان کی طرف بڑھا۔

جنابِ خالدؓ کو فوراً ہی سازش کا ادراک ہو گیا۔ آپ نے ہرمز کے قریب پہنچ کر اس پہ ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ دوسرے وار کی ضرورت ہی نہ پڑی اور ہرمز زین سے لٹک گیا۔ پھر جنابِ خالدؓ تیزی سے اپنے لشکر کی طرف پلٹے۔

ادھر قعقاع بن عمرو نے چند ایرانی سواروں کو صفوں سے آگے نکلتے دیکھا تو وہ بھی کچھ سواروں کے ساتھ ادھر چلے۔ پھر شدید جنگ شروع ہو گئی۔ لشکرِ اسلام نے ایسے جوش و خروش سے حملہ کیا کہ ایرانی میدان میں نہ ٹھہر سکے اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔

اس فتح کے بعد جنابِ خالدؓ معہ مال اسباب اس جگہ آئے جہاں آجکل بصرہ آباد ہے۔ وہاں سے آپ نے مثنیٰ ابن حارثہ کو بھاگتے ہوئے ایرانیوں کے تعاقب میں روانہ کیا اور معقل المزنی کو اُبلہ بھیجا جہاں انہوں نے مالِ غنیمت اور قیدی اکٹھا کیے۔

اس جنگ میں ایرانیوں نے خود کو زنجیروں میں جکڑا تھا تاکہ میدان میں جمے رہیں، اس لیے یہ "جنگِ سلاسل" کہلاتی ہے۔

جنابِ خالدؓ نے خمس یعنی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اور فتح کی خبر دربارِ خلافت میں روانہ کی اور باقی مالِ غنیمت لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔

دربارِ خلافت سے خالدؓ بن ولید کو ہرمز کی ٹوپی عطا کی گئی۔ یہ ٹوپی جواہرات سے مزین تھی اور اس کی قیمت اُس وقت ایک لاکھ درہم تھی۔



شہنشاہِ ایران اردشیر کے دربار مدائن میں جب ہرمز کا خط پہنچا تو اس نے اسی وقت قازن بن قریانس کی سپہ سالاری میں ایک لشکر مسلمانوں کے مقابلہ اور ہرمز کی مدد کے لیے بھیجا۔

قازن جب لشکر لے کر مزار پہنچا تو اسے دلملہ ہرمز کا شکست خوردہ لشکر ملا۔ اردشیر اکبر کے دونوں بیٹے قباد اور انوشجان جو جنگِ سلاسل میں زندہ بچ گئے تھے، وہ قازن کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

باہم یہ طے ہوا کہ اگر مزار میں فوجیں جمع کر کے خالدؓ بن ولید کا مقابلہ نہ کیا گیا تو پھر ان کا روکنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے نہر ثنی کے قریب پڑاؤ کیا اور خالدؓ بن ولید کا انتظار کرنے لگے۔

خالدؓ بن ولید کو ایران کے دوسرے لشکر کے مزار پہنچنے کی خبر ملی تو آپ بھی مزار پہنچے اور نہر کے دوسرے کنارے پر فروکش ہوئے۔

جب دونوں طرف سے انتظامات مکمل ہو گئے تو جنگ شروع ہوئی۔ ایرانی سپہ سالار قازن نے پہلے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ اس کے جواب میں خالدؓ بن ولید اور معقل بن اعشیٰ ایرانیوں کے مقابلہ پر نکلے۔ معقل بن اعشیٰ قازن کے پاس پہلے پہنچ گئے اور جاتے ہی انہوں نے ایک ہی وار میں قازن کا خاتمہ کر دیا۔

اپنے سپہ سالار کا انجام دیکھ کر قباد اور انوشجان میدان میں آئے اور ان کے مقابلہ پر عدی بن حاتم اور عاصم بن عمرو نکلے۔

عدی بن حاتم نے قباد کو اور عاصم بن عمرو نے انوشجان کو جہنم واصل کر دیا۔ سپہ سالار اور دو بڑے سرداروں کا انجام دیکھ کر ایرانی لشکر کے حوصلے پست ہو گئے۔

جنگ شروع ہوتے ہی ان میں بے دلی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا اور ایرانیوں کو قتل اور گرفتار کرنے لگے۔

روایت ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی مارے گئے۔ اگر باقی ایرانی کشتیوں کے ذریعے دریا پار نہ کر جاتے یا پھر نہر ان کے اور مسلمانوں کے درمیان حائل نہ ہوتی تو اس دن ایرانی لشکر کا ایک سپاہی زندہ نہ بچتا۔

جنگِ مزار میں بے پناہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ مشہور ہے کہ مالِ غنیمت کی تقسیم میں ہر سپاہی اور سوار کو تیس تیس ہزار حصہ ملا۔ جنابِ خالدؓ نے فتح کی خوشخبری کے ساتھ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ دربارِ خلافت میں روانہ کیا۔

اس کے بعد جنابِ خالدؓ نے مزار میں قیام کر کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام اور انصرام شروع کیا۔ علاقہ کے تمام لوگ ذمی قرار پائے اور ان پر جزیہ لگایا گیا۔

شہنشاہِ ایران اردشیر کو جب ایرانی فوج کی حسرت ناک شکست کی خبر ملی تو وہ سخت بے چین ہوا اور اس نے مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے یکے بعد دیگرے دو اور زبردست لشکر روانہ کیے۔ پہلے لشکر کا سپہ سالار اندرزغر تھا جبکہ دوسرے لشکر کی سرداری بہمن جادویہ کے سپرد تھی۔

اندرزغر اپنے لشکر کے ساتھ مدائن سے جو ایرانیوں کا دارالسلطنت تھا، روانہ ہو کر کسکر پہنچا جو ایک وسیع علاقہ تھا اور اس کا صدر مقام واسط تھا۔

واسط نام کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ مقام کوفہ اور بصرہ کے وسط میں واقع تھا۔ یہاں سے کوفہ اور بصرہ دونوں طرف کا راستہ ۵۰ فرسخ تھا۔

کسکر کا وہ علاقہ جو صحرا کے ساتھ واقع تھا وہاں دلجہ کا شہر آباد تھا۔ ایران کا دوسرا لشکر جس کا سردار بہمن جادویہ تھا، وسط سواد سے گزرا اور حیرہ اور کسکر کے درمیان جو عربی النسل عیسائی آبادی تھی اسے اپنے لشکر میں شامل کرتا ہوا دلجہ پہنچا۔

اب یہ دونوں لشکر مل کر ایک اس قدر عظیم الشان لشکر کی صورت میں دلجہ میں جمع ہو گئے جس پر ایرانی بہت نازاں تھے اور انہیں اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔

خالدؓ بن ولید کو ایرانی لشکر کے دلجہ میں پڑاؤ ڈالنے کی خبر ملی تو آپ نے سوید بن مقرن کو اپنے عقب کی حفاظت اور مفتوحہ علاقوں کی نگرانی پر مزار میں چھوڑا اور خود لشکر لے کر دلجہ روانہ ہوئے۔

جنابِ خالدؓ بن ولید لشکرِ اسلام کے ایک ایسے سپہ سالار تھے جو ہر جنگ میں وقت اور موقع کی مناسبت سے ایک نئی جنگی حکمتِ عملی اختیار کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس جنگ میں بھی اپنے لشکر کے تین حصے کیے۔

ایک حصہ تو دشمن سے مقابلہ کے لیے اپنے پاس رکھا۔

باقی دو حصوں کو نشیب میں چھپا دیا تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے کام لیا جا سکے۔ ان دو حصوں کی کمان آپ نے بسر بن ابی اہم اور سعید بن مرہ کے سپرد کی تھی۔

جنابِ خالدؓ نے اپنے حصہ کے لشکر کے ساتھ ایرانیوں کے مقابلہ پہ صف بندی کی اور پھر فوراً ہی جنگ چھیڑ دی۔

دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔

ایرانیوں کو اپنی تعداد پہ بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کے حملے کر رہے تھے مگر مسلمان دیوار بنے کھڑے تھے اور ایک اینچ پیچھے نہ ہٹتے تھے۔

پھر جب ایرانیوں میں تھکن کے آثار نمایاں ہوئے تو جنابِ خالدؓ نے کمین گاہ میں چھپی ہوئی فوج کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ فوراً ہی پوشیدہ فوج تکبیر بلند کرتی اپنی کمین گاہ سے نکل کر ایرانی فوج پہ ٹوٹ پڑی۔ ایرانی لشکر اس آفت سے گھبرا گیا۔

اب کیفیت یہ تھی کہ سامنے سے خالدؓ بن ولید اور پشت سے مسلمانوں کی چھپی ہوئی فوج ایرانیوں پہ حملے کر کے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی۔ آخر اندرزغر ہمت ہار گیا اور بے تحاشہ میدانِ جنگ سے نکل بھاگا۔

اندرزغر کے گھوڑے کا رخ صحرا کی طرف تھا۔ چنانچہ وہ صحرا میں پھنس گیا اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

فتح کے بعد جنابِ خالدؓ نے علاقے کے کاشت کاروں سے کوئی تعرض نہ کیا، ان سے محض جزیہ کا مطالبہ کیا گیا جو انہوں نے قبول کر لیا۔

جنگِ دلجہ میں قبیلہ بکر بن وائل کے کئی عربی النسل عیسائی مارے گئے تھے جن میں ان کے دو نامور سرداروں جابر بن بجیر اور عبدالاسود عجلی کے بیٹے بھی تھے۔ ان کے قتل ہونے پہ عیسائی بہت جز بز ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے لیے وہ شہنشاہ ایران اردشیر سے مدد کے طالب ہوئے۔

عرب عیسائیوں نے بنو عجلان کے عبدالاسود عجلی کو اپنا سردار بنایا۔ ادھر اردشیر نے بہمن جادویہ کو جو جنگِ دلجہ میں بچ گیا تھا، حکم دیا کہ :

"ایرانیوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ عیسائیوں کی مدد کو پہنچو۔"

چنانچہ جادویہ لشکر لے کر الیس کی جانب بڑھا اور الیس کے حاکم جابان کے سپرد اپنا لشکر کر کے خود اردشیر کی طرف مشورہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

وہ جابان کو ہدایت کر گیا تھا کہ اس کی واپسی تک جنگ کا آغاز نہ کیا جائے۔ الیس، عراق میں کوفہ کے قریب سرحد پر آباد ایک گاؤں کا نام ہے۔

جب حضرت خالدؓ کو معلوم ہوا کہ بنو عجلی، بنو ، بنو ضبیعہ اور دیگر عربی النسل عیسائی الیس میں ان کے مقابلے کے لیے تیار ہو رہے ہیں تو وہ بھی لشکر لے کر الیس کی جانب روانہ ہوئے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان عیسائیوں کی مدد کے لیے الیس میں ایرانیوں اور جابان کا لشکر بھی موجود ہے۔ پس جنابِ خالدؓ نے جاتے ہی ان پر حملہ کر دیا۔

عیسائیوں کو علم تھا کہ جابان کی فوج ان کی مدد کو موجود ہے اور بہمن جادویہ بھی ایک بھاری لشکر کے ساتھ ان کی مدد کو آ رہا ہے، اس لیے وہ بڑی دلجمعی سے جنگ کرتے رہے۔

لیکن جابان نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔

جابان کو بہمن جادویہ ہدایت کر گیا تھا کہ اس کی واپسی تک جنگ نہ کرنا۔ وہ اس ہدایت پر قائم رہا۔ ادھر جنگ ہوتی رہی اور ادھر جابان اپنے لشکر کے ساتھ ناؤ نوش میں مشغول رہا۔

جب عیسائیوں کو جابان کی طرف سے مدد نہ پہنچی تو وہ سست پڑ گئے اور خالدؓ بن ولید نے انہیں ایک ہی حملہ میں پسپا کر دیا۔

اس جنگ میں ستر ہزار عیسائی مارے گئے۔

فتح کے بعد خالدؓ بن ولید نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اور بنی عجلان کے ایک شخص جندلؓ کو فتح کی خبر کے ساتھ دربارِ خلافت میں بھیجا تاکہ وہ دربارِ خلافت میں جنگ کی تفصیل سے خلیفہ کو آگاہ کرے۔

یہاں اس بات کا خیال رہے کہ سوائے جنگِ اُبلہ کے جو محرم ۱۲ھ میں ہوئی تھی، باقی تمام لڑائیاں صفر ۱۲ھ میں لڑی گئیں۔

الیس کے قریب آمنیشیا کا شہر آباد تھا۔ یہ شہر حیرہ کا ہم پلہ تھا۔ خالدؓ بن ولید الیس کے بعد اس شہر میں پہنچے۔

قرب وجوار میں خالدؓ بن ولید کا اس قدر رعب وخوف طاری ہو گیا تھا کہ جب اسلامی لشکر آمنیشیا پہنچا تو پورے شہر کو ویران پایا۔ یہاں کے لوگ حضرت خالدؓ بن ولید کی آمد کی خبر سن کر گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

حضرت خالدؓ نے اس شہر کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔ اس شہر سے اس قدر دولت ملی کہ ہر سوار کو پندرہ سو درہم ملے۔ دوسرے فوجیوں کو جو کچھ ملا وہ الگ تھا۔

فتح کی خبر کے ساتھ کثیر مالِ غنیمت جب دربارِ خلافت میں پہنچا تو خلیفۂ اوّل بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے فرمایا:

"قریش کا شیر ایک دوسرے شیر پر حملہ آور ہوا۔ اور اس کے بھٹ میں گھس کے اسے مغلوب کیا۔ عورتیں خالدؓ بن ولید جیسا بہادر پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔"

خلیفۂ وقت کے اس قول سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں خالدؓ بن ولید کی کس قدر عزت اور حرمت تھی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خالدؓ کو اپنے فنِ حرب میں یگانۂ روزگار سمجھتے تھے۔ آمینشیا کی فتح دراصل "حیرہ" کی فتح کا ایک زینہ تھا۔

حیرہ، کوفہ سے صرف تین میل کے فاصلے پر تھا۔ حاکم حیرہ حضرت خالدؓ بن ولید کی فتوحات کا حال سن چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ آمینشیا کے بعد اب حیرہ کی باری ہے۔ چنانچہ اس نے جنگ کی تیاریاں شروع کیں اور ایک لشکر اپنے بیٹے کے ساتھ آگے بھیجا کہ وہ خالدؓ بن ولید کی پیش قدمی روکے۔ خود وہ لشکر کے ساتھ شہر سے باہر خیمہ زن ہوا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے واقعی حیرہ کا رخ کیا۔ انہوں نے فوج اور مالِ غنیمت کو کشتیوں پر بار کیا اور دریائے فرات کے ذریعے آگے بڑھے مگر آگے دریا خشک ہو گیا۔ کشتیاں کیچڑ میں پھنس گئیں۔ حضرت خالدؓ نے سامان سے لدی کشتیاں وہیں چھوڑیں اور خود دریا کے کنارے آگے بڑھے اور وہاں پہنچے جہاں حاکمِ حیرہ[1] کا بیٹا انہیں روکنے کے لیے موجود تھا۔

ابنِ ارازبہ نے مسلمانوں کے راستے میں مشکلات پیدا کرنے کے لیے بند باندھ کے دریا کا تمام پانی نہروں کو منتقل کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کی کشتیاں کیچڑ میں پھنس گئی تھیں۔

خالدؓ بن ولید نے جاتے ہی ابنِ ارازبہ پر حملہ کر دیا۔ ابنِ ارازبہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خالدؓ اس کے پاس پہنچ کر حملہ کر سکتے ہیں۔ یہ حملہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ ابنِ ارازبہ کا پورا لشکر اس حملہ میں کٹ کر رہ گیا۔ ایک شخص بھی زندہ نہ بچا۔ مسلمانوں نے بند توڑ کر دریا میں پانی پھر سے جاری کر دیا۔

حاکم ارازبہ کو اپنے بیٹے اور شہنشاہِ ایران اردشیر کی موت کی خبریں ایک ساتھ موصول ہوئیں۔ ادھر اس کا بیٹا فرات کے کنارے مارا گیا اور اُدھر اردشیر شہنشاہِ ایران ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

ارازبہ نے یہی بہتر خیال کیا کہ وہ حیرہ چھوڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ پس اس نے قلعہ حیرہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور بھاگ گیا۔

حضرت خالدؓ بن ولید اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچے تو غریین اور قصرِ ابیض کے درمیان اپنی خیمہ گاہ قائم کی۔

انہوں نے حیرہ کے قلعوں کا بہت سخت محاصرہ کیا اور قلعوں والوں کو قلعے خالی کرنے کا پیغام بھیجا مگر اس کے جواب میں قلعوں کی طرف سے سنگباری شروع ہو گئی۔

خالدؓ بن ولید کو مجبوراً اس کا جواب دینا پڑا۔ انہوں نے تمام قلعوں پر حملہ کا حکم دیا۔ سب سے پہلے ضرار بن ازور نے حملہ کیا اور تیروں کی ایسی بارش کی کہ قلعوں میں کہرام مچ گیا۔

قلعہ والے اس طوفانی تیراندازی سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ انہوں نے قلعوں میں موجود اپنے فوجی سرداروں سے درخواست کی کہ وہ سنگباری بند کر دیں تاکہ حملہ آور قلعوں پر تیراندازی نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی قلعہ کے سرداروں نے لشکرِ اسلام کے سپہ سالار سے درخواست کی کہ وہ تیراندازی بند کرا دیں۔ اور انہیں صلح کی گفتگو کی اجازت دیں۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کی درخواست پر قلعوں پر تیراندازی بند کرا دی۔

حیرہ میں چار بڑے بڑے قلعے تھے جن کے چار سردار تھے:

۱۔ ایاس بن قبیصہ طائی
۲۔ عدی بن عدی
۳۔ ابنِ اکال
۴۔ عمرو بن عبدالمسیح

تیراندازی بند ہوئی تو یہ چاروں سردار ایک وفد کی صورت میں لشکرِ اسلام میں آئے۔ انہیں فوراً جنابِ خالدؓ کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

۱؎ اس حاکم حیرہ کا نام ارازبہ تھا۔

حضرت خالدؓ اگرچہ ان سے مہربانی سے پیش آئے مگر سخت لہجہ میں بولے:

"آخر تم نے اپنے آپ کو کیا سمجھ کر ہمارا مقابلہ کیا۔ اگر تم عرب ہو تو تمہیں کس بات نے مجبور کیا کہ تم عربوں ہی کے خلاف جنگ کرو اور اگر تم عجمی ہو تو کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تم اس قوم سے مقابلہ کر رہے ہو جو موت کو اسی قدر عزیز رکھتی ہے جس قدر تمہیں زندگی عزیز ہے۔"

عدی بن عدی نے جواب دیا:

"اے لشکرِ اسلام کے سپہ سالار، ہم سے جو غلطی ہوئی سو ہوئی۔ اب آپ فرمایئے آپ ہم سے کن شرائط پر صلح کر سکتے ہیں؟"

"ہم ہر ایک کے سامنے تین صورتیں پیش کرتے ہیں۔"

جنابِ خالدؓ نے فرمایا:

"پہلی بات یہ کہ تم مسلمان ہو کر ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اس سے تمہیں وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو معمولی سا جزیہ دے کہ ہماری حفاظت میں آجاؤ۔ ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ اور ہر موقع پر تمہاری مدد اور حفاظت کریں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر تمہیں ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی منظور نہیں تو پھر ہمارا تمہارا فیصلہ تلوار کرے گی۔"

عدی بن عدی نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ پھر عرض کیا:

"ہم جزیہ کی شرط پر آپ سے صلح کرنے کو تیار ہیں۔"

جنابِ خالد نے ان پر ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیہ مقرر کیا اور صلح نامہ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔

صلح نامے کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ عہد نامہ ہے جو خالدؓ بن ولید نے سردارانِ حیرہ عدی بن عدی، عمرو بن عبدالمسیح، ایاس بن قبیصہ اور حیری بن اکال سے کیا ہے۔

اہلِ حیرہ نے اس عہد نامہ کو قبول کر لیا ہے اور اپنے سرداروں کو اس کی تکمیل کے لیے معزز گردانا ہے۔

عہد نامہ کے مطابق:

اہلِ حیرہ کو ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیہ ادا کرنا ہوگا جو ان کے قسیسین (پادری) اور راہبوں سے بھی لیا جائے گا۔ البتہ اپاہجوں، محتاجوں اور تارک الدنیا راہبوں کو جزیہ معاف ہوگا۔

اگر یہ جزیہ باقاعدہ ادا کیا جاتا رہا تو اہلِ حیرہ کی حفاظت کی ساری ذمے داری مسلمانوں پر ہوگی۔ اگر وہ حفاظت کرنے میں ناکام رہے تو جزیہ نہ لیا جائے گا۔

اگر قول یا فعل کے ذریعے بدعہدی کی گئی تو یہ ذمے داری ختم سمجھی جائے گی۔

یہ معاہدہ سنہ ۱۲ھ میں لکھا گیا۔"

اہلِ حیرہ نے جزیہ کی رقم کے علاوہ کچھ تحائف بھی جناب خالدؓ بن ولید کو پیش کیے۔ جنابِ خالدؓ نے رقم اور تحائف حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ بھجوا دیے۔

خلیفۂ محترم نے حضرت خالدؓ کو لکھا:

"اگر یہ تحائف جزیہ میں شامل ہیں تو خیر، ورنہ اسے جزیہ میں شامل کر کے فالتو رقم اہلِ حیرہ کو واپس کر دو۔"

فتح حیرہ کے سلسلے میں بعض تواریخ میں ایک دلچسپ اور پُرلطف واقعہ درج ہے۔ چونکہ واقعہ تاریخی اور یادگار ہے اس لیے درج کیا جا رہا ہے۔

روایت ہے کہ عہدِ نبویؐ میں شویل نامی ایک شخص مدینہ پہنچا اور لشکرِ اسلام میں شامل ہو گیا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ حیرہ میں چار مشہور قلعے تھے جن کے قلعدار چار بڑے سردار تھے۔ جس قلعہ کا حاکم عمرو بن عبدالمسیح تھا، شویل اسی قلعہ کا رہنے والا تھا۔

شویل ایک سیدھا سادا اَن پڑھ جوان تھا۔ جن دنوں وہ قلعہ میں رہتا تھا ان دنوں حاکمِ قلعہ عمرو کی بیٹی کرامہ بنت عمرو بن عبدالمسیح کے حسن و جمال کا بڑا چرچا تھا۔ یہ لڑکی جتنی حسین تھی اتنی ہی مغرور بھی تھی۔

اس کی شادی کے لیے دور و نزدیک سے بہت رشتے آئے مگر وہ اپنے حسن پر اس قدر نازاں تھی کہ اس نے سب سے انکار کر دیا۔

شویل اس زمانہ میں قلعہ کی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا۔ اس نے کرامہ کو کئی بار قریب سے دیکھا تھا اور اس کے حسن و جوانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس پر عاشق ہو گیا۔

اس یک طرفہ عشق کی دھیمی دھیمی آگ اس کے رگ و پے میں سماتی چلی گئی اور اس کا عشق اندر ہی اندر پروان چڑھتا رہا۔

کرامہ کی بالآخر شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر قلعہ سے چلی گئی مگر ہائے ری محبت ! کہ شویل کے دل سے اس کی یاد محو نہ ہو سکی۔

پھر پہلے مکّہ میں اس کے بعد مدینہ میں نورِ اسلام کا غلغلہ بلند ہوا۔ لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ شویل کا دل حیرہ سے ایسا اچاٹ ہوا کہ وہ وہاں سے مدینہ آ گیا۔ یہاں وہ مسلمان ہوا اور لشکرِ اسلام میں شامل ہو گیا۔

انہی دنوں ایک بار دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں کسی نے "حیرہ" اور وہاں کے مغرور سرداروں کا ذکر کیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حیرہ کی فتح کی پیش گوئی فرمادی۔

یہ پیش گوئی سن کے شویل کے دل میں کرامہ کے عشق کی دبی ہوئی چنگاری ازسرِ نو بھڑک اٹھی اور وہ کچھ ایسا بے چین ہوا کہ اس نے فی الفور حضورِ نبویؐ میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ! جب حیرہ فتح ہو تو کرامہ بنت عمرو بن عبدالمسیح مجھے عطا کر دی جائے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی یہ معصوم خواہش سنی اور فرمایا:

اگر حیرہ لڑائی کے بعد فتح ہوا تو تمہاری خواہش پوری کر دی جائے گی۔"

شویل نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔

اس بات کو ایک زمانہ گزر گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وصال ہو گیا اور عہدِ ابوبکرؓ شروع ہوا۔

فتنۂ ارتداد کی کامیاب مہم کے بعد اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا۔ حضرت خالدؓ بن ولید عراق کی مہم پر مامور کیے گئے۔ شویل بھی ان کے لشکر میں شامل تھا۔

پھر جب حیرہ کے قلعوں پر حملہ شروع ہوا اور اس قدر شدید تیر اندازی کی گئی کہ سینکڑوں قلعہ والے

مارے گئے۔ اس وقت قلعہ والوں نے اپنے سرداروں کو مجبور کیا کہ مسلمانوں سے صلح کر لی جائے تاکہ عوام کا سلسلۂ ہلاکت رک سکے۔

تمام قلعدار بھی اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے۔ چنانچہ انہوں نے سپہ سالارِ لشکرِ اسلام جنابِ خالدؓ بن ولید کو صلح کی درخواست پیش کی۔ اس پر جنابِ خالدؓ نے قلعہ کے نمائندوں کو شرائط طے کرنے کے لیے اپنی خیمہ گاہ میں بلوایا۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ صلح کی گفت گو کے لیے ایاس بن قبیصہ طائی، عدی بن عدی، ابن اکال اور عمرو بن عبدالمسیح لشکرِ اسلام میں آئے تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے شویل، جو کرامہ بنت عمرو بن عبدالمسیح کا عاشقِ دیرینہ تھا، نے جنابِ خالدؓ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔

اس نے عرض کیا:

اے سپہ سالارِ لشکرِ اسلام ! کیا آپ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکامات سے انکار کر سکتے ہیں؟"

جنابِ خالدؓ نے حیرت سے شویل کو دیکھا اور کہا:

"تم کس قسم کی بات کر رہے ہو۔ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام سے کوئی مسلمان انکار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"اے سپہ سالار"۔

شویل نے بڑی جراُت سے کہا:

"مجھ سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک وعدہ کیا تھا۔ اب اس وعدے کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے اس لیے آپ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام کی پابندی فرمائیے۔"

خالدؓ بن ولید کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا:

"آخر تم کون ہو؟"

انہوں نے دریافت کیا:

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کس وعدے کی طرف تمہارا اشارہ ہے۔ جو کہنا ہے وہ صاف صاف بیان کرو۔"

اس پر شویل نے بتایا:

"اے سپہ سالار۔ میرا بچپن اور جوانی کے کچھ دن اسی قصبہ حیرہ کے آس پاس گزرے ہیں۔ میں حیرہ

کے اس قلعدار کا ایک سپاہی تھا جس کا نام عمرو بن عبدالمسیح ہے۔

اس کی ایک لڑکی کا نام کرامہ بنت عمرو ہے۔ وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو اس پر عاشق ہو گیا مگر وہ بہت مغرور تھی اور بڑے بڑوں کو منہ نہ لگاتی تھی۔ پھر مجھ سے کیسے شادی کر لیتی۔ میں اس وقت صبر کر کے بیٹھ گیا۔

پھر میں مدینہ چلا گیا۔ میں نے لشکرِ اسلام میں شمولیت کر لی۔ اس ملازمت کے دوران ایک دن جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے سامنے "حیرہ" کی فتح کی پیش گوئی فرمائی۔ میں اس وقت مسجدِ نبوی ہی میں موجود تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ اطہر سے "حیرہ" کا نام سن کر مجھے تمام پرانی باتیں یاد آ گئیں۔ کرامہ کا خوبصورت چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

میں نے حضورؐ سے عرض کیا:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب حیرہ فتح ہو جائے تو قلعدار عمرو بن عبدالمسیح کی بیٹی کرامہ مجھے عطا کر دی جائے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے وعدہ کیا اور ارشاد فرمایا:

"اگر حیرہ لڑائی کے بعد فتح ہوا تو تمہاری خواہش پوری کر دی جائے گی"۔

اس وقت طریقہ یہ تھا کہ جس ملک پر جنگ کے بعد قبضہ ہوتا تھا وہاں کی تمام عورتیں لونڈیاں بنا لی جاتی تھیں اور انہیں لشکریوں اور سرداروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

پس ——

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی لیے فرمایا تھا کہ اگر حیرہ جنگ کے بعد فتح ہوا تو شویل کی خواہش پوری کر دی جائے گی!

اب "حیرہ" جنابِ خالدؓ کے ہاتھوں لڑائی کے بعد فتح ہوا تھا اور صلح کی شرائط طے ہو رہی تھیں لہٰذا شویل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

جنابِ خالدؓ، شویل کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئے۔

"شویل!"

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا:

ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وعدے کو ضرور پورا کریں گے لیکن پہلے تمہیں اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش کرنی ہوگی!"

اب شویل سوچ میں پڑ گیا۔

سوچتے سوچتے اسے دو آدمیوں کے نام یاد آ گئے جو اس محفل میں موجود تھے اور اب اس لشکر میں جنابِ خالدؓ کے ساتھ آئے تھے۔

"اے سپہ سالار!"

شویل نے ان دو آدمیوں کے نام بتاتے ہوئے کہا:

"ان دونوں کو بلا کر میرے دعوے کی تصدیق کی جائے۔ اگر وہ دونوں تصدیق کر دیں تو وعدہ پورا کیا جائے ورنہ میں اپنے دعوے سے دستبردار ہو جاؤں گا"۔

جنابِ خالدؓ نے ان دونوں کو اسی وقت طلب کر لیا۔ ان دونوں کی عمریں بھی شویل ہی کی طرح جوانی سے گزر کر بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔

انہوں نے جنابِ خالدؓ بن ولید کے سامنے تصدیق کی کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعی شویل سے وعدہ کیا تھا کہ اگر حیرہ لڑائی کے بعد فتح ہوا تو کرامہ بنت عمرو شویل کی کنیزی میں دیدی جائے گی"۔

اس پر جنابِ خالدؓ بن ولید نے اعلان فرمایا:

"میں خالدؓ بن ولید اسلام کا ادنیٰ خادم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شویل سے کیے ہوئے وعدے کو اپنی جان دے کر بھی پورا کروں گا اور جب تک یہ شرط حیرہ سے آنے والا وفد تسلیم نہیں کرتا اس وقت تک اہلِ حیرہ سے صلح نہیں کی جائے گی"۔

لشکریوں نے جنابِ خالدؓ کے اس اعلان کو بہت سراہا اور شویل کی خوشی اور مسرت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

پھر جب حیرہ کے چاروں قلعدار صلح کی بات چیت کے لیے جنابِ خالدؓ بن ولید کے خیمے میں جمع ہوئے تو جنابِ خالدؓ نے انہیں ملامت کرنے کے بعد ان کے سامنے تین صورتیں پیش کیں جن میں سے ایک انہیں قبول کرنا تھی۔

وہ صورتیں یہ تھیں:

اسلام قبول کر کے اسلام کے سایۂ عافیت میں آ جاؤ۔

یہ قبول نہیں تو جزیہ ادا کر کے مسلمانوں کی حفاظت میں آ جاؤ۔

۴۔ یہ دونوں صورتیں منظور نہیں تو فیصلہ تلوار سے ہوگا۔

یہ شرطیں پیش کرنے کے بعد جناب خالدؓ نے فرمایا:

"ان تین باتوں میں سے کوئی ایک شرط تسلیم کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک شرط اور ہے جسے ہر حالت میں قبول کرنا ہوگا۔"

"اے لشکرِ اسلام کے سپہ سالار"۔

عمرو بن عبدالمسیح نے اعتراض کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ نے اب تک جتنے عہد نامے اور صلح نامے کیے ہیں ان میں آپ نے صرف تین شرطیں رکھی ہیں۔ مگر اس وقت آپ ایک چوتھی شرط بھی شامل فرما رہے ہیں اور یہ بھی کہ اسے تسلیم کرنا ضروری ہوگا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

جنابِ خالدؓ نے وفد کو دیکھتے ہوئے کہا:

"پہلے بتاؤ کہ تم میں سے عمرو بن عبدالمسیح کون ہے؟"

عمرو نے ہی اعتراض کیا تھا۔ اسی نے جواب دیا:

"اے سپہ سالار۔ عمرو بن عبدالمسیح میرا ہی نام ہے۔"

آپ نے دریافت کیا:

"کیا تمہاری بیٹی کا نام کرامہ ہے؟"

"جی ہاں سردار"۔

عمرو نے اقرار کرتے ہوئے کہا:

"مگر آپ کو یہ نام کس نے بتایا ہے؟"

جنابِ خالدؓ نے وضاحت کی:

"اب سے دس بارہ سال پہلے ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر حیرہ لڑائی کے بعد فتح ہوا تو کرامہ بنت عمرو، ہمارے ایک لشکری شویل کے حوالے کر دی جائے گی۔ چونکہ یہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ اور شویل سے وعدہ تھا اس لیے یہ شرط تمہیں ہر صورت میں قبول کرنا ہوگی"۔

اس پر حیرہ کا وفد بہت چراغ پا ہوا۔ اور صلح کے لیے مزید مشورے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ آخر یہ طے پایا کہ اس سلسلے میں کرامہ سے بھی مشورہ کیا جائے کہ وہ اس

معاملے میں کیا کہتی ہے۔

کرامہ بنت عمرو اپنے باپ کے منہ سے یہ بات سن کے بہت ہنسی اور بولی:

"اگر لشکرِ اسلام کے سپہ سالار نے صلح کے لیے یہی شرط رکھی ہے تو مجھے بغیر کسی عذر کے وہاں بھیج دیا جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے صلح نہ ہو۔ اور قلعوں والوں کی جانیں اس ذرا سی بات کیلیے ہلاکت میں پڑ جائیں۔

رہا میرے لونڈی بنائے جانے کا سوال اور کسی مسلمان لشکری کے حوالے کیے جانے کا مسئلہ تو آپ کو اس کی بالکل فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گی اور اپنے حاصل کرنے والے کو خوب سبق دے کر واپس آجاؤں گی"۔

عمرو بن عبدالمسیح کے قبیلے والے اس شرط کو ماننے پر کسی طرح راضی نہ ہو رہے تھے مگر کرامہ بنت عمرو کے کہنے پر راضی ہو گئے۔

اس طرح صلح ہو گئی اور کرامہ بنت عمرو قلعہ سے لشکرِ اسلام میں بھیج دی گئی۔

شویل بہت خوش تھا۔ اس کی برسوں کی آرزو پوری ہو رہی تھی اور حیرہ کی مغرور حسینہ اس کی کنیزی میں آ رہی تھی۔

پھر جنابِ خالدؓ بن ولید نے شویل کو بلوایا کہ وہ آ کے کرامہ بنت عمرو کو اپنے ساتھ لے جائے تاکہ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کو پورا کرنے کا شرف حاصل کر سکیں۔

شویل جب کرامہ کو لینے جنابِ خالدؓ کے خیمے کی طرف چلا تو خوشی کے مارے اس کے قدم زمین پہ نہ پڑ رہے تھے۔

وہ کرامہ کا حسین تصور اپنی آنکھوں میں سجائے سپہ سالار کے خیمے تک پہنچا۔ وہاں حیرہ کے چاروں قلعدار موجود تھے اور ایک عورت چادر اوڑھے، منہ گھمائے بیٹھی تھی۔

"شویل!"

جنابِ خالدؓ بن ولید نے کہا:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ اس وقت پورا ہو رہا ہے۔ قلعدار عمرو بن عبدالمسیح اپنی بیٹی کرامہ کو لائے ہیں۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کو پورا کرنے کا شرف حاصل کر سکیں"۔

شویل کے منہ سے خوشی کے مارے الفاظ نہ نکل رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے سپہ سالار کا

شکریہ ادا کیا اور بیٹھی ہوئی خاتون کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

کرامہ کپڑوں میں لپٹی اور گٹھڑی بنی وہاں سے اٹھی اور شویل کے پیچھے چل پڑی۔ اس نے اپنے اور کرامہ کے لیے ایک بڑا خیمہ پہلے ہی حاصل کر لیا تھا۔ پس وہ کرامہ کو اسی خیمے میں لے گیا۔

شویل نے خیمے میں پہنچ کے بڑی محبت اور چاؤ سے کرامہ سے کہا:

"اے میری جانِ جگر۔ میری محبوبہ! تم گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں اپنی لونڈی بنا کے نہیں رکھوں گا بلکہ اپنی ملکہ بناؤں گا۔ تم سے شادی کروں گا۔

اب مجھے زیادہ نہ ستاؤ اور اپنا دیدار کراؤ۔ میں پچھلے بارہ سال سے تمہارے فراق میں تڑپ رہا ہوں۔"

کرامہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی:

"لو۔ اپنی جانِ جگر اور محبوبہ کو دیکھو اور کلیجہ ٹھنڈا کرو۔"

یہ کہہ کے اس نے جسم پر لپٹی ہوئی چادر اتار پھینکی۔

شویل نے دھڑکتے دل سے کرامہ کی طرف جھکتی نظروں سے دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔

اس کے تصور میں ایک سرخ و سفید چھریرے بدن کی، مسکراتی آنکھوں اور محشر بپا کرتی چال والی دوشیزہ تھی۔

مگر ـــ

اس کی جگہ جو کرامہ اس کے سامنے کھڑی تھی وہ ایک بھدّے سے بدن والی ادھیڑ عمر عورت تھی جس کے سر کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔

"تم....."

شویل نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"کیا تم.... کرامہ بنت عمرو ہو؟"

"ہاں ہاں میں ہی کرامہ بنت عمرو ہوں۔"

کرامہ نے تلخی سے کہا:

"اب تم مجھ بوڑھی عورت کو کیا کرو گے۔"

"مگر..... مگر....."

شویل کے سر سے عشق کا نشہ ہوا ہو گیا:

"کیا تم.... وہی.... وہی کرامہ ہو جس پر پورا حیرہ فدا تھا اور تم کسی کو منہ نہ لگاتی تھیں؟"

"کہہ رہی ہوں کہ میں وہی ہوں۔"

کرامہ کے لہجے میں تلخی کچھ اور بڑھ گئی:

"تم کس قدر نادان ہو شویل۔ تم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ حسن و جوانی عارضی ہوتے ہیں اور عورت کی جوانی تو بس اس کی شادی تک ہوتی ہے۔ شادی ہوتے ہی عورت کی جوانی ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس وقت کو تو بارہ سال گزر چکے ہیں۔

تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ گزرتے وقت کی دھول نے میرے نقش و نگار ملیامیٹ کر دیے ہوں گے....."

کرامہ بنت عمرو دیر تک بکتی جھکتی رہی۔

شویل نہ جانے کن خیالوں میں کھو کر رہ گیا۔

آخر کرامہ نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"شویل! میں جانتی ہوں کہ مجھے دیکھ کے تمہارے تصور کے سارے تانے بانے بکھر گئے ہیں۔ اور یقیناً تم ایک بوڑھی لونڈی کو اپنے پاس رکھنا پسند نہ کرو گے۔ ہاں اگر تم مجھے آزاد کرنے پر آمادہ ہو تو میں تمہیں اپنے عزیزوں سے فدیہ کی ایک اچھی رقم دلوا سکتی ہوں۔"

"فدیہ!"

شویل جیسے خواب سے چونکا:

"یعنی تم فدیہ دے کر آزاد ہونا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ اگر تم پسند کرو تو۔"

"فدیہ میں تم کتنی رقم دے سکتی ہو؟"

"میں تمہیں ایک معقول رقم دلوا سکتی ہوں۔"

"نہیں۔"

شویل نے ایک دم انکار کر دیا:

"میں معقول رقم نہیں لے سکتا۔"

کرامہ بنت عمرو گھبرا گئی:

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

شویل چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا:

"فدیہ کی رقم میں مقرر کروں گا۔"

"مگر کتنی رقم؟ کچھ بتاؤ تو۔" کرامہ نے بات مختصر کی۔

شویل نے سنبھل کے بڑی متانت سے کہا:

"تم مجھے ہزار درہم دوگی تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

"ہزار درہم!"

کرامہ نے بڑی حیرت سے شویل کا منہ دیکھا:

"تم نے یہی کہا ہے نا؟"

"ہاں ہاں ہزار درہم"۔

شویل زور دے کر بولا:

"اس سے کم نہیں لوں گا۔"

"مگر یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" کرامہ نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"بس۔ میں نے کہہ دیا۔"

شویل فیصلہ کن انداز میں بولا:

"ہزار درہم دینا منظور ہو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ مزید کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا۔"

اس نے ایک آہ بھر کر کہا:

"میں اپنے رشتے داروں سے بات کرتی ہوں۔"

کرامہ نے اسی وقت اپنے باپ عمرو کے پاس پیام بھیجا کہ شویل صرف ایک ہزار درہم فدیہ کے عوض اسے آزاد کرنے پر آمادہ ہے۔

عمرو کو جیسے ہی معلوم ہوا، وہ ایک ایک ہزار کی پانچ تھیلیاں بھروا کر فوراً شویل کے خیمے پر پہنچ گیا۔

اس نے شویل سے کہا:

"میں فدیہ کی رقم لے آیا ہوں۔ تم اپنے آدمیوں کو بلا کر تسلی کر لو۔" یہ کہہ کر اس نے ہزار درہم

کا تھیلا شویل کے سامنے رکھ دیا۔

شویل بہت خوش تھا کہ اس نے اپنی لونڈی کی قیمت ہزار درہم مقرر کی ہے اور وہ اسے مل رہی ہے اس نے برابر سے دو آدمی بلوا لئے۔

عمرو نے تھیلا ان کی طرف بڑھا کے کہا:

"رقم گن لو۔ پورے ہزار درہم ہیں"۔

شویل کے ساتھیوں نے شویل کی طرف دیکھا۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو"۔

شویل نے تنک کر کہا:

"رقم گنو۔ میں ہزار درہم فدیہ میں کرامہ کو آزاد کر رہا ہوں"۔

شویل کے ایک ساتھی نے رقم گننے کے بعد کہا:

"ٹھیک ہے۔ پورے ہزار درہم ہیں"۔

عمرو بن عبدالمسیح نے خود اپنے ہاتھ سے درہم دوبارہ تھیلے میں بھر دیے اور تھیلا شویل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"یہ تمہاری منہ مانگی رقم ہے شویل۔ چاہو تو دوبارہ گن لو۔"

"نہیں نہیں"۔

شویل نے رقم کا تھیلا اپنی طرف کھینچ لیا:

"میں مطمئن ہوں"۔

عمرو نے جلدی سے کہا:

"تو اب میں کرامہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ تم نے آزاد کر دیا ہے اسے؟"

"ہاں ہاں۔ میں نے آزاد کر دیا"۔

شویل نے زور دے کر کہا:

"تم لے جا سکتے ہو اپنی بیٹی کو۔"

عمرو نے کرامہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد شویل کے ایک ساتھی نے کہا:

"تم کس قدر بے وقوف ہو شویل۔ کرامہ ایک قلعدار کی بیٹی تھی۔ تم نے اسے صرف ہزار درہم لے کر

آزاد کر دیا۔ احمق ہو تم۔"

شویل نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا:

"میں نے سب سے زیادہ فدیہ تو مانگا تھا۔ اور کیا مانگتا؟"

"ارے بے وقوف۔ ہزار سے زیادہ مانگا ہوتا۔" دوسرا ساتھی بولا۔

"ہزار سے بھی زیادہ کچھ ہوتا ہے؟"

شویل نے بھولپن سے کہا:

"مجھے تو اس سے زیادہ گنتی ہی نہیں آتی"۔

اس کے دونوں ساتھی ہنسنے لگے۔ پھر ایک نے کہا:

"شویل۔ اگر تم نہیں جانتے تھے تو کسی سے مشورہ کر لیا ہوتا۔ لوگ تو دیواروں سے بھی مشورہ کر لیا کرتے ہیں۔"

شویل دوڑا دوڑا سپہ سالار خالدؓ بن ولید کے پاس گیا اور انہیں بتایا:

"سپہ سالار۔ میں نے ہزار درہم میں کرامہ کو آزاد کر دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہزار سے زیادہ بھی عدد ہوتے ہیں۔"

"شویل!"

حضرت خالدؓ نے فرمایا:

"تم کچھ چاہتے تھے اور اللہ نے کچھ اور چاہا۔ ہم تو ظاہر کو جانتے ہیں اور اسی پر عمل کرتے ہیں۔ تم جانو اور تمہاری نیت جانے۔ تم نے ہزار درہم لاعلمی میں مانگے ہوں یا جان بوجھ کر۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

اور شویل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

خالدؓ بن ولید ابھی وہیں مقیم تھے کہ ناطف کے پادری کا نمائندہ صلوبا بن نسطونا ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اس نے بانقیا اور بار وسما کے قصبات کے متعلق مصالحت کی بات چیت کی۔ اس نے ان قصبات کی آبادی کے ساتھ ساتھ اس اراضی کی ذمے داری بھی لی جو فرات کے کنارے پر آباد تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ کسریٰ کے موتیوں کے علاوہ اپنی ذات، قوم اور خاندان کی طرف سے دس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرے گا۔

بس ـــ

اس بات چیت کے مطابق باقاعدہ معاہدہ لکھا گیا جس پر صلوبا بن نسطونا کے علاوہ جنابِ خالدؓ نے دستخط کیے۔ گواہوں کی حیثیت سے درجِ ذیل اشخاص نے دستخط کیے:

ہشام بن ولید
قعقاع بن عمرو
جریر بن عبداللہ الحمیری اور
حنظلہ بن ربیع





عراق کے دوسرے زمیندار اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں حیرہ والوں پر کیا گزرتی ہے؟ اسی کے مطابق وہ خود بھی قدم اٹھائیں گے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ اہلِ حیرہ نے صلح کا معاہدہ کر لیا ہے تو ان کے نمائندے بھی حضرتِ خالدؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مصالحت کی درخواست کی۔

ان زمینداروں سے جو معاہدہ طے پایا اس میں اقرار کیا گیا کہ فلالیج سے ہرمز جرد تک کے علاقہ کے لیے بیس لاکھ درہم سالانہ جزیہ ادا کیا جائے گا۔

یہ بھی طے پایا کہ آلِ کسریٰ کی تمام املاک مسلمانوں کی ملکیت ہوں گی۔ جو لوگ وطن چھوڑ گئے ہیں ان کی املاک بھی مسلمانوں کی ملکیت ہوں گی۔

جنابِ خالدؓ بن ولید کی زیرِ کمان عراق کا بیشتر علاقہ فتح ہوا تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام جو جنگ کی وجہ سے درہم برہم ہو چکا تھا اسے درست کیا جائے۔ چنانچہ جنابِ خالدؓ نے مفتوحہ علاقوں کے مختلف حصوں میں امرا مقرر کیے جن کے ذمے خراج کی وصولی اور سرحدوں کی حفاظت ڈالی گئی۔

جنابِ خالدؓ کے ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس طرح فنونِ سپہ گری میں ماہر تھے اسی طرح ملکی انتظام میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ کسی ملک کا فتح کرنا اس قدر مشکل نہیں جس قدر مفتوحہ علاقوں میں نظم و ضبط پیدا کرنا اور ان پر قبضہ قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے جو امرا مقرر کیے ان کے نام اور علاقے مندرجہ ذیل ہیں:

مفتوحہ علاقہ	امیر
۱۔ فلالیج کا بالائی علاقہ	عبداللہ بن النفری
۲۔ بارو سما	جریرؓ بن عبداللہ
۳۔ نہرین	بشیر بن خصاصیہ
۴۔ تستر	سوید بن مقرن
۵۔ روذمستان	أط بن ابی أط

ان انتظامات کے باعث خالدؓ بن ولید کو پچاس دن کے اندر اندر تمام علاقوں کا خراج موصول ہو گیا۔

واضح رہے کہ یہ امرا صرف خراج کی وصولی اور اندرونی انتظام کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ سرحدوں کی حفاظت پر دوسرے سردار مقرر ہوئے جن میں خاص خاص یہ ہیں:

۱۔ ضرار بن ازور
۲۔ ضرار بن خطاب
۳۔ مثنیٰ بن حارثہ
۴۔ ضرار بن مقرن
۵۔ بسر بن ابی رہم
۶۔ قعقاع بن عمرو
۷۔ عتیبہ بن نہاس

خالدؓ بن ولید نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ سرحدوں سے نکل کر دشمن پر یورش کرتے رہیں اور انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی سرحد سے آگے دجلہ تک کا سارا علاقہ دشمن سے چھین لیا تھا۔

خالدؓ بن ولید نے آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور حکمتِ عملی اختیار کی۔ انہوں نے مرہ اور ہزقیل نام کے دو قاصد مقرر کیے اور انہیں الگ الگ دو خط دیے۔

مرہ کو جو خط دیا گیا وہ امرائے فارس کے نام تھا اور ہزقیل کو جو خط دیا گیا وہ فارس کے عوام

کے نام تھا۔

دونوں خطوں کی عبارت تقریباً ایک ہی تھی جس میں انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ تین باتوں میں سے ایک تسلیم کر لو ورنہ جنگ ہو گی۔

ان دنوں لشکرِ اسلام دجلہ کے اس طرف عراقی علاقوں پر یکے بعد دیگرے فتوحات حاصل کر رہا تھا، فارس کے لوگ اردشیر کے مرنے کے بعد اس کے جانشین کے تقرر کے لیے خانہ جنگی میں مصروف تھے۔ انہوں نے صرف ہرسیر پر ہی مدافعت کی کوشش کی ورنہ باقی مقامات پر اپنے ہی جھگڑوں میں مصروف رہے اور مسلمان آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔

یہ بات نہیں کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف وہ سب متحد تھے مگر مقابلہ کو ایک دوسرے پر ٹال رہے تھے۔

پھر جب ان کے پاس خالدؓ بن ولید کا نامہ پہنچا تو جیسے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے فوری طور پر فرخ زاد بن بنداں کو وقتی طور پر ایران کا شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ یہ شخص شاہی خاندان سے نہ تھا اور اسے اس وقت تک کے لیے شہنشاہ مقرر کیا گیا تھا جب تک کسی شہزادے پر اتفاق رائے نہ ہو جاتا۔

دوسری طرف خالدؓ بن ولید مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے قعقاع بن عمرو کو حیرہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود لشکر لے کر عیاض بن غنم کی مدد کو روانہ ہوئے۔

عیاض کو جنابِ ابوبکرؓ نے بالائی عراق فتح کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ مقدمۃ الجیش پر الاقرع بن حابس متعین تھے۔

حیرہ سے جنابِ خالدؓ پہلے فلوجہ پہنچے۔ وہاں سے کربلا آئے۔ کربلا کی فوجی چوکی پر عاصم بن عمرو تعینات تھے۔ وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد جنابِ خالدؓ انبار روانہ ہوئے۔

انبار والوں نے حضرت خالدؓ کے آنے کی اطلاع پاتے ہی قلعہ کے آگے ایک گہری خندق کھودی اور اس میں محفوظ ہو کر بیٹھ گئے۔

خالدؓ بن ولید نے وہاں پہنچ کے قلعہ اور خندق کے گرد ایک چکر لگایا۔ انہوں نے اپنے تجربہ سے اندازہ لگایا کہ دشمن ناتجربہ کار ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ تاک تاک کر دشمن سپاہیوں کی

آنکھوں کو نشانہ بنائیں۔

تیراندازوں نے اس حکم پر عمل کیا اور ایک دن میں دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں کی آنکھوں کو ناکارہ کر دیا۔

اس سے دشمن کے لشکر میں کہرام مچ گیا۔ انہوں نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کیا۔ ان کا حاکم ساباط کا رئیس شیرزاد تھا۔ اس نے صلح کی جو شرائط رکھیں انہیں خالدؓ بن ولید نے نامنظور کر دیا۔

اس کے بعد انہوں نے خندق کے گرد چکر لگایا۔

ایک جگہ خندق ذرا تنگ تھی۔ جنابِ خالدؓ نے حکم دیا کہ بیمار اور زخمی اونٹوں کو ذبح کر کے خندق کے اس حصے میں ڈال دیا جائے۔

فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے خندق کا وہ حصہ پر ہو گیا۔ جنابِ خالدؓ بن ولید اپنے لشکر کے ساتھ خندق پار کر گئے۔ دشمن نے یہ دیکھ کر خندق خالی کر دی اور بھاگ کر قلعہ کے اندر چلا گیا۔

اب خالدؓ بن ولید نے قلعے پر شدید حملہ کیا۔ شیرزاد نے مجبور ہو کر پھر صلح کی درخواست کی اور کہا کہ:

"مجھے اپنے ایک دستہ کے ساتھ خالی ہاتھ نکل جانے دیا جائے۔"

خالدؓ بن ولید نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

شیرزاد کے جانے کے بعد قلعہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ جنابِ خالدؓ نے انبار پر زبرقان بن بدر کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود عین التمر کی طرف روانہ ہوئے۔ عین التمر، کوفہ کے مغرب میں انبار کے قریب صحرائی جانب ایک قصبہ ہے۔

عین التمر میں بہرام چوبین کا لڑکا بہرام ایک زبردست ایرانی لشکر کے ساتھ موجود تھا۔ اس لشکر کے ساتھ ایرانی ماتحت علاقوں کے عرب قبائل، نمر اور تغلب وغیرہ کی فوجیں بھی تھیں۔

بہرام نے اس خیال سے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، خالدؓ بن ولید کے مقابلہ پر عرب قبائل کو آگے روانہ کر دیا اور خود ایک دن کے فاصلے پر قلعہ میں لشکر لے کر بیٹھ گیا۔

خالدؓ بن ولید نے نمر اور تغلب قبائل کے مقابلے پر پہنچتے ہی ان پر حملہ کر دیا اور ان کے سردار کو

کمند پھینک کر گرفتار کر لیا۔

سرداری کی گرفتاری سے عرب قبائل بھاگ کھڑے ہوئے مگر جب وہ قلعہ پر پہنچے تو اس کے دروازے بند تھے کیونکہ قلعہ کے اندر ان کے لیے گنجائش نہ تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ عرب قبائل قلعہ کے باہر حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے۔

پھر قلعہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔

اس قلعہ میں ایک گرجا تھا۔ وہاں چالیس لڑکے انجیل کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انہیں جنابِ خالدؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے ان سے دریافت کیا:

"تم لوگ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم اس کلیسا کے لیے وقف ہیں۔"

ایک لڑکے نے جواب دیا:

"اور یہاں انجیل مقدس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔"

حضرت خالدؓ نے حکم دیا کہ ان لڑکوں کو اسلامی تعلیم دی جائے چنانچہ ان میں سے بعض لڑکوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ مثلاً سیر بن ابو محمد بن عثمان کے غلام حمران اور ابو موسیٰ بن نصیر وغیرہ۔ انہوں نے اسلامی سلطنت کے استحکام کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

قلعہ عین التمر ہی میں جنابِ خالدؓ بن ولید کو حضرت عیاض بن غنم کا خط ملا۔ عیاض نے شمالی عراق میں قلعہ دومۃ الجندل کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس کے جواب میں اہالیانِ دومۃ الجندل نے عیاض بن غنم کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید، عیاض کا خط پاتے ہی دومۃ الجندل جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے عویم بن کاہل اسلمی کو عین التمر میں اپنا نائب مقرر کیا اور چل پڑے۔ دومۃ الجندل کا قصبہ دمشق اور مدینہ کے درمیانی راستے سے سات منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔

اہل دومۃ الجندل کو خالدؓ بن ولید کے آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے بہرا، کلب، غسان، تنوخ اور ضجاعم وغیرہ کے قبائل سے کمک طلب کی۔ سب سے پہلے ودیعہ کی سرکردگی میں کلب اور بہرا سے فوجی کمک آئی۔

ان سب نے مل کر عیاض پر حملہ کر دیا۔

عیاض بن غنم نے محاصرہ برقرار رکھتے ہوئے ان تازہ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں کی فوج کے دو سردار تھے۔

اکیدر بن عبدالملک اور

جودی بن ربیعہ۔

ادھر جب حضرتِ خالدؓ، دومۃ الجندل پہنچے تو ان سرداروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

اکیدر بن عبدالملک نے کہا:

"میں تمہاری نسبت خالدؓ بن ولید سے بہت زیادہ واقف ہوں۔ آج دنیا میں خالدؓ سے بڑھ کر کوئی اقبال مند اور فنونِ حرب کا ماہر نہیں ہے۔ جو قوم خالدؓ سے مقابلہ کرتی ہے وہ خواہ تعداد میں کتنی ہی کیوں نہ ہو وہ خالدؓ سے شکست ہی کھاتی ہے۔ اس لیے میری بات مانو اور خالدؓ سے صلح کر لو۔"

اکیدر کی یہ بات اس کے سابقہ تجربے کی روشنی میں درست تھی۔ اس کا اس سے پہلے خالدؓ بن ولید سے اس وقت سابقہ پڑا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک سے خالدؓ بن ولید کو اس کی طرف بھیجا تھا اور پیش گوئی کی تھی کہ اکیدر انہیں گائے کا شکار کھیلتا ہوا ملے گا۔

خالدؓ نے اسے گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اکیدر نے اطاعت قبول کر لی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔

اکیدر کی رائے بالکل صائب تھی لیکن جودی بن ربیعہ نے اس کی بات نہ مانی چنانچہ اکیدر وہاں سے یہ کہہ کر روانہ ہو گیا کہ:

"تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تمہارے ساتھ مل کر خالدؓ بن ولید سے جنگ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

حضرت خالدؓ کو اکیدر کے بھاگنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے عاصم بن عمروؓ کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ عاصم نے اکیدر کو راستے ہی میں جا لیا اور گرفتار کر کے لے آئے۔

جنابِ خالدؓ نے بدعہدی اور بغاوت کی پاداش میں اس کی گردن اڑا دی۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی آمد پر دومۃ الجندل والوں نے کسی گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا بلکہ بڑے اطمینان سے

صف بندی کی۔

جودی بن ربیعہ اور ودیعہ، حضرت خالدؓ کی طرف اور ابن صدر جان اور ابن الدیہم، عیاض بن غنم کے مقابل صف آرا ہوئے۔

حضرت خالدؓ نے جودی بن ربیعہ کو اور اقرع بن حابس نے ودیعہ کو گرفتار کر لیا۔ باقی لوگ قلعہ کی طرف بھاگے مگر قلعہ میں جگہ ہی نہ تھی۔ اہلِ قلعہ نے دروازہ نہ کھولا اور مسلمانوں نے اس قدر لوگوں کو قتل کیا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔

اس وقت خالدؓ کی فوج کے سردار عاصم بن عمرو نے اپنے قبیلہ بنو تمیم سے اپنے حلیف بنو کلب کی امداد کی اپیل کی۔ بنو تمیم فوراً ان کی (بنو کلب) کی امداد کو پہنچے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے قلعہ کا دروازہ اکھڑوا ڈالا اور آدھے سے زیادہ محصورین مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

دومۃ الجندل کی مہم سے فارغ ہو کر جناب خالدؓ حیرہ واپس آئے۔ وہاں آ کر معلوم ہوا کہ عین التمر کا بدلہ لینے کے لیے عربوں اور ایرانیوں کا ایک لشکر حصید اور خنافس میں جمع ہے۔ آپ نے ان کے مقابلے پر دو دستے روانہ کیے جنہوں نے اس لشکر کو مار بھگایا۔

اس کے بعد جنابِ خالدؓ نے مصیخ کا قصد کیا۔ وہاں عربوں کی ایک جماعت مقابلہ کے لیے جمع تھی جناب خالدؓ نے اسے شکست دی۔

پھر ثنی اور بشر کے معرکے ہوئے جن میں خالدؓ بن ولید غالب رہے۔

مصیخ کی مہم میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ وہاں رات کے وقت اچانک حملہ کیا گیا۔ دشمن فوج کا سردار ہذیل تھا۔ وہ بھاگ نکلا اور اس کا تمام لشکر قتل ہو گیا۔ اس جنگ میں دو مسلمان جریرؓ بن عبداللہ کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے پاس جنابِ ابوبکرؓ کا عطا کردہ ایک صداقت نامہ بھی موجود تھا۔ ان مسلمانوں کے نام عبدالعزیٰ بن ابی رہم اور لبید بن جریر تھے۔

جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ عبدالعزیٰ حملہ کی رات کو ایسے اشعار پڑھ رہے تھے جن میں صاف طور پر اللہ کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا ذکر تھا تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کر دیا۔

حضرت عمرؓ، مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی وجہ سے حضرت خالدؓ بن ولید کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ جب ان مسلمانوں کے قتل پر شور اٹھایا گیا تو جنابِ ابوبکرؓ نے صاف الفاظ میں فرمایا:

"جو مسلمان، دشمن کی سرزمین پر دشمن کے ساتھ قیام پذیر ہوں گے ان کے ساتھ ایسی صورت حال کا پیش آنا ممکن ہے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر وہ دونوں چاہتے تو دشمن سے علیحدہ ہو کر کسی اور جگہ رہ سکتے تھے۔ انہیں خوامخواہ ایسی جگہ ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی جس کے متعلق انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ یہ دشمنانِ اسلام کی جائے سکونت ہے اور وہاں میدانِ کارزار گرم ہونے والا ہے۔ بھلا جنگ کے ہنگامہ میں اتنی فرصت کسے ہوتی ہے کہ وہ یہ دیکھ سکے کہ ان دشمنوں میں کوئی مسلمان تو نہیں ہے۔ پھر وہاں رات کو حملہ ہوا تھا اور سب لوگ سوتے ہی میں قتل ہو گئے تھے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لشکرِ اسلام اور دربارِ خلافت میں بعض ایسے لوگ ضرور موجود تھے کہ جو خالدؓ بن ولید کی فتوحات کو پسند نہ کرتے تھے ورنہ جنابِ ابوبکرؓ کو یہ خبر پہنچانا کہ ایک مسلمان اس رات اللہ اور رسولؐ کی تعریف میں اشعار پڑھ رہا تھا، ایک غلط اور بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جب اُن دو مسلمانوں کو اتنی عقل تھی کہ وہ اپنی شناخت اشعار پڑھ کر کرا رہے تھے تو ان کو یہ عقل کیوں نہ آئی کہ وہ غیر مسلم علاقہ چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے جائیں۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی عراقی علاقہ میں آخری جنگ "جنگِ فراض" تھی۔ فراض کے مقام پر الجزیرہ، شام اور عراق کی سرحدیں ملتی تھیں۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لشکروں کی روانگی کے وقت حکم دیا تھا کہ اسلامی لشکر فراض پر جمع ہوں۔

خالدؓ بن ولید بھی فراض پر اس لیے قبضہ چاہتے تھے کہ جب وہ ایرانی علاقے میں داخل ہوں تو ان کی پشت محفوظ رہے۔

جب اسلامی لشکر فراض پہنچا تو اسے دیکھ کر رومیوں کو بہت طیش آیا۔ انہوں نے فوراً ایران قاصد روانہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ پر ان کی مدد کرے۔

ایران، مسلمانوں سے پے بہ پے شکستیں کھا چکا تھا اور جذبۂ انتقام سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے فوجی دستے فراض روانہ کر دیے۔

پس مسلمانوں اور مخالفوں کے لشکر فراض میں دریائے فرات کے کنارے آمنے سامنے ہوئے۔ صورتحال یہ تھی کہ مسلمان دریا کے اس طرف تھے اور دشمن کا متحدہ لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔ چنانچہ دشمن کا ایک ہرکارہ جنابِ خالدؓ بن ولید کے پاس آیا اور اس نے اپنے سردار کا پیغام دیا کہ:

"یا تو آپ دریا پار کر کے لشکر لے کر مقابلہ پر آئیں یا پھر ہمیں دریا پار کر کے اپنے مقابلے پر آنے دیں"۔

خالدؓ بن ولید نے پیغام کے جواب میں کہا کہ:

"تم دریا پار کر کے ادھر آجاؤ"۔

اس پر دوسرا مطالبہ پیش کیا گیا کہ:

"آپ اپنا لشکر ساحل سے اتنی دور پیچھے ہٹالیں کہ ہم اطمینان سے دریا پار آسکیں"۔

اس کے جواب الجواب میں جنابِ خالدؓ نے پیغام بھیجا کہ:

"ہمارا لشکر یہیں موجود رہے گا۔ تم لوگ دریا کو کچھ اوپر یا کچھ نیچے جا کر پار کر سکتے ہو۔ لشکرِ اسلام کی طرف سے یقین دلایا جاتا ہے کہ دریا پار کرتے وقت کسی قسم کی شرارت یا جنگ نہیں کی جائے گی"۔

اس اطمینان کے بعد دشمن کا لشکر دریائے فرات کے پار آیا اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

خالدؓ بن ولید نے اس موقع پر بھی حکم دیا کہ تمام گروہ علیحدہ علیحدہ ہو کے جنگ کریں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ کس گروہ نے زیادہ شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اس حکمتِ عملی سے ہر قبیلہ بڑے جوش و خروش سے لڑا اور لشکرِ اسلام نے جلد ہی دشمن کو میدان سے شکست دے کر مار بھگایا۔

خالدؓ بن ولید نے حکم دیا:

"بھاگنے والوں کا پیچھا کرو اور انہیں دم نہ لینے دو"۔

چنانچہ مسلمانوں نے دور دور تک دشمنانِ اسلام کا تعاقب کیا اور انہیں قتل کیا۔ اس طرح فراض کے میدانِ جنگ میں اور تعاقب میں قتل ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زائد تھی۔

خالدؓ بن ولید نے فراض میں دس دن قیام کیا۔ پھر ۲۵۔ ذیقعد سنہ ۱۲ھ کو اپنی فوج کو حیرہ کی جانب کوچ کا حکم دیا۔

آپ نے عاصم بن عمرو کو حکم دیا کہ وہ لشکر کے ساتھ حیرہ جائیں۔ انہوں نے شجر بن الاغر کو ساقہ (فوج کے پچھلے دستے جو پشت سے حملہ روکتے ہیں) کا کماندار مقرر کیا۔

خالدؓ بن ولید نے اپنے متعلق یہ بتایا کہ وہ ساقہ کے ساتھ آرہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ آپ فوج سے جدا ہو کر حج کے لیے مکہ روانہ ہو گئے تھے۔

خالدؓ کے ساتھ صرف چند آدمی تھے مگر ان اجنبی راستوں سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اس تیز رفتاری سے مکہ پہنچے اور وہاں سے حج کر کے واپس آئے کہ جب لشکرِ اسلام کے آخری دستے حیرہ میں داخل ہو رہے تھے تو آپ ان میں آشامل ہوئے۔

جب لوگوں نے ان کے منڈے ہوئے سر دیکھے تو ان کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ حج کر کے آئے ہیں!

اسی زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے جن امراء کو شام کی طرف بھیجا تھا انہوں نے دربارِ خلافت سے کمک کی درخواست کی۔

حضرت ابوبکرؓ نے شام کے محاذ پر بھی جنابِ خالدؓ بن ولید کو بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ عراق کے محاذ پر اللہ کی اس تلوار نے ایرانیوں کی طاقت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

خالدؓ بن ولید نے جو خفیہ حج کیا تھا اس کی خبر دربارِ خلافت میں پہنچ گئی تھی۔ خالدؓ نے اگرچہ ایک دینی فریضہ انجام دیا تھا مگر جنابِ ابوبکرؓ ان کے اس اقدام سے خوش نہ تھے۔ ان کے خیال میں میدانِ جنگ میں دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے لشکرِ اسلام کو چھوڑ کر فریضۂ حج کے لیے جانا دوراندیشی اور مصلحت کے قطعاً خلاف تھا۔

پھر جب خلیفۂ محترم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو شام کے محاذ پر جانے کے لیے عبدالرحمٰن بن جمیل کے ہاتھ خط روانہ کیا تو اس میں بھی اس خفیہ حج کے بارے میں آپ نے اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

خط کا مضمون حسبِ ذیل تھا:

"تم یہاں سے روانہ ہو کر یرموک میں مسلمانوں کی جماعت سے جا ملو کیونکہ وہ دشمن کے نرغے میں آگئے ہیں۔

یہ حرکت (خفیہ حج) جو تم نے اب کی ہے آئندہ کبھی تم سے سرزد نہ ہو

یہ خدائے تعالیٰ کا فضل ہے کہ تمہارے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں
اور تم مسلمانوں کو دشمن کے نرغے سے صاف بچا لاتے ہو۔
اے ابو سلیمان!
میں تمہیں تمہارے خلوص اور خوش قسمتی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اس مہم کو
پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے۔
تمہارے دل میں غرور نہ پیدا ہونا چاہیے کیونکہ غرور کا انجام نقصان اور
رسوائی ہے۔
اپنے کسی فعل پہ نازاں بھی نہ ہونا۔ فضل و کرم کرنے والا صرف اللہ ہے
اور وہی اعمال کا صلہ دیتا ہے۔"

خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خالدؓ بن ولید کو یرموک یعنی ملک شام کی طرف روانگی کا حکم دیا تھا چنانچہ جناب خالدؓ بن ولید نے عراقی مہمات میں ایک سال دو ماہ کا عرصہ صرف کیا اور اس دوران پندرہ جنگوں میں حصہ لیا۔

ان تمام جنگوں میں حضرت خالدؓ کا مقابلہ اپنے سے بڑے لشکر سے ہوا جو بہترین اسلحے سے لیس تھے لیکن خدا کی یہ رحمت خاص تھی کہ جناب خالدؓ[1] نے ان تمام جنگوں میں فتح حاصل کی اور دشمن کو ہر موقع پر شکست دے کر مار بھگایا۔

خالدؓ بن ولید کی ان جنگوں کا ایرانیوں اور خود عربوں پر کیا اثر پڑا؟ اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اسلام کا ظہور جس زمانہ اور جن حالات میں عربوں میں ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب قوم نے ایک طرف رومیوں اور دوسری طرف ایرانیوں کو اپنا آقا تسلیم کر لیا تھا اور شاہانِ کسریٰ اور شہنشاہِ روم (قسطنطنیہ) کے درباروں میں جبّہ سائی کرنے کو وہ اپنا سب سے بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔

۱۔ جنگِ موتہ

تاریخ بتاتی ہے کہ جب عرب، شہنشاہِ ایران کے دربار میں سلامی کے لیے حاضر ہوتے تو انہیں سجدے[1] کی اجازت کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب شہنشاہِ ایران کو معلوم ہوا کہ عرب لشکر ان کے ملک پر حملہ آور ہوا ہے تو اسے بڑی مشکل سے اس پر اعتبار آیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں عرب قوم اس قابل ہی نہ تھی کہ وہ لشکر کی صورت میں کسی شہنشاہ کے مقابلہ میں اٹھنے کی جرأت بھی کر سکے۔

جنگِ الیس کے موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان لشکر ان پر حملے کے لیے آ رہا ہے اور وہ بڑے اطمینان سے دسترخوان سجائے ناؤ نوش میں مصروف ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایرانی، عربوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے مگر جب ان کے بڑے بڑے لشکروں کو لشکرِ اسلام سے شکست ہوئی تو ان کی آنکھیں کھلیں۔ تاہم اب ان کی سلطنت کے خاتمے کا وقت آ گیا تھا اور وہاں تخت و تاج کے لیے خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ ان پر لشکرِ اسلام اور خاص طور پر لشکرِ اسلام کے سپہ سالار حضرت خالدؓ بن ولید کا اس قدر رعب طاری ہو گیا کہ اب وہ جنگ سے پہلے ہی حوصلہ چھوڑ دیتے تھے۔

عراق میں جنگوں سے پہلے عرب آپس میں جنگ کرتے اور اپنے روایتی ہتھیار اور طریقے استعمال کرتے تھے لیکن جب وہ عرب سے نکل کر عراق میں داخل ہوئے اور انہیں خالدؓ بن ولید جیسا سپہ سالار میسر ہوا تو ان پر خالدؓ کی سپہ گری کے جوہر کھلے۔

خالدؓ بن ولید میں خداداد خوبی یہ بھی تھی کہ وقت اور موقع کے لحاظ سے اپنی جنگی حکمتِ عملی ترتیب دیتے تھے۔ وہ کبھی میدانِ جنگ میں فوجوں کو لڑاتے تو کبھی شب خون مارتے۔ انہیں بڑے بڑے قلعوں پر حملہ کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنی ذہانت سے ناقابلِ تسخیر قلعے فتح کیے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ لشکرِ اسلام کے دل میں یہ بات جیسے گھر کر گئی کہ جس لشکر کے سپہ سالار خالدؓ بن ولید ہوں گے وہ لشکر شکست نہیں کھا سکتا۔ خالدؓ بن ولید کا نام فتح کی دلیل اور علامت بن گیا۔ ان فتوحات کا اسلامی لشکر پر جو اثر ہوا یا وہ خالدؓ بن ولید کو جس نظر سے دیکھنے لگے تھے اس کی ایک جھلک ابن الہیثم بکائی کے مندرجہ ذیل بیان میں نظر آتی ہے:

"میرے والد بیان کرتے تھے کہ کوفہ کے وہ لوگ جو عراق کی جنگوں میں

۱۔ اس دور میں شہنشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا۔

نبرد آزمارہ چکے تھے جب معاؓویہ کو اپنے ساتھ کوئی زیادتی کرتے دیکھتے تو کہا کرتے تھے کہ آخر معاویہؓ چاہتے کیا ہیں ؟ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جنگ ذات السلاسل کے شہسوار ہیں جو عراق میں حضرت خالدؓ بن ولید کی پہلی جنگ تھی۔

وہ لوگ جنگِ ذات السلاسل سے لے کر فراض تک کی جنگوں کو فخر و شان سے بیان کرتے تھے ۔گویا ان سے قبل اور بعد کی لڑائیاں بالکل ہیچ تھیں"۔

(خالد سیف اللہ از ابو زید شبلی)





یرموک

ایک غیر معروف دریا ہے جو حوراں کی سطح مرتفع سے نکل کر پیچ و خم کھاتا ہوا ھنیا سے اردن میں گرتا ہے۔

اردن میں گرنے سے پہلے تقریباً تیس میل اوپر یرموک نصف دائرے کی صورت میں ایک چکر کاٹتا ہے۔ اس طرح اس کے درمیان ایک اتنا وسیع میدان بن جاتا ہے جس کے اندر ایک پوری فوج سما سکتی ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید جب راستے کی ہزاروں صعوبتیں اٹھا کے میدانِ یرموک میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا وہاں مسلمانوں کے چاروں لشکر جو :

ابو عبیدہؓ

شرجیلؓ بن حسنہ

یزید بن ابو سفیانؓ اور

عمروؓ بن العاص کی سرکردگی میں مدینہ سے روانہ کیے گئے تھے ، پہلے سے موجود ہیں مگر کیفیت یہ ہے کہ ان کا قیام بھی الگ الگ ہے اور ہر سپہ سالار اپنی فوج کی امامت کرتا ہے۔

خالدؓ بن ولید کے آجانے سے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری طرف رومیوں کی فوجیں مورچے کھودے پڑی تھیں۔

جس طرح مسلمانوں کو خالدؓ بن ولید کی کمک حاصل ہوئی تھی اسی طرح رومیوں کو ان کے ایک بڑے سردار باہان اور اس کے لشکر کی امداد حاصل ہوئی تھی اور ان میں بھی خوشی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔

خلیفۂ اول جنابِ ابوبکر صدیقؓ نے شام میں موجود چاروں لشکروں کو یہ پیغام بھیجدیا تھا کہ جب تک انہیں دمشق سے خالدؓ بن ولید کی کمک نہ مل جائے وہ رومیوں سے جنگ سے گریز کریں۔ چنانچہ جب خالدؓ بن ولید وہاں پہنچے تو رومیوں سے جنگ کا آغاز ہوا۔

بلاشبہ اسلامی لشکر جو الگ الگ اپنے سپہ سالاروں کے ماتحت جنگ میں شریک تھا، وہ بڑی بے جگری سے لڑا اور اس نے رومیوں کو پسپا کر کے ان کے مورچوں میں دھکیل دیا۔

مگر — دوسرے دن یہ ہوا کہ نہ رومی اپنے مورچوں سے نکل کے میدان میں آئے اور نہ ہی مسلمانوں کو ہمت ہوئی کہ وہ ان کے مورچوں پر حملہ کریں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا لشکر پانچ حصوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر حصۂ فوج اپنے سالار کی ماتحتی میں جنگ کرتا تھا۔ پورے لشکر کا کوئی ایک سپہ سالار نہ تھا۔

اس کے علاوہ رومیوں کا لشکر ڈھائی لاکھ کے قریب تھا اور اسلامی لشکر کی مجموعی تعداد صرف ۳۶ ہزار اور ایک بیان کے مطابق ۴۶ ہزار تھی۔ اس لیے مسلمان فطری طور پر رومیوں سے خائف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میدان یرموک میں دونوں لشکر ایک پہلی جھڑپ کے بعد ایک ماہ بعد تک ایکدوسرے کے خلاف مورچہ بند رہے مگر جنگ کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

خالدؓ بن ولید جو سب سے زیادہ ذہین اور تجربہ کار سالار تھے انہوں نے فوراً اندازہ کر لیا کہ الگ الگ کمانوں کے تحت دشمن سے مقابلہ میں مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ ایک تو دشمن کا لشکر ان سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک سپہ سالار کے تحت مشترکہ جنگی حکمتِ عملی کے تحت لڑتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی پانچ فوجیں الگ الگ پانچ سپہ سالاروں اور پانچ حکمت عملیوں کے تحت جنگ کرتی ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو الٹا نقصان ہوگا۔

ان کا ذاتی خیال تھا کہ جب تک اسلامی فوجوں کو ایک لشکر کی صورت میں ترتیب دے کر ان کو کسی ایک سپہ سالار کے ماتحت میدان میں نہ اتارا جائے گا اس وقت تک دشمن کے ٹڈی دل لشکر کو شکست دینا تو الگ، اس کے سامنے زیادہ دن تک ٹھہرنا بھی مشکل ہوگا۔

چنانچہ ایک دن انہوں نے اسلامی فوجوں کے چاروں سالاروں کو اپنے خیمہ پر مدعو کیا اور خدائے برتر کی حمد و ثنا کے بعد کہا:

"آج کا دن اللہ کے اہم ترین دنوں میں سے ایک ہے۔ آج کسی کے لیے فخر و مباہات، خود آرائی اور خود ستائی مناسب نہیں۔ جہاد خالص اللہ کے لیے کرو اور اپنے اعمال کو اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ بناؤ۔

یاد رکھو آج کی کامیابی ہمیشہ کی کامیابی ہے۔ ایک ایسی قوم سے جو ہر طرح سے مرتب و منظم ہے ہمارا الگ الگ لڑنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

اگر انہیں جو ہم سے دور ہیں (حضرت ابوبکرؓ) ہمارے حالات کا علم ہوتا تو وہ کبھی ہمیں اس طرح لڑنے کی اجازت نہ دیتے۔ بے شک ہمیں ان کی طرف سے کوئی حکم تو نہیں ملا لیکن ہم اور تم اسے اس طرح انجام دیں گے کہ یا یہ ہمارے خلیفہ اور ان کے خیر خواہوں کا حکم ہے۔"

حضرت خالدؓ کی تقریر سن کے تمام فوجوں کے امیروں نے یک زبان ہو کر کہا:

"آپ ہی فرمائیے۔ اس صورتِ حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

آپ نے فرمایا:

"جنابِ ابوبکرؓ نے ہمیں اس خیال سے یہاں بھیجا تھا کہ ہم یہ مہم آسانی سے سر کر لیں گے۔ اگر انہیں موجودہ حالات کا علم ہوتا تو وہ ہمیں الگ الگ نہ رکھتے بلکہ اکٹھا رکھتے۔

جن حالات سے ہم دوچار ہیں وہ پہلے کی نسبت بہت سخت اور مشرکین کے لیے زیادہ فائدہ مند ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم سب الگ الگ ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو الگ الگ لشکر پر نامزد کیا گیا ہے لیکن اگر تم اس موقع پر کسی ایک شخص کو اپنا امیر تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کر لو تو اس سے نہ صرف تمہارا فائدہ ہوگا بلکہ اس سے نہ تو تمہارے مراتب میں فرق پڑے گا اور نہ اللہ اور امیر المومنین کے نزدیک تمہارا درجہ کم ہوگا۔

ذرا دیکھو تو سہی۔ دشمن نے کتنی زبردست تیاری کر رکھی ہے۔ یاد رکھو اگر ہم نے انہیں ایک بار اُن کی خندقوں میں دھکیل دیا تو ہم ہمیشہ انہیں دھکیلتے ہی رہیں گے لیکن اگر انہوں نے ہمیں شکست دیدی تو پھر ہم کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

میری تجویز اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو باری باری امارت کا موقع ملنا چاہیے۔ اگر آج ایک امیر ہے تو کل دوسرا۔ پرسوں تیسرا، اترسوں چوتھا۔ یہاں تک کہ ہر شخص کو امیر بننے کا موقع مل جائے گا۔ آج کے دن کے لیے تم مجھے امیر بنا لو۔"

خالدؓ بن ولید کی رائے انتہائی معقول تھی۔ تمام امراء اس سے متفق ہوگئے اور پہلے روز کے لیے انہوں نے خالدؓ کو اپنا امیر نامزد کر لیا۔

ان کا خیال تھا کہ یرموک کی یہ جنگ کافی طول کھینچے گی اور ہر سالار کو امیرِ لشکر بننے کا موقع ملے گا۔

خالدؓ بن ولید نے امیرِ لشکر ہوتے ہی اپنی حکمتِ عملی اس طرح ترتیب دی جو عربوں کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔

آپ نے لشکرِ اسلام کو ۴۰ حصوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح ہر حصہ میں تقریباً ایک ہزار سے زائد لشکری تھے۔

حضرت خالدؓ نے فرمایا:

"ہمارے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کے جواب میں ہم لشکر کے چھوٹے چھوٹے بہت سے حصے کر کے میدان میں یوں پھیلائیں گے کہ دشمن کو ہماری صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہو سکے گا اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے گا کہ مسلمان اس کے مقابلے پر بہت زیادہ لشکر لائے ہیں۔"

خالدؓ بن ولید نے قلب میں اٹھارہ دستے رکھے اور ابوعبیدہؓ کو اس کا سردار مقرر کیا۔ ان دستوں میں عکرمہ بن ابی جہل اور قعقاع بن عمرو بھی شامل تھے۔

میمنہ پر آپ نے دس دستے مقرر کیے اور ان کا سردار عمرو بن عاص کو بنایا۔ ان دستوں میں شرجیل بن حسنہ بھی تھے۔

میسرہ پر بھی دس دستے مقرر کیے گئے۔ ان کی کمان یزید بن ابوسفیان کو دی گئی۔

ہر دستہ کا الگ الگ سردار بھی تھا جو میمنہ، میسرہ اور قلب کے سرداروں سے احکام حاصل کرتا تھا۔ اس طرح خالدؓ بن ولید نے لشکر کے میمنہ، میسرہ اور قلب پر ایسے سردار مقرر کیے جو شجاعت اور دلیری میں اپنی مثال آپ تھے۔ مثلاً:

قعقاع بن عمرو۔ عکرمہ بن ابوجہل۔ عیاض بن غنم۔ ہاشم بن عتبہ اور عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید

حضرت خالدؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔

لشکر کی اس ترتیب کے علاوہ جناب خالدؓ نے ایک ہراول دستہ بھی بنایا جس کے سردار قباث بن اشیم مقرر ہوئے۔

قاضی کی خدمت حضرت ابوالدرداؓ کے سپرد ہوئی۔ قاری حضرت مقداد مقرر ہوئے جو سورہ انفعال (جس میں جہاد کا ذکر ہے) پڑھ کے لشکریوں کو سناتے تھے۔ سامان کے حفاظتی دستے کی سرداری عبداللہ بن مسعودؓ کو عطا ہوئی۔

خالدؓ بن ولید کے ان انتظامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے لشکرِ اسلام میں جوش و خروش پیدا کرنے کے علاوہ اس کی ترتیب اس انداز سے کی کہ دشمن کے دل میں مسلمانوں کا خوف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے جاسوسوں نے واپس جا کر بتایا کہ مسلمان لشکر کی تعداد لاکھوں سے اوپر ہے۔

دونوں طرف صف آرائی ہوئی تو طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی اور موت اپنے پر پھیلائے میدانِ یرموک پر چھا گئی۔

جنابِ خالدؓ گھوڑا بڑھا کر قلبِ لشکر میں پہنچے۔ ابوعبیدہ بن جراح اس حصہ کے سالار تھے اور ان کی معیت میں قعقاع بن عمرو اور عکرمہ بن ابوجہل جنگ کے لیے تیار اور حکم کے منتظر تھے۔

جنابِ خالدؓ نے ابوعبیدہؓ سے کہا:

"آپ قعقاع اور عکرمہ کو دشمن پر بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیجیے۔"

جنابِ ابوعبیدہؓ نے حملے کا حکم دیا۔ قعقاع اور عکرمہ نے رجز پڑھتے ہوئے گھوڑوں کو ایڑ دی اور لشکرِ اسلام کا قلب تیزی سے دشمن پر جا پڑا۔

جنگ کی آگ بھڑکی اور پورے میدان میں پھیل گئی۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور نیزوں اور تلواروں کی جھنکار کے سوا کوئی آواز کان پڑے سنائی نہ دیتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ رومی لشکر کے قلب کا سردار "جرجہ" گھوڑا بڑھا کر اپنے لشکر سے نکلا اور دونوں لشکروں کے درمیان آ کر پکارا:

"خالدؓ بن ولید میرے پاس آئیں۔"

خالدؓ بن ولید قلبِ فوج میں موجود تھے۔ انہوں نے ابوعبیدہؓ کو لشکر سنبھالنے کا اشارہ کیا اور خود گھوڑا بڑھا کر جرجہ کی طرف چلے۔ پھر وہ اس کے اتنا قریب ہو گئے کہ گھوڑوں کی تھوتیوں سے تھوتیاں مل گئیں۔

خالدؓ بن ولید نے دریافت کیا:

"مجھے مبارزت کی دعوت دینے والا تو کون ہے؟"

"میرا نام جرجہ ہے۔"

اس نے متانت سے جواب دیا:

"میں رومی قلبِ لشکر کا سردار ہوں۔"

جنابِ خالدؓ نے کہا:

"میں تمہیں پہلے حملے کی اجازت دیتا ہوں تاکہ تمہیں یہ ارمان نہ رہ جائے کہ تم مجھ پر حملہ نہ کر سکے۔"

"اے خالدؓ!"

جرجہ نے اسی سنجیدگی سے کہا:

"میں تم سے جنگ کرنے سے پہلے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم ان کے جوابات صحیح صحیح دو۔"

"اے جرجہ!"

جنابِ خالدؓ نے جواب میں کہا:

"خالدؓ اپنے دشمن کے مقابلہ پر جھوٹ نہیں بولا کرتا۔"

جرجہ نے کہا:

"میں ایک شریف آدمی ہوں اور تمہیں کریم النفس خیال کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے دھوکہ نہ دو گے۔"

"میری طرف سے مطمئن رہو جرجہ۔"

حضرت خالدؓ بولے:

"مگر فوراً سوال کرو۔ کیونکہ خطرہ ہے لشکر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔"

جرجہ نے سوال کیا:

"کیا یہ درست ہے کہ خدا نے تمہارے نبیؐ پر آسمان سے ایک تلوار اتاری تھی اور وہ تلوار انہوںؐ نے تمہیں عطا کی جس کی برکت سے جس فوج میں تم شامل ہوتے ہو وہ فتح یاب ہوتی ہے؟"

"نہیں۔"

حضرت خالدؓ نے فوراً انکار کیا:

"یہ درست نہیں ہے۔"

جرجہ بولا:

"پھر تمہیں سیف اللہ کیوں کہا جاتا ہے؟"

"سنو جرجہ!"

حضرت خالدؓ نے جواب دیا:

"اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم میں ایک نبیؐ پیدا کیا۔ کچھ لوگوں نے انہیں تسلیم کیا۔ کچھ نے انکار کیا۔ انکار کرنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ میں نے انؐ سے جنگ کی۔ پھر خدا نے ہمارے دلوں پر قبضہ کیا اور ہم سب نے انہیں نبیؐ برحق تسلیم کر لیا۔

میرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے کہا:

"اے خالدؓ! تم اللہ کی تلوار ہو جس کو اس نے مشرکین پر مسلط کیا۔ جب سے میرا لقب سیف اللہ ہو گیا۔ اسی وجہ سے میں مشرکوں کے لیے سخت ترین مسلمان ہوں۔"

"بے شک تم ٹھیک کہتے ہو۔"

رومی سردار نے اعتراف کیا پھر پوچھا:

"اچھا یہ بتاؤ تم مجھے کن باتوں کی دعوت دیتے ہو؟"

حضرت خالدؓ نے فرمایا:

"میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم اقرار کرو کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

پھر یہ اقرار کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ لائے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے۔"

"اگر کوئی شخص ان باتوں کو تسلیم نہ کرے تو؟" جرجہ نے سوال کیا۔

حضرت خالدؓ نے جواب دیا:

"اس صورت میں ہم اس سے کہیں گے کہ وہ جزیہ ادا کرے اور ہم اس کی جان و مال کے محافظ ہوں گے۔"

جرجہ نے پوچھا:

"اگر وہ جزیہ بھی ادا نہ کرنا چاہے تو پھر؟"

"تو پھر ہم اسے لڑائی کی دعوت دیں گے اور اس سے جنگ کریں گے۔" حضرت خالدؓ نے صاف الفاظ میں کہا۔

جرجہ نے ایک اور سوال کیا:

"اگر میں آج مسلمان ہو جاؤں تو میرا اسلام میں کیا مرتبہ ہوگا اور میرے پچھلے گناہوں کا کیا بنے گا؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی کب مسلمان ہوا؟"

خالدؓ بن ولید نے جواب دیا:

"مسلمان ہونے والوں کو برابر کا ثواب حاصل ہوگا اور اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔"

"بے شک اسلام سچا مذہب ہے"۔

جرجہ نے اقبال کیا اور کہا:

"تم مجھے مسلمان کر لو خالدؓ!"

حضرت خالدؓ اسے اپنے ساتھ خیمے میں لے گئے اور پھر غسل دے کر دو رکعت نماز پڑھائی۔

رومی لشکر نے جرجہ کو خالدؓ بن ولید کے پاس دیکھا تو انہیں گمان ہوا کہ جرجہ نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے اس لیے انہوں نے مسلمانوں پر بڑا زوردار حملہ کیا مگر جب جرجہ، حضرت خالدؓ کے ساتھ گھوڑے سے گھوڑا ملائے میدانِ جنگ میں واپس آئے تو رومیوں کی آنکھیں کھلیں۔

جرجہ، جو اب مسلمان ہو چکا تھا، اس نے حضرت خالدؓ کے شانہ بشانہ دادِ شجاعت دی اور آخر لڑتے لڑتے شہادت حاصل کی۔ اس کی قسمت میں صرف دو رکعت نماز تھی مگر پھر بھی اسے خدا نے شہادت کے درجہ پر فائز کیا۔

جنگ کی شدت کی وجہ سے مسلمان باقاعدہ نماز ادا نہ کر سکے اور انہوں نے ظہر اور مغرب کی نمازیں میدانِ جنگ ہی میں اشاروں میں ادا کیں۔

مسلمانوں کے حملے کی شدت کی وجہ سے رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ خالدؓ بن ولید رومیوں کے قلب میں گھس گئے۔

یہ میدان لڑنے کے لیے تو بہت وسیع تھا مگر بھاگنے والوں کے لیے بہت تنگ تھا۔ خالدؓ بن ولید لڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو رومیوں کے گھوڑوں کو بھاگنے کے لیے راستہ مل گیا اور وہ بے تحاشا صحرا کی طرف بھاگ نکلے۔

مسلمانوں نے انہیں بھاگتے دیکھا تو ان کے راستے میں حائل نہ ہوئے۔ بھگوڑے رومیوں کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑے ہوئے۔

رومی سوار تو فرار ہو گئے مگر ان کے پیدل سپاہ کو راستہ نہ ملا۔ اب خالدؓ بن ولید ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا صفایا کرنا شروع کیا۔

رومی بھاگ کر اپنی خندقوں میں گھس گئے۔ حضرت خالدؓ وہاں بھی پہنچ گئے تو انہوں نے واقوصہ کی گھاٹی کا رخ کیا۔

اکثر رومیوں نے میدان میں ثابت قدم رہنے کے لیے اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ دھڑا دھڑ اس وادی میں گرنے لگے۔ چونکہ پیروں میں بیڑیاں تھیں اس لیے ایک گرتا تو اپنے ساتھ دس کو اور لے جاتا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ لوگ کھڈ کو دیکھ نہ سکے۔ جو رومی بھاگ کر ادھر آتے انہیں معلوم نہ ہوتا کہ آگے کیا ہے اور وہ بھی اس کھڈ میں جا گرتے۔

طبری کی ایک روایت کے مطابق واقوصہ کی گھاٹی میں ایک لاکھ بیس ہزار رومی گر کر ختم ہوئے۔ ان میں اسی ہزار وہ تھے جنہوں نے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اس لیے اس جنگ کو جنگِ واقوصہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس تعداد میں میدانِ جنگ میں مارے جانے والے پیدل اور سوار رومیوں کی تعداد شامل نہیں۔

"جنگِ یرموک" یا جنگِ واقوصہ تمام دن اور رات کے بیشتر حصے تک جاری رہی۔ حضرت خالدؓ طلوعِ آفتاب سے قبل رومی سپہ سالار کے خیمے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جنگ حضرت عمرؓ بن خطاب کے

عہد کی پہلی جنگ تھی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بیس دن بعد لڑی گئی تھی۔

میدانِ جنگ میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ مدینہ منورہ میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہو چکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ پر ۶۔ جمادی الثانی ۱۳ھ میں بخار کا حملہ ہوا۔ اور پندرہ دن بیمار رہ کر آپ نے ۲۱۔ جمادی الثانی ۱۳ھ بمطابق ۲۲۔ اگست ۶۳۴ء میں انتقال فرمایا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اس قدر شدید بیمار ہوئے تھے کہ مسجدِ نبویؐ میں نماز پڑھانے نہ جا سکتے تھے۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ آخری وقت آ گیا ہے تو اکابر صحابہؓ کو بلا کر اپنے جانشین کے لیے مشورہ کیا اور اپنی طرف سے جنابِ عمرؓ کا نام پیش کیا۔

اس پر عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا:

"عمرؓ کی اہلیت میں تو شبہ نہیں لیکن وہ کسی قدر سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔"

ان کے علاوہ حضرت طلحہؓ اور دیگر صحابہؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی سختی اور درشتی کی شکایت کی بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ تقریباً تمام صحابہؓ حضرت عمرؓ کی سخت گیری کے شاکی تھے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"میرے خیال میں عمر کا ظاہر باطن سے اچھا ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"ان پر بارِ خلافت پڑے گا تو خود بخود نرم ہو جائیں گے۔"

اس وقت ایک صحابیؓ نے عرض کیا:

"آپ عمرؓ کی سختی سے واقف ہونے کے باوجود ان کو جانشین نامزد کر رہے ہیں۔ ذرا سوچ لیجیے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور جا رہے ہیں۔ وہاں کیا جواب دیں گے؟"

"میں عرض کروں گا۔"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں میں سے اس کو منتخب کیا جو ان میں سب سے بہتر ہے۔"

اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کرامؓ کی مخالفت کے باوجود حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور حضرت عثمانؓ سے وصیت نامہ لکھوایا۔

جنگِ یرموک اگرچہ خلیفہ دوم جنابِ عمرؓ کے زمانے میں لڑی گئی مگر اس کا تمام تر اعزاز خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے عہد کو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یرموک کا علاقہ ملک شام میں ہے۔ جب شام میں رومی لشکر جمع ہوا اور اس کی خبر دربارِ خلافت کو ہوئی تو جناب ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو جو اس وقت ملک عراق میں فتوحات حاصل کر رہے تھے، حکم دیا کہ وہ فوراً شام پہنچیں اور وہاں اسلامی فوجوں کی مدد کریں۔

چنانچہ حضرت خالدؓ نے عراق میں مثنیٰ بن حارثہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور نصف فوج ان کے حوالے کر کے شام روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ واقعات پیش آئے جن کا ذکر پچھلے صفحات میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔

لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے دانستہ طور پر جنگِ یرموک کو خلیفۂ دوم کے عہد میں درج کر کے اس کا اعزاز حضرت عمرؓ کو دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض تواریخ میں تو اس جنگ کے واقعات پر بالکل ہی پردہ ڈال دیا گیا ہے حالانکہ جنگِ یرموک تاریخِ اسلام اور اسلام کے عظیم الشان اور ناقابلِ شکست جرنیل خالدؓ بن ولید سیف اللہ کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ چالیس ہزار مسلمانوں کا ڈھائی لاکھ مسلح رومیوں کے لشکر سے ٹکرانا اور انہیں شکست دینا، خالدؓ بن ولید کا ایک عظیم کارنامہ ہے مگر بعض مؤرخین نے ذاتی اور نامعلوم مفاد کے تحت اس کارنامے پر سیاہی پھیرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اگر یہ جنگ خالدؓ بن ولید کے بجائے کسی اور کی سپہ سالاری میں لڑی جاتی تو (میرے منہ میں خاک) مسلمان شاید کامیاب نہ ہو پاتے کیونکہ مسلمانوں کے چار سالار جو اس وقت وہاں موجود تھے وہ رومیوں کا لشکر دیکھ کر اس قدر خائف تھے کہ فوراً دربارِ خلافت سے کمک طلب کی تھی۔

پھر جب محاذِ جنگ سے بھیجے ہوئے قاصد نے دربارِ خلافت میں مدد کی درخواست پیش کی تو

خلیفۂ اول جناب ابوبکرؓ پکار اٹھے:

"مسلمانوں کی مدد کے لیے خالدؓ بن ولید جائیں گے۔ خدا کی قسم! خالدؓ، رومیوں کے دماغ سے شیطانی وسوسے نکال دیں گے"۔

کس قدر اعتماد تھا جنابِ ابوبکرؓ کو سیف اللہ پر۔

ان کا یہ اعتماد کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خالدؓ کو سیف اللہ کا خطاب یونہی تو نہیں دے دیا تھا۔ آگے کے حالات یہ بتائیں گے کہ اگر خالدؓ وہاں نہ پہنچتے تو اس جنگ کا انجام کیا ہوتا!

رومیوں کے تمام بڑے بڑے سردار اس عبرت ناک شکست کو برداشت نہ کر سکے اور خود کو ذلت سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی ٹوپیوں سے اپنے چہرے چھپا لیے اور میدانِ جنگ کے ایک طرف ہو کے بیٹھ گئے۔

پھر انہوں نے بیک وقت بآوازِ بلند کہا:

"اگر ہم حسرت کا دن دیکھنے اور عیسائیت کی حمایت کرنے کے قابل نہیں تو ہم اس ذلت کے دن کو بھی نہیں دیکھنا چاہتے"۔

چنانچہ یہ تمام سردار اسی حالت میں قتل کر دیے گئے۔

کہتے ہیں کہ بعض عرب قبائل میں یہ روایت آج بھی موجود ہے کہ جب وہ کسی سے شکست کھاتے ہیں تو منہ چھپا کر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ دشمن انہیں اسی حالت میں قتل کر دے۔

جنگِ یرموک میں مسلمانوں نے جس بہادری، جوش اور ولولہ سے رومیوں کا مقابلہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

عکرمہؓ بن ابوجہل نے جب دیکھا کہ رومیوں کا دباؤ بڑھتا ہی جاتا ہے تو انہوں نے پُرجوش لہجے میں دشمنوں کی طرف منہ کر کے کہا:

"میں رسول اللہؐ کے ساتھ ہر میدان میں لڑتا رہا ہوں۔ کیا آج کی لڑائی میں تم سے ڈر کر بھاگ جاؤں گا۔ خدا کی قسم ایسا کبھی نہ ہوگا"۔

یہ کہہ کر انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کیا:

"مسلمانو آؤ۔ کون میرے ساتھ موت کے لیے بیعت کرتا ہے"۔

عکرمہؓ کی یہ پکار سن کر حارث بن ہشام، ضرار بن الازور (یہ مشہور مجاہدہ حضرت خولہؓ بنت ازور کے سگے بھائی تھے) اور چار سو کے قریب شہسواروں نے عکرمہؓ کے ہاتھ پر موت کے لیے بیعت کی۔ یہ سب خالدؓ بن ولید کے خیمہ کے سامنے اس بے جگری سے لڑے کہ ان کے خون سے زمین لالہ زار ہو گئی۔

ان میں سے اکثر نے جامِ شہادت نوش کیا اور زخمی ہونے سے تو کوئی بھی نہ بچا۔

عکرمہؓ اور ان کے بیٹے عمروؓ بن عکرمہؓ شدید زخمی حالت میں حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس لائے گئے۔ جنابِ خالدؓ نے عکرمہؓ کا سر اپنی ران پر اور عمروؓ بن عکرمہ کا سر اپنی پنڈلی پر رکھ لیا۔ پھر دیر تک حضرت خالدؓ دونوں بہادر باپ بیٹے کے چہروں سے خون پونچھتے اور حلق میں پانی ٹپکاتے رہے۔

اس جنگ میں صرف شہسواروں اور بہادر پیدلوں ہی نے اپنی شجاعت کے کارنامے نہیں دکھائے بلکہ خواتینِ اسلام بھی اس جنگ میں کمالِ سرفروشی سے زخمیوں کو پانی پلاتی اور ان کی مرہم پٹی کرتی رہیں۔

بعض خواتین جن میں حضرت خولہؓ بنت الازور کا نام سرِفہرست ہے، نے باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا اور یہ خواتین اپنے مردوں کے دلوں میں جوشیلے الفاظ کے ساتھ غیرت اور حمیت کے جذبات بھڑکاتی رہی تھیں۔

جنگِ یرموک میں مسلمان شہدا کی تعداد تین ہزار تھی۔ ان میں صحابہ کرامؓ ایک ہزار تھے جن میں بدری صحابہؓ ایک سو تھے۔

اس جنگ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس جنگ کے دوران ہی مدینہ منورہ سے حضرت عمرؓ کا قاصد دو خبریں لے کر میدانِ یرموک میں پہنچا تھا:

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کی خبر

۲۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی اور ان کی جگہ ابوعبیدہؓ کی تقرری کا حکم

جب لوگوں نے قاصد کو دیکھا تو اس سے مدینہ کے حالات پوچھنا شروع کر دیے۔ قاصد عقلمند تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر کہا:

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مدینہ میں ہر طرح سے خیریت ہے اور تمہاری امداد کے لیے مدینہ سے

مزید فوجیں آ رہی ہیں"۔

لوگوں کو مطمئن کر کے قاصد جنابِ خالدؓ کو تلاش کرتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور انہیں مدینہ کے حالات، حضرت ابو بکرؓ کی وفات، جنابِ عمرؓ کا بحیثیت خلیفۂ دوم تقرر اور خلیفۂ دوم ہی کا خالدؓ بن ولید کو سپہ سالاری سے معزول کر کے ان کی جگہ جناب ابو عبیدہؓ کے تقرر کا تحریری حکم نامہ جنابِ خالدؓ کو دیا۔

پھر اس نے جنابِ خالدؓ سے کہا:

"میں نے لشکر والوں کو آپ کی معزولی اور حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیونکہ اس سے لشکرِ اسلام پر بُرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں"۔

جنابِ خالدؓ نے قاصد کی دور اندیشی کی بہت تعریف کی۔ کیونکہ ان دونوں خبروں کے اعلان سے لشکر بد دلی کا شکار ہو سکتا تھا۔

انہوں نے حضرت عمرؓ کا حکمنامہ قاصد سے لے کر اپنے ترکش میں ڈال لیا۔ یہ حکمنامہ ان کے ترکش میں اس وقت تک محفوظ رہا جب تک جنگِ یرموک ختم نہ ہو گئی اور جب جنابِ خالدؓ نے اپنی جنگی حکمت عملی سے جیت نہ لیا۔





جنگ کے خاتمہ اور مسلمانوں کی کامیابی کے بعد جنابِ خالدؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو بلوایا اور حضرت ابو بکرؓ کی وفات اور انکی جگہ حضرت عمرؓ کی تقرری سے آگاہ کیا۔ پھر وہ حکمنامہ ان کے حوالے کیا جس میں حضرت عمرؓ نے جنابِ خالدؓ بن ولید کو بحیثیت سپہ سالارِ لشکر معزول کر کے ابو عبیدہؓ کو ان کی جگہ مقرر کیا تھا۔

شاباش ہے حضرت خالدؓ بن ولید پر کہ جنہوں نے بغیر کسی احتجاج کے اپنی معزولی تسلیم کر لی اور جناب ابو عبیدہؓ کو یرموک کے میدان اور اپنے عراق کے لشکر کی سالاری سونپ کر ان کی ماتحتی قبول کر لی۔

تاریخِ مشرق میں جنگِ یرموک ایک فیصلہ کن معرکے کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ اس کامیابی سے نہ صرف رومی ایک وسیع خطے سے محروم ہو گئے بلکہ بلاد بنو اصفر یعنی شام میں اسلامی فتوحات کا در وا ہو گیا۔

فتح یرموک پر کئی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں صرف قعقاع بن عمرو کے چند اشعار کا مفہوم درج کیا جا رہا ہے۔

وہ کہتے ہیں:

"تم نے دیکھا کہ ہم جنگِ یرموک میں اسی طرح کامیاب ہوئے جیسے
عراق میں فتح یاب ہوئے تھے۔

ہم نے رومیوں کو بے دھڑک قتل کیا اور ان کے لشکر کو واقوصہ میں
پاش پاش کر کے رکھ دیا۔
ان کی تلواریں ان کے کام نہ آ سکیں۔
وہ واقوصہ کی گھاٹی میں گر کر ختم ہو گئے۔
ان کا انجام حد درجہ عبرت ناک ہوا۔
شکست و نامرادی کے جو کڑوے گھونٹ انہوں نے پیے وہ ہر کس و
ناکس کو پینا دشوار رہے!"

اس جنگ میں جو کچھ پیش آیا وہ فنونِ جنگ اور اعلیٰ قیادت کا ایک بہترین مظاہرہ تھا۔
جس وقت خالدؓ بن ولید یرموک پہنچے تو:

مسلمان اپنے سپہ سالاروں کی ماتحتی میں رومیوں سے الگ الگ جنگ لڑ رہے تھے۔
باہمی رابطہ اور یک جہتی بالکل ناپید تھی۔
دشمن کے لشکر کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔
قیصر ہرقل نے اپنا لشکر اس لیے بھیجا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ایسی شکستِ فاش دے کہ وہ پھر کبھی شام کا رخ نہ کریں۔

ان حالات میں اگر مسلمان پراگندگی اور انتشار کا شکار تھے تو ان کی کامیابی ناممکن تھی۔ اس موقع پر حضرت خالدؓ نے اپنی استعداد اور جنگی مہارت کا جو مظاہرہ کیا اس نے مسلمانوں کو تباہی سے بچا کر ان کے لیے فتح و ظفر کے دروازے کھول دیے۔

حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کو جمع کر کے اپنی چند جملوں کی تقریر کے ذریعے ان کی کمزوریوں کو ان پر ظاہر کیا اور بتایا کہ:

"اگر تم الگ الگ جنگ کرتے رہے تو تباہی تمہارا مقدر بن جائے گی
اس وقت بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ تمام فوجوں کو ایک لشکر میں
ضم کیا جائے اور ان پر صرف ایک سپہ سالار مقرر کر کے کمان اس کے
سپرد کر دی جائے۔"

خدا کا شکر کہ باقی چاروں سالاروں نے خالدؓ کی بات توجہ سے سنی اور ان کے کہنے پر تمام فوجوں کو ایک لشکر بنا کر خالدؓ بن ولید کو اپنا سپہ سالار چنا۔

پھر حضرت خالدؓ نے اپنی دور اندیشی اور تجربہ کے زور پر لشکرِ اسلام کو اس طرح ۳۸ دستوں میں تقسیم کیا کہ سب لوگ حیران رہ گئے۔

عربوں کے لیے یہ انداز اور تجربہ بالکل نیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ۴۰ ہزار کا لشکر ایک لاکھ ۴۰ ہزار نظر آنے لگا۔ اس کا رومیوں پر ایسا زبردست رعب پڑا کہ وہ مسلمانوں کا جم کر مقابلہ نہ کر سکے اور ایک دن اور ایک رات کی جنگ کے بعد میدان چھوڑ بھاگے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی اس حکمت عملی نے نہ صرف مسلمانوں کو میدانِ یرموک میں شاندار فتح دلوائی تھی بلکہ اس حکمتِ عملی کو چودہ سو سال بعد پہلی جنگِ عظیم میں اتحادیوں نے بھی اختیار کیا تھا جب جرمنی کے ساتھ ان کی جنگ شروع ہوئی تو اتحادیوں کی فوجیں اپنے اپنے کمانڈروں کے ماتحت جرمنی سے لڑ رہی تھیں مگر جب جرمنوں نے پیش قدمی شروع کی تو اتحادیوں کو مجبور ہو کر جنابِ خالدؓ بن ولید کا فوجوں کی یک جہتی کا کامیاب طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تمام فوجوں کو ملا کر بلا تفریق مذہب و ملت تمام اتحادی افواج کو ایک سپریم کمانڈ کے ماتحت کر دیا جس کے نتیجے میں انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔

دوسری جنگِ عظیم میں بھی خالدؓ بن ولید کی یہی حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔ اس موجودہ زمانے میں بھی نیٹو یعنی شمالی اوقیانوس کے معاہدہ کے تحت یورپ کی افواج کو ایک جگہ کیا گیا ہے اور خالدؓ کا اصولِ جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود دونوں حالتوں کا بڑا فرق ہے۔

خالدؓ بن ولید نے چودہ سو سال پہلے سپریم کمانڈ کا جو اصول وضع کیا وہ خالص ان کے دماغ کی سوچ کا نتیجہ تھا مگر موجودہ زمانے میں اور دوسری جنگِ عظیم میں اس اصول کو درجنوں کمانڈروں نے دو سال کے مسلسل غور و فکر کے بعد اپنایا تھا۔

اس کے علاوہ خالدؓ بن ولید نے کسی جنگی سکول میں تعلیم نہ پائی تھی جبکہ آج کے کمانڈر دنیا کے بہترین جنگی کالجوں، یونیورسٹیوں اور اداروں کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ جناب خالدؓ نے اُس زمانے میں یہ جنگی اصول اختیار کیا تھا جب جنگی اصول بالکل ابتدائی حالت میں تھے جبکہ اب جنگی اصول اور طور طریقے انتہائی عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام نے چودہ سو سال پہلے خالدؓ بن ولید کی صورت میں ایک ایسا نادرِ روزگار جرنیل پیدا کیا تھا جس کا جواب تمام عالم اسلام آج تک پیدا نہ کر سکا۔

خالدؓ بن ولید دنیا کے واحد جرنیل ہیں جنہوں نے کسی میدان میں شکست کا منہ نہیں دیکھا جبکہ دنیا کا بڑے سے بڑا جرنیل اپنی زندگی میں ایک دو بار ضرور ناکام رہا ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی جرأت اور حوصلے کی ایک مثال اور ہمیں جنگِ یرموک میں دکھائی دیتی ہے۔

روایت ہے کہ جنگ کے دوران ایک مسلمان نے رومی لشکر کو دیکھ کر کہا:

"اوہو۔ رومی کتنے زیادہ ہیں اور مسلمان کتنے کم"۔

حضرت خالدؓ نے فوراً ہی جواب میں کہا:

"اوہو۔ مسلمان کتنے زیادہ ہیں اور رومی کتنے کم۔ یاد رکھو فوجیں اللہ کی مدد کی بدولت زیادہ ہوتی ہیں اور ناکامی اور بزدلی کی وجہ سے کم ہوتی ہیں۔ فتح و شکست کا دارومدار آدمیوں کی کثرت اور قلت پر نہیں ہوتا"۔

اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا:

"کاش میرے گھوڑے "اشقر" کا پاؤں اچھا ہوتا۔ پھر چاہے دشمن تعداد میں کتنے گنا بھی زیادہ ہوتے میں ان کی مطلق پروا نہ کرتا"۔

یہ اطمینان بھرے الفاظ ایک ایسا ہی شخص ادا کر سکتا ہے جس کا نصرتِ خداوندی پر پختہ ایمان ہو۔

اس کے علاوہ خالدؓ بن ولید ہمیں جگہ جگہ ایک سچے مبلغِ اسلام بھی نظر آتے ہیں۔ جس وقت

رومی سردار جرجہ نے آپ کے پاس آ کر آپ کے خطاب "سیف اللہ" کی تشریح چاہی تو آپ نے کوئی جنگی چال چلنے یا اسے قتل کرنے کے بجائے نہایت سیدھے اور سچے انداز میں "سیف اللہ" کی تشریح کی۔ جرجہ آپ کی سچائی سے اس قدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔

ایک تو خالدؓ نے اسے مسلمان کر کے ثواب کمایا۔

دوسرے اس کے دل میں اسلام کی ایسی چمک اور جہاد کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ مسلمانوں کی طرف سے اپنے ہم وطنوں اور بھائیوں سے لڑا اور شہادت پائی۔

جنگِ یرموک میں جہاد، قربانی اور تحمل کی جو مثال حضرت خالدؓ بن ولید نے پیش کی اس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔

غور فرمائیے۔ رومی لشکر سامنے ہے۔ جنگ زوروں پر ہے۔ خالدؓ بن ولید اپنی جنگی حکمتِ عملی کے باعث جنگ جیتنے کے بالکل قریب ہیں کہ انہیں خلیفۂ دوم کا حکم نامہ پہنچتا ہے کہ وہ معزول کر دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے کو سرداری دیدی گئی ہے۔

مگر، واہ رے خالدؓ!

ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔ معزولی کا حکم نامہ ترکش میں رکھ لیتے ہیں۔ خود پر اس قدر قابو ہے کہ کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہو پاتی جس سے لوگ حقیقتِ حال سے واقف ہو سکیں۔ کیونکہ اگر لوگوں کو اور خاص کر ان ساتھیوں کو جنہیں وہ عراق سے لے کر آئے ہیں، یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے قائد، ان کے سردار اور ان کے محبوب ساتھی کو سرداری کے مرتبے سے معزول کر کے سپاہی بنا دیا گیا ہے تو اس جیتی ہوئی جنگ کا نقشہ یقیناً بدل جاتا۔

یہ صرف خالدؓ ہی کی ہستی تھی جس نے معزولی کی خبر پڑھ کر بھی خود پر قابو رکھا اور اس خبر کو سینے کی گہرائیوں میں اس وقت تک دفن رکھا جب تک دشمن کو شکست نہ دیدی۔ حالانکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اس فتح کا سہرا اب ان کے سر بندھنے کے بجائے اس شخص کے سر سجے گا جسے وہ اپنا عہدہ سپرد کریں گے۔

یرموک میں مسلمانوں نے عظیم الشان فتح حاصل کی۔ لشکرِ اسلام کا ہر سپاہی اور ہر سوار فتح کے نشے میں چور ہو رہا تھا۔

اس صورتِ حال میں جنابِ خالدؓ جو اس وقت تمام افواجِ اسلام کے سپہ سالار تھے، حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پہنچتے ہیں۔ انہیں خلیفۂ ثانی کا خط دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں:

نئے خلیفہ عمرؓ بن خطاب نے مجھے معزول کر کے میری جگہ آپ کو نامزد کیا ہے۔ اس وقت سے میں آپ کا ماتحت اور صرف سپاہی ہوں"۔

آپ سوچیے اور فیصلہ کیجیے کہ اگر اس زمانے میں کسی کمانڈر کو میدانِ جنگ میں معزول کر دیا جائے تو کیا وہ خلوصِ دل سے جنگ جاری رکھ سکے گا؟

کیا اس کے دل میں اپنے ملک و قوم یا افسرانِ بالا کے لیے کوئی اچھی جگہ باقی رہ سکتی ہے؟

میرا خیال ہے آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ ایسے حالات میں وہ باغی ہو کر خود اپنے ملک کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

مگر —

خالدؓ کا کردار یہ ہے کہ انہوں نے خلیفہ کے حکم نامے کو اس وقت تک پوشیدہ رکھا جب تک انہوں نے رومیوں کو شرمناک شکست سے دوچار نہ کر دیا۔

ان کے اس خلوص کا مؤرخینِ اسلام نے یہ صلہ دیا کہ جنگِ یرموک کو خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے دور سے نکال کر خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے دور میں ڈال دیا بلکہ اس کی تاریخ بھی بدل دی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں تاریخی کہانیاں اور ناول لکھتا ہوں اور تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اس لیے کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اموی اور عباسی خلافتوں کے دور میں جو اسلامی تاریخ کی توڑ مروڑ کی گئی ہے اس کا تو خیر ذکر ہی عبث ہے مگر موجودہ دور میں جو طلبا کے لیے تاریخیں ترتیب دی گئی ہیں ان میں بھی دانستہ طور پر تاریخی حقیقتوں سے انحراف کیا گیا ہے۔

میرے سامنے لاہور کے ایک معروف کالج کے شعبۂ تاریخ کے صدر کی مرتب کردہ تاریخِ اسلام موجود ہے۔ اس تاریخ میں جنگِ یرموک کو حضرت ابوبکرؓ کے دور سے نکال کر حضرت عمرؓ کے دور میں ڈالا گیا ہے جبکہ جنگِ یرموک جس کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کو عراق سے شام بھیجا تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں شروع ہوئی تھی اور جنگ کے دوران ہی حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا اور حضرت عمرؓ خلیفہ مقرر ہوئے تھے۔

یہ واقعہ سنہ ۱۳ھ بمطابق سنہ ۶۳۴ء کا ہے مگر صدر شعبۂ تاریخ نے اس واقعہ کو عہدِ عمرؓ میں سنہ ۱۵ھ بمطابق سنہ ۶۳۶ء بیان کیا ہے اور یہ نوٹ لگایا ہے کہ:

"جنگِ یرموک بھی معرکۂ قادسیہ کی طرح ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس نے فیصلہ کر دیا کہ شام و فلسطین کے مالک اب رومی نہیں، مسلمان ہیں"۔

آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ جنگِ یرموک سنہ ۱۳ھ / سنہ ۶۳۴ء میں ہوئی تھی اور جنگِ قادسیہ سنہ ۱۴ھ / سنہ ۶۳۵ء یعنی اس کے ایک سال بعد ہوئی۔

اس سے مؤرخ کا منشا اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جنگِ یرموک کا اعزاز خلیفۂ اول کے بجائے خلیفۂ دوم کو دینا چاہتا ہے۔ مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ کہوں کہ بعض مورخین کے اس رویے کی وجہ سے مسلمانوں میں روز بروز فرقوں میں اضافہ ہوا اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تاریخِ انگلستان میں یہ بات بڑے فخر سے بیان کی گئی ہے کہ جب چرچل کو وزارتِ بحریہ سے الگ کر دیا گیا تو وہ میدانِ جنگ میں بحیثیت ایک سپاہی کے لڑنے کے لیے چلا گیا۔

انگلستان والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ چرچل نے کوئی نئی مثال قائم نہیں کی بلکہ اس کی مثال تو چودہ سو سال پہلے اسلام کے عظیم سپہ سالار خالدؓ بن ولید نے قائم کی تھی۔ انہیں حضرت عمرؓ نے جنگِ یرموک کے دوران معزول کر دیا مگر انہوں نے احتجاج کرنے کے بجائے ابوعبیدہؓ کو منصب سپرد کر کے ایک سپاہی کی حیثیت سے لشکرِ اسلام میں شامل رہ کر جنگ جاری رکھی۔





جنگِ یرموک کا اختتام تین باتوں پر ہوا:

۱۔ رومیوں کی شکست
۲۔ حضرت خالدؓ کی معزولی
۳۔ حضرت ابوعبیدہؓ کی امارت پر تقرری

جناب ابوعبیدہؓ نے بشیر بن کعب حمیری کو یرموک میں اپنا نائب بنایا اور خود لشکر لے کر بھاگنے والے رومیوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔

ابوعبیدہؓ تعاقب کرتے ہوئے صفر پہنچے جہاں انہیں معلوم ہوا کہ بھاگنے والے رومی فحل کے قلعہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ اطلاع بھی ملی کہ اہلِ دمشق کے لیے حمص سے کمک آ رہی ہے۔

اس تازہ صورتحال میں وہ فحل میں قیام پذیر ہوئے اور دربارِ خلافت کو حالات لکھتے ہوئے یہ مشورہ مانگا کہ انہیں فحل یا دمشق، کس جگہ سے کاروائی کرنی چاہیے۔

دربارِ خلافت سے ابوعبیدہؓ کو حکم ملا کہ:

"اپنی کاروائی کا آغاز دمشق سے کرو کیونکہ دمشق، ملک شام کا مضبوط قلعہ اور دارالسلطنت ہے۔ نیز یہ کہ فحل پر بھی ایک دستہ متعین کر دو تاکہ وہ دمشق والوں کے لیے کچھ نہ کر سکیں۔"

خلیفۂ وقت کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابوعبیدہؓ نے عمارہ بن مخش کی زیرِ کردگی ایک دستہ فحل کی طرف بھیج دیا۔ دوسرا دستہ ذوالکلاع کو دیا کہ وہ دمشق اور حمص کے درمیان قیام کریں تاکہ حمص سے دمشق کو مدد نہ پہنچ سکے۔

اسی طرح علقمہ بن حکیم اور مسروق کو دمشق اور فلسطین کے درمیان حائل کیا کہ فلسطین کی طرف سے کوئی مسلمانوں کی پشت پر حملہ نہ کر سکے۔

ابوعبیدہؓ نے دمشق کو کمک پہنچانے والے تمام راستوں کو بند کر دیا اور پھر صفر سے روانہ ہو گئے۔ دمشق پہنچ کر انہوں نے قلعہ کا چاروں طرف سے سختی سے محاصرہ کر لیا۔

اس وقت خالدؓ بن ولید کی حیثیت سپریم کمانڈر کے بجائے ابوعبیدہؓ کے ماتحت ایک سپاہی کی سی تھی۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے بعض وجوہات، جن کا ذکر بعد میں آئے گا، کی بنا پر خالدؓ کو معزول کر دیا تھا مگر ابوعبیدہؓ نے جو ایک جہاندیدہ سپہ سالار تھے، خالدؓ کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں دمشق کے پانچ دروازوں میں سے ایک یعنی بابِ شرق پر ایک دستے کے ساتھ متعین کیا اور اس دستے میں وہ لوگ شامل کر دیے جو خالدؓ کے ساتھ عراق سے آئے تھے۔

باقی دروازوں پر:

بابِ فرادیس پر عمروؓ بن العاص
بابِ توما کے سامنے شرجیل بن حسنہ
بابِ فرج پر قیس بن ہبیرہ کو متعین کیا اور خود ابوعبیدہؓ بابِ جابیہ پر اترے۔

اب قلعہ پر حملہ شروع ہوا۔ مسلمان قلعہ پر تیروں کی بارش کرتے اور منجنیقوں سے پتھر برساتے مگر قلعہ والوں کا کوئی خاص نقصان نہ ہوتا۔ پھر اہلِ قلعہ کو حمص اور فلسطین سے مدد آنے کی بھی امید تھی اس لیے وہ بڑی استقامت سے مدافعت کرتے رہے۔

پھر جب ایک ہفتہ تک کوئی کمک نہ پہنچی تو قلعے میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ مسلمانوں نے کمک آنے کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔

قلعہ والوں کو ایک آس یہ بھی تھی کہ جاڑے کا موسم شروع ہونے والا تھا اور ان کا خیال تھا کہ مسلمان وہاں کی سخت سردی برداشت نہ کر سکیں گے اور محاصرہ اٹھا کر چلے جائیں گے۔ مگر انہیں اس پر بھی مایوسی ہوئی۔

سخت جاڑوں کے موسم میں بھی مسلمانوں نے محاصرہ ختم نہ کیا اور ڈٹے رہے۔ آخر تنگ آ کر اہلِ قلعہ نے صلح کی گفتگو شروع کی۔

مسلمانوں کی طرف سے شرطیں ایسی تھیں جنہیں قلعہ والوں نے قبول نہ کیا اور بدستور مقابلے پر جمے رہے۔

خالدؓ بن ولید اگرچہ بے اختیار تھے۔ ان کی حیثیت ایک معمولی دستہ سوار کی تھی مگر انہوں نے اپنی اس حالت میں بھی قلعہ پر قبضہ کرنے کی وہ حکمتِ عملی اختیار کی جس نے سب کو حیران کر دیا۔

خالدؓ بن ولید کی یہ عادت تھی کہ رات کو نہ خود سوتے تھے نہ دوسروں کو سونے دیتے تھے۔ ان کے کان ذرا سی آہٹ پر کھڑک اٹھتے تھے اور آنکھیں کانوں سے بھی تیز تھیں۔

خالدؓ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ دمشق کے بطریق یعنی بڑے پادری کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اور یہ کہ اس نے آج رات دعوتِ عام منعقد کی ہے۔

ظاہر ہے کہ عیسائیوں کی دعوتوں میں شراب و کباب کی اس وقت بھی کثرت ہوتی تھی اور رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔

چنانچہ خالدؓ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس موقعے سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے اور آج رات قلعے کے اندر داخل ہوں گے۔

اس فیصلہ کے بعد انہوں نے دن ہی میں تمام انتظام مکمل کر لیا۔

قلعہ کے گرد ایک گہری اور چوڑی خندق تھی۔ اسے پار کرنے کے لیے انہوں نے مشکیں اکٹھا کیں۔ پھر سیڑھی نما کمندیں جمع کیں اور رات کا انتظار کرنے لگے۔

بابِ شرق جس پر خالدؓ بن ولید کو تعینات کیا گیا تھا، اس طرف کی خندق بہت گہری اور چوڑی تھی لیکن مجاہدوں کے لیے ایسی مشکلات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پس رات ہوتے ہی انہوں نے تلواریں سنبھالیں۔ کمندیں کمر میں کسیں اور مشکوں میں ہوا بھر کے ان کی مدد سے پانی سے لبالب خندق کو ان چیدہ چیدہ آدمیوں نے اپنے سردار خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں پار کر لیا۔

خالدؓ بن ولید کے ساتھیوں میں دو بڑے جیالے مجاہد تھے:

۱۔ قعقاع بن عمرو

۲۔ مذعور بن عدی

خالدؓ بن ولید کے ساتھ جب یہ لوگ خندق پار کر کے فصیل کے قریب پہنچے تو خالدؓ نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ جب فصیل سے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند ہو تو کچھ آدمی فصیل پر چڑھ جائیں اور باقی تیزی سے بابِ شرق پہنچ جائیں۔

سب سے پہلے قعقاع بن عمرو اور مذعور بن عدی نے قلعہ کی برجیوں پر کمندیں پھینکیں۔ کمندیں برجیوں کے کنگوروں میں اٹک گئیں۔ ان کمندوں میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ذریعے یہ دونوں فصیل پر پہنچ گئے۔ ان کے بعد خالدؓ اور ان کے ساتھی اوپر پہنچے۔

فصیل کے تمام پہریدار شراب کے نشے میں دُھت پڑے تھے۔ خالدؓ نے کچھ آدمیوں کو فصیل پر چھوڑ کر انہیں حکم دیا کہ جب وہ فصیل کی دوسری طرف نیچے اتر کے وہاں موجود لوگوں پر حملہ کر دیں تو قلعہ کی فصیل پر کھڑے ہوئے لوگ فوراً نعرۂ تکبیر بلند کرنا شروع کر دیں۔

یہ قول صادق ہے کہ جب تک انسان خود اپنی مدد آپ نہیں کرتا اس وقت تک خدا بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔ دوسرے معنوں میں، جو شخص خلوصِ دل سے کوشش کرتا ہے خدا اسے ضرور کامیاب کرتا ہے۔

خالدؓ بن ولید اپنے عہدے سے معزول کیے جانے کے باوجود لشکرِ اسلام اور اپنے اللہ سے پُرخلوص تھے چنانچہ اس وقت میں خدا نے ان کی مدد فرمائی۔

خالدؓ فصیل سے اپنے ساتھیوں کو لے کے تلواریں سونتتے ہوئے نیچے اترے اور بابِ شرق کے محافظوں پر اللہ اکبر کا نعرہ مار کر حملہ کر دیا۔

ان کے نعرے کی آواز سنتے ہی فصیل پر موجود لوگوں نے بھی تکبیریں بلند کیں اور نیچے کھڑے ہوئے لوگ بابِ شرق کی طرف دوڑ پڑے۔

ادھر خالدؓ بن ولید نعرے لگاتے اور پہریداروں کو قتل کرتے ہوئے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔ اور دروازے کا قفل توڑ کے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی باہر کھڑے ہوئے تمام مسلمان قلعہ کے

اندر داخل ہو گئے۔

پورا قلعہ شراب کے نشے میں دُھت پڑا ہوا تھا۔ شور و غل بلند ہوا تو وہ لوگ گھبرا کے اٹھے مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور مسلمانوں کے نعرے قلعہ کے اندر کیسے بلند ہو رہے ہیں؟

جب ان کو معلوم ہوا کہ خالدؓ بن ولید بابِ شرق سے قلعہ میں داخل ہو گئے ہیں تو وہ دوسرے دروازوں کی طرف بھاگے جن کے باہر مسلمان مورچے لگائے بیٹھے تھے۔

پھر ان میں مشورہ یہ ہوا کہ خالدؓ بن ولید کو نظر انداز کر کے مسلمانوں سے ان کی شرائط پر صلح کر لی جائے۔ چنانچہ اسی وقت سپہ سالار ابو عبیدہؓ کی طرف قاصد دوڑایا گیا اور فوراً صلح کر کے باقی دروازے بھی کھول دیے گئے۔

اب صورتِ حال یہ ہوئی کہ خالدؓ بن ولید تو بابِ شرق سے فاتحانہ قلعے میں داخل ہو کر مارتے کاٹتے آگے بڑھ رہے ہیں اور باقی دروازوں سے سردارانِ لشکر صلح کر کے قلعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور قلعہ والے ان سے گڑگڑا کر کہہ رہے تھے:

"ہمیں خالدؓ بن ولید سے بچاؤ۔ وہ ہمیں قتل کرنے آ رہے ہیں۔"

اس طرح خالدؓ بن ولید اور دوسرے سردارانِ لشکرِ اسلام قلعہ کے درمیان میں آ کے ملے۔ خالدؓ نے بتایا کہ وہ فاتحانہ داخل ہوئے ہیں مگر ابو عبیدہؓ نے کہا:

"ہم نے قلعہ والوں سے صلح کر لی ہے اس لیے قلعہ کے تمام لوگ صلح کے تحت سمجھے جائیں۔"

صلح کی شرائط یہ طے ہوئیں:

قلعہ والے سونے چاندی اور جائداد کا پانچواں حصہ مسلمانوں کو ادا کریں۔

فی کس ایک دینار سالانہ ادا کریں۔

فی جریب زمین ایک جریب گیہوں سالانہ ادا کریں۔

شاہی خاندان اور اس کے متعلقین کا مملوکہ سامان اور زمین مالِ غنیمت میں داخل ہوں گی۔

اس تفصیل سے یہ بات ظاہر کرنا مقصود تھی کہ دمشق کی فتح کا سہرا صرف اور صرف خالدؓ بن ولید کے سر ہے۔ اگر وہ بابِ شرق سے قلعہ میں داخل نہ ہوتے تو اہلِ قلعہ ابو عبیدہؓ سے ہرگز صلح نہ کرتے۔ پھر معلوم نہیں کہ قلعہ کا محاصرہ کب تک جاری رہتا اور اس کا انجام کس کے حق میں ہوتا۔





دمشق کی فتح کے بعد ابو عبیدہؓ نے یزید بن ابو سفیان کو وہاں اپنا نائب مقرر کیا اور دربارِ خلافت کے حکم کے مطابق فحل کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں رومیوں کا شکست خوردہ لشکر پناہ گزیں تھا۔

فحل کے علاوہ حمص میں جاسوسوں کے اندازے کے مطابق رومیوں کا تقریباً اسی ہزار کا ایک لشکر مقیم تھا۔ اس لیے یہی بہتر خیال کیا گیا کہ حمص پر حملہ سے پہلے فحل پر قبضہ کیا جائے۔

رومیوں کو فحل سے بہت زیادہ امید تھی اور اس کی فتح یوں بھی ضروری تھی کہ اگر مسلمان حمص پر حملہ کرتے تو فحل ان کی پشت پر آ جاتا اور اس سے کسی وقت بھی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

فحل پر حملہ کرنے والے لشکر کے سپہ سالار شرجیل بن حسنہ تھے کیونکہ فحل کا علاقہ ان کے حدود میں تھا جس پر خلیفۂ اول حضرت ابو بکرؓ نے شرجیل کو امیر بنا کر بھیجا تھا۔

شرجیل بن حسنہ بھی جانتے تھے کہ دمشق کی فتح کا سہرا اصل خالدؓ بن ولید ہی کے سر ہے اسلیے وہ بھی خالدؓ کی بہت عزت و تکریم کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس مہم میں انہوں نے حضرت خالدؓ کو ہراول (مقدمۃ الجیش) دستوں کا سردار بنا کر آگے روانہ کیا۔ میمنہ پر ابو عبیدہؓ تھے اور میسرہ پر عمرو بن عاص کو لگایا گیا۔

فحل والوں کو جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لشکر میں خالدؓ بن ولید بھی ہیں تو ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

انہوں نے گھبرا کے ایک ہی تدبیر سوچی اور تمام ندیوں کے بند توڑ دیے جس سے فحل کے اردگرد کی تمام زمین زیرِ آب آ گئی۔

خالدؓ بن ولید کے دستے چونکہ آگے تھے۔ انہوں نے پیچھے اطلاع دی کہ رومیوں نے ندیوں کے بند توڑ دیے ہیں۔

اسلامی لشکر جب وہاں پہنچا تو قلعہ فحل کے اردگرد دور دور تک زمین دلدلی ہو گئی تھی اور مسلمان لشکر اسے پار کرنے سے معذور تھا۔

مسلمانوں نے دلدل میں پھنسنے کے بجائے دلدل سے پہلے ہی اپنی خیمہ گاہ بنائی اور وہیں مقیم ہو گئے۔ اسی طرح رومیوں کا یہ خیال باطل ہو گیا کہ مسلمان دلدل میں پھنس کر مر جائیں گے یا پھر

واپس چلے جائیں گے۔ اب جو مسلمان وہاں ڈیرے ڈال کے بیٹھ گئے تو رومی حد سے زیادہ پریشان ہو گئے۔

فحل پر حملہ کرنے والے لشکر کی ترتیب اس طرح تھی:

۱۔ سپہ سالار — شرجیلؓ بن حسنہ
۲۔ ہراول پر — خالدؓ بن ولید
۳۔ میمنہ پر — ابو عبیدہؓ
۴۔ میسرہ پر — عمروؓ بن عاص
۵۔ سوار فوج پر — ضرارؓ بن الازور
۶۔ پیدل فوج پر — عیاض بن غنم

مسلمان لشکر کو وہاں اس طرح بیکار پڑے دو ہفتے گزر گئے۔ سپہ سالار شرجیلؓ بن حسنہ اس صورتِ حال سے بہت فکر مند تھے۔

چونکہ جنگ نہیں ہو رہی تھی اس لیے شرجیل نے خالدؓ بن ولید کو لشکر کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ تاکہ دشمن شب خون نہ مار سکے اور اچانک حملے کا بھی تدارک ہو جائے۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خالدؓ بن ولید رات کو نہ خود سوتے تھے اور نہ اپنے دستوں کو سونے دیتے تھے۔ اب تو ان کا کام ہی دن رات چوکس رہنا تھا۔ انہوں نے اپنے دستوں کو لشکر کی پہرہ چوکی پر لگا دیا۔

خالدؓ خود ساری رات گھوڑے پر سوار لشکر کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان کی اس چوکسی کی وجہ سے ان کے تمام دستے رات بھر ہوشیار اور خبردار رہتے تھے۔

دوسری طرف رومیوں نے دیکھا کہ مسلمان دلدل کے اس پار بیکار پڑے اپنا وقت خراب کر رہے ہیں مگر واپس نہیں جاتے تو ان کے سرداروں نے باہم مشورہ سے طے کیا کہ مسلمانوں پر بے خبری کے عالم میں زبردست حملہ کیا جائے۔

چنانچہ انہوں نے ایک مقررہ دن صبح صادق سے پہلے اپنی نصف فوج یعنی ۴۰ ہزار کے لشکر سے مسلمانوں پر حملے کا فیصلہ کر لیا۔

ان کا خیال تھا کہ مسلمان صبح کو غافل ہوں گے اس لیے انہیں حملہ کر کے آسانی سے ختم کیا جا سکے گا مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ خالدؓ بن ولید کی آنکھیں ایک تو رات دن میں کسی وقت بند ہی نہ ہوتی تھیں اور اگر وہ دن میں کبھی گھڑی دو گھڑی کو لیٹ بھی جاتے تو سوتے میں بھی بیدار رہتے تھے۔

خالدؓ کو رومیوں سے ہر دم خطرہ تھا اس لیے انہوں نے فحل کے قلعہ سے دور دور پر پانچ پانچ تیز رفتار سواروں کا پہرہ لگا رکھا تھا۔

ان سواروں کو تاکید تھی کہ وہ قلعہ کے دروازوں سے ایک لمحے کے لیے بھی نظریں نہ ہٹائیں اور جس وقت کسی دروازے سے یہ ذرا بھی فوجی حرکت دیکھیں تو فوراً اطلاع دیں۔

چنانچہ اس دن صبح کے دھندلکے میں جیسے ہی ایک دروازے سے رومی لشکر دبے پاؤں باہر نکلنا شروع ہوا، اس کے چند ہی لمحوں بعد ایک تیز رفتار قاصد نے خالدؓ تک یہ خبر پہنچا دی۔

خالدؓ بن ولید نے نہ صرف اپنے سواروں کو تیار رہنے کا حکم دیا بلکہ انہوں نے فوراً سپہ سالار شرجیلؓ بن حسنہ کو اطلاع دے دی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا لشکر بیدار ہو کر جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔

شرجیلؓ بن حسنہ نے خالدؓ کے مشورے پر اپنے لشکر کو خیمہ گاہ سے نکال کر پوشیدہ جگہوں پر پہنچا دیا اور حکم دیا کہ رومیوں پر اس وقت تک حملہ نہ کیا جائے جب تک وہ خیمہ گاہ تک پہنچ نہ جائیں۔

مزید احتیاط کے لیے شرجیلؓ نے کچھ آدمیوں کو کھلے میدان میں اس طرح لٹا دیا جنہیں دیکھ کر دور سے لگتا تھا کہ لشکر خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔

رومیوں نے اپنے خیال میں مسلمانوں کی خیمہ گاہ کو گھیر لیا تھا مگر ابھی وہ حملہ شروع نہ کر پائے تھے کہ کمین گاہوں میں چھپے ہوئے مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے نکل پڑے۔

رومیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے چاروں طرف سے زمین نے مسلمان اگلنا شروع کر دیے ہیں۔ اسی بدحواسی کے عالم میں مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں مارنا کاٹنا شروع کر دیا۔

رومی حملہ آور گھیرے میں تو آ گئے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ انہوں نے جم کر لڑنا شروع کر دیا۔

اس حملہ اور جنگ کی خبر قلعہ فحل تک پہنچ گئی اور وہاں کا نصف محفوظ لشکر بھی اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے آن پہنچا۔

مسلمان ان پر چاروں طرف سے حملے کر رہے تھے اور انہیں مولی گاجر کی طرح کاٹ رہے تھے لیکن وہ سو کو مارتے تو فوراً دو ہزار سامنے آ کھڑے ہوتے تھے۔

میدان میں چاروں طرف روشنی پھیل گئی تھی اور جنگ میں شدت آ گئی تھی۔ رومیوں کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی مگر مسلمان میدان کے شیر تھے۔ انہوں نے رومیوں کو تلوار پہ رکھ لیا اور ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔

صبح سے دوپہر ہوئی۔

دوپہر سے شام ہو گئی۔

مگر ۔۔۔ جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

رومی کٹ کٹ کر گر رہے تھے مگر میدان سے بھاگتے نہ تھے۔ رات ہو گئی مگر رات میں بھی تلواریں چلتی رہیں اور جنگ جاری رہی۔

مسلمان چونکہ قلعہ کے باہر تھے اس لیے انہیں دلدلی زمین کا اندازہ تھا۔ جبکہ رومیوں نے بند توڑ کر دلدل پیدا کی تھی مگر انہیں یہ پتہ نہ تھا کہ دلدلی زمین کہاں کہاں تک موجود تھی۔ چنانچہ رات کے اندھیرے میں مسلمانوں نے رومیوں کو دلدل کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔

رومی لڑتے لڑتے تھک گئے اور میدان سے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ مسلمانوں نے انہیں ذرا سا راستہ دیا تو وہ بے تحاشہ ادھر بھاگ پڑے۔ انہیں یہ پتہ نہ تھا کہ وہ موت کے دہانے کی طرف جا رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد رومی لشکر دلدل میں پھنس گیا اور اس بُری طرح تباہ ہُوا کہ جب دوسرے دن کی روشنی ہوئی تو سوائے چند آدمیوں کے اسی ہزار کے لشکر میں سے سب کے سب دلدل یا مسلمانوں کی تلواروں کے حوالے ہو چکے تھے۔

اس طرح فحل کی فتح میں خالدؓ بن ولید نے نمایاں کردار ادا کیا۔

اگر خالدؓ بن ولید اپنی ذمے داریوں کو جی جان سے نہ نبھاتے اور اپنی جدت پسند طبع کے تحت قلعہ فحل کے اردگرد پانچ پانچ سواروں کے چھوٹے چھوٹے دستے اس غرض سے پہرے پہ نہ لگاتے کہ جونہی فحل کے دروازوں پر کسی بھی قسم کی فوجی نقل و حرکت پیدا ہو، انہیں فوراً خبر کی جائے تو شاید لشکرِ اسلام کو رومیوں کے اچانک حملے کی خبر ہی نہ ہو پاتی اور ان کا جو حشر ہوتا وہ سب پہ عیاں ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ خالدؓ بن ولید کو رات دن چوکسی کی جو عادت تھی، یہی عادت انہوں نے اپنے دستے کے افراد میں بھی پختہ کر رکھی تھی اور اسی عادت کے باعث وہ لوگ رومیوں کے لشکر کو فحل کے قلعہ سے باہر آتا دیکھ سکے تھے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ فحل کی فتح میں بھی خالدؓ بن ولید کی جاں نثاری، فرض کی ادائیگی سے عشق اور خلوصِ دین کو سب سے زیادہ دخل تھا۔

فحل پر قبضہ کے بعد جناب ابوعبیدہؓ، خالدؓ بن ولید کو لے کر حمص کی طرف روانہ ہوئے!





قیصر ہرقل کو جب معلوم ہوا کہ دمشق اور فحل میں رومی لشکروں کو شکست ہوئی ہے تو اس نے فوراً ایک بڑا لشکر توذر نامی پادری کی سرکردگی میں دمشق کی طرف روانہ کیا مگر اسے صرف اس لشکر سے اطمینان نہ ہوا۔ اس لیے اس نے توذر کے پیچھے ہی شنس نامی ایک سردار کے ساتھ اتنا ہی بڑا ایک اور لشکر روانہ کر دیا۔

رومیوں کے ان دونوں لشکروں کا سامنا مسلمان لشکر سے مروج الروم کے مقام پر ہوا۔ یہ جگہ دمشق کے مغرب میں واقع ہے۔

رومیوں کے دونوں لشکر الگ الگ مسلمانوں کے سامنے خیمہ زن ہوئے۔ سپہ سالار ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو لشکر دے کر حکم دیا کہ وہ صبح کو توذر کے لشکر سے جنگ کریں جبکہ وہ خود نصف لشکر کے ساتھ شنس کا مقابلہ کریں گے۔

رات بھر دونوں لشکر جاگتے رہے مگر کوئی واقعہ نہ ہوا تاہم صبح کو جب خالدؓ بن ولید نے اپنے مدِمقابل توذر کے لشکر کی طرف نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ وہ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کسی طرف نکل گیا ہے۔

دوسرا لشکر جس سے جناب ابوعبیدہؓ کو مقابلہ کرنا تھا بدستور میدان میں جما ہوا تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے کہا:

"محترم ابوعبیدہؓ! میرا خیال ہے توذر لشکر لے کر دمشق کی طرف گیا ہے۔ آپ کا اس بارے میں

کیا اندازہ ہے؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے خالدؓ۔"

ابوعبیدہؓ نے ان کی تائید کی:

"دمشق بہت غیر محفوظ ہے۔ میں نے یزید بن ابوسفیان کے پاس صرف چند محافظ دستے ہی چھوڑے ہیں۔"

خالدؓ بن ولید نے کہا:

"مجھے اجازت ہو تو میں اس کے پیچھے جاؤں؟"

جناب ابوعبیدہؓ نے ان کو اجازت دے دی اور خالدؓ اپنے تیز رفتار دستوں کے ساتھ توذر کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

توذر نہ معلوم کس راستے سے دمشق گیا کہ خالدؓ انتہائی تیز رفتاری کے باوجود اسے دمشق کے راستے میں نہ پا سکے اور جس وقت وہ دمشق پہنچے تو توذر نے دمشق پر حملہ کر دیا تھا اور یزید بن ابوسفیانؓ اپنے چند دستوں کے ساتھ اس کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے۔

خالدؓ بن ولید نے جاتے ہی توذر پر پشت سے حملہ کر دیا۔ اب اس پر دو طرفہ مار پڑنا شروع ہو گئی۔ آگے سے یزید بن ابوسفیان کے نیزے اس کا سینہ چھلنی کر رہے تھے اور پیچھے سے خالدؓ کی فوج اس کی پشت میں تلواریں اتار رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے مقابلے کے بعد توذر کا لشکر بھاگ نکلا مگر اسے فرار کا راستہ نہ ملا اور تمام کا تمام لشکر قتل ہو گیا۔ صرف چند ہی آدمی جان بچا کر بھاگ سکے۔ خود توذر بھی میدان جنگ میں مارا گیا۔

یزید بن ابوسفیان اور خالدؓ بن ولید نے نصف نصف مالِ غنیمت تقسیم کیا۔ پھر خالدؓ اپنی فوج کے ساتھ واپس ابوعبیدہؓ کے پاس پہنچ گئے۔

جب ہرقل کو اپنے دونوں لشکروں کی تباہی کا حال معلوم ہوا تو وہ حمص سے بھاگ گیا اور چلتے وقت اپنے عامل سے کہہ گیا کہ:

"جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے شدید سردی کے موسم میں جنگ کرنے کی کوشش کرنا وہ گرم خطے کے لوگ ہیں۔ سردی کی شدت برداشت نہ کر سکیں گے اس لیے ہو سکتا ہے گھبرا کر واپس چلے جائیں۔"

ابو عبیدہؓ بعلبک کے راستے حمص روانہ ہوئے۔ انہوں نے سمط بن اسود کندی کو ہراول دستے کا سردار بنا کر آگے روانہ کیا اور خالدؓ کو بقاع کی طرف بھیجا۔

جنابِ خالدؓ اپنے دستوں کے ساتھ بقاع پہنچے اور پہلے ہی حملے میں اہلِ بقاع نے ہتھیار ڈال دیے۔

وہاں کا انتظام درست کرنے کے بعد خالدؓ ابو عبیدہؓ کے پاس حمص پہنچے اور ان کے لشکر میں پھر شامل ہو گئے۔

مسلمانوں نے حمص کا بڑا سخت محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہ کڑاکے کی سردی پڑنے لگی مگر مسلمانوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور ڈٹے رہے۔

حمص والوں کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ انہوں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی جسے مسلمانوں نے قبول کر لیا اور حمص پر بھی اسلامی پرچم لہرا دیا گیا۔

حمص شام کا بہت پرانا اور مشہور شہر ہے۔ اس کے گرد بڑی مضبوط فصیل بنی ہوئی ہے۔ یہ شہر اور دمشق کے درمیان میں برابر فاصلہ پر واقع ہے۔ حمص ہی میں جنابِ خالدؓ بن ولید نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔

حمص کے بعد جناب ابو عبیدہؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو قنسرین کی فتح پر مامور کیا۔ حضرت خالدؓ ادھر روانہ ہوئے۔

راستے میں حاضر کے مقام پر خالدؓ بن ولید کی رومیوں کے ایک لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی جس کا سردار میناس تھا۔

کہا جاتا ہے کہ قیصر ہرقل کے بعد رومیوں میں یہ شخص سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ خالدؓ سے اس کی شدید جنگ ہوئی۔ میناس اور اس کا آدھا لشکر میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

میناس کے مارے جانے کے بعد حاضر والوں کا ایک وفد جناب خالدؓ کے خیمے پر آیا اور اس نے ان کو بتایا:

"اے مسلم سردار خالدؓ بن ولید! ہم آپ سے قطعی نہیں لڑنا چاہتے تھے۔ ہمیں میناس نے آپ کے

ساتھ جنگ کرنے پر مجبور کیا تھا اس لیے آپ ہماری جان بخشی کر دیجیے۔"

خالدؓ بن ولید نے ان کی درخواست قبول کر لی اور انہیں چھوڑ کے آگے بڑھ گئے۔ اب وہ قنسرین جا رہے تھے۔

قنسرین ملک شام کا ایک صوبہ ہے اور اس صوبے میں اسی نام کا ایک شہر ہے۔ حلب سے یہ ایک دن کے فاصلے پر ہے۔

قنسرین والوں کو خالدؓ بن ولید کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ قلعہ بند ہو کے بیٹھ گئے تھے۔

خالدؓ بن ولید نے اہلِ قلعہ کو پیغام بھیجا کہ:

"تمہارے قلعہ بند ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم لوگ آسمان پر بھی پہنچ جاؤ تو یا خدا ہمیں وہاں پہنچا دے گا یا پھر تمہیں ہمارے پاس بھیج دے گا۔"

خالدؓ کے اس انوکھے پیغام نے قلعہ والوں کو بدحواس کر دیا اور انہوں نے گھبرا کر صلح کی درخواست کر دی۔

خالدؓ بن ولید نے صلح کے لیے یہ شرط رکھی کہ قلعہ کی فصیل منہدم کر دی جائے۔ قلعہ والوں نے جان کے خوف سے یہ شرط ماننا قبول کر لیا۔

صلح ہو گئی۔

خالدؓ نے فصیل منہدم کرا دی۔

ہرقل، حمص چھوڑ کے الرہا (اڈیسہ) بھاگ گیا تھا۔ الرہا ہی میں اسے حاضر کے میدان میں رومی لشکر کی تباہی اور قنسرین کے قلعہ کی فصیل کو منہدم کیے جانے کی خبریں ملیں۔ اس کی آخری امید بھی ختم ہو گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اب شام میں اس کی بادشاہت قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ وہ انتہائی حسرت و یاس کے عالم میں یہ کہتا ہوا ملک شام سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا:

"اے شام!

رخصت ہونے والا اسلام قبول کر۔

یہ ایسی جدائی ہے جس کے بعد ملاقات ممکن نہیں!"

قنسرین کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ مرعش کی جانب روانہ ہوئے۔ مرعش کی فتح میں بھی انہیں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ مرعش کی فتح پر انہوں نے وہاں کے باشندوں کو شہر بدر کر دیا اور شہر کو منہدم کرا دیا۔

مرعش کا شہر شام کی سرحد پہ واقع ہے۔ مرعش کے بعد خالدؓ بن ولید نے حدث کا مضبوط قلعہ بھی فتح کر ڈالا۔

حضرت عمرؓ نے خالدؓ بن ولید کو معزول کر کے درست کیا یا نہیں، اس سے قطع نظر یہ بات بہرصورت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ خالدؓ بن ولید جیسا جرنیل دنیا آج تک پیدا نہ کر سکی اور نہ ہی آیندہ پیدا کر سکے گی۔

حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ دنیا کے وہ واحد سپہ سالار ہیں جنہوں نے کسی جنگ میں شکست نہیں کھائی۔ وہ جس جنگ میں شریک ہوئے فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے۔ ان کی ذہانت اور شجاعت کے اپنے اور غیر سب معترف ہیں۔

یورپ کے بعض مؤرخین خالدؓ بن ولید کے کارناموں کو دھندلانے کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جس دور میں خالدؓ نے فتوحات حاصل کیں اس وقت رومی ریاستیں اور صوبے اپنی خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ اس وجہ سے خالدؓ کو ہر مقام پہ کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ ایک بھونڈا سا بہانہ ہے۔ تمام بڑی بڑی جنگوں میں خالدؓ بن ولید کا لشکر رومی لشکروں کے ایک چوتھائی سے بھی کم رہا ہے۔ اس کے باوجود خالدؓ نے اپنی جنگی حکمتِ عملی سے رومیوں پر ہمیشہ کامیابی حاصل کی۔

حضرت خالدؓ بن ولید کا یہ ناول یا تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک خلیفہ دوم جنابِ عمرؓ اور جنابِ خالدؓ کے درمیان اختلاف کو بیان نہ کیا جائے اس لیے کہ سیف اللہ خالدؓ بن ولید ہمارے ناول کے ہیرو ہیں اور ان کی زندگی کے ہر پہلو پہ روشنی ڈالنا ہمارا فرض ہے۔

میں اس جگہ بڑے ادب سے یہ عرض کر دوں کہ میں، خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا ایک سنی العقیدہ، مسلمان ہونے کے ناطے بالکل اسی طرح احترام کرتا ہوں جس طرح آپ انہیں قابلِ احترام سمجھتے ہیں

مگر اس عزت و احترام کے باوجود میں اس قول کو بھی سچا سمجھتا ہوں کہ:

"ہمارے دین میں بھی جمہوریت موجود ہے۔"

اور شاید یہ اسی کا اثر تھا کہ ایک مرتبہ جب حضرت عمرؓ خطبہ کے لیے منبر پہ کھڑے ہوئے تو ایک عام مسلمان نے آپ کا دامن پکڑ کر سوال کیا تھا:

"اے عمرؓ! مالِ غنیمت کی تقسیم میں ہر مسلمان کے حصے میں اتنا کم کپڑا آیا تھا کہ اس سے کسی جوان آدمی کا کرتہ بمشکل تیار ہو سکتا تھا مگر آپ کے حصے میں اتنا کپڑا کیسے آیا کہ جس سے آپ نے اتنا ڈھیلا ڈھالا کرتہ تیار کرا لیا؟"

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:

"بے شک میرے حصے میں بھی اتنا ہی کپڑا آیا تھا جتنا تمہیں ملا تھا لیکن میرے بیٹے نے اپنے حصہ کا کپڑا بھی مجھے دیدیا تھا اور یہ کرتہ ہم دونوں کے حصوں کے کپڑے سے تیار ہوا ہے۔"

یہ دین میں جمہوریت اور آزادیٔ رائے کی بہترین مثال ہے۔

اسی آزادیٔ رائے کے پیشِ نظر میں اسلام کی ان دو جلیل القدر ہستیوں کے اختلاف کا کچھ ذکر کروں گا مگر یہ ذکر میرے ذاتی خیالات پر نہیں بلکہ خالص تاریخ دانوں کے بیانات پر مبنی ہے۔

ابنِ عساکر اور برہان الدین کہتے ہیں:

"اس ناراضگی کا اصل سبب یہ تھا کہ بچپن میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید میں لڑائی ہو گئی جس میں حضرت خالدؓ نے حضرت عمرؓ کی پنڈلی توڑ دی تھی۔

اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کے دل میں حضرت خالدؓ کی طرف سے جو غصہ پیدا ہوا وہ آخر وقت تک نہیں گیا اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ خالدؓ کو معزول کر دیا۔"

اس تاریخی فیصلہ کے جواب میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان کی بنیاد مندرجہ ذیل چار باتوں پر رکھی گئی ہے:

۱۔ حضرت خالدؓ کا مالک بن نویرہ کو قتل کرنا اور اس کی بیوہ سے شادی کرنا۔
اس واقعہ کے پیش آنے پہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے مطالبہ کیا تھا کہ خالدؓ کو قید کیا جائے اور انہیں معزول کیا جائے مگر حضرت ابوبکرؓ نے

اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں مالک بن نویرہ کا قتل ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا۔ اس لیے اس کا خون بہا حضرت ابوبکرؓ نے بیت المال سے ادا کر دیا تھا۔ اس لیے یہ بات اسی جگہ ختم ہو گئی تھی۔

اسی طرح اس کی بیوہ سے شادی کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کے بے غصے کا اظہار کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ وہ اسے طلاق دیدیں۔ چنانچہ جناب خالدؓ نے اسے جنگ یمامہ کے بعد طلاق دیدی تھی۔ اس طرح حضرت عمرؓ کی ناراضگی کی یہ وجہ بھی دہیں ختم ہو گئی تھی۔

بنو جزیمہ کے قتل کے سلسلے میں بھی حضرت ابوبکرؓ نے جناب خالدؓ کو معاف کر کے خون بہا بیت المال سے ادا کر دیا تھا۔ اس سے بھی خالدؓ پر قتل کا الزام ثابت نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ حضرت خالدؓ بن ولید بعض اوقات حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے خلاف کوئی کام کر لیا کرتے تھے حضرت عمرؓ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اختلاف کی اس وجہ پر تو اس وقت غور ہو سکتا تھا جب حضرت خالدؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے کے خلاف کوئی کام کیا ہوتا حضرت عمرؓ نے تو خالدؓ بن ولید کو بحیثیت ایک جرنیل کام کرنے کا ایک لمحہ بھی موقع نہیں دیا بلکہ جنگ یرموک کے دوران یہ معلوم کیے بغیر کہ اس وقت ان کا رومیوں سے مقابلہ ہو رہا تھا اور خالدؓ بن ولید اسلامی پانچوں فوجوں کے سپریم کمانڈر تھے، ان کو معزول کر دیا۔ ایسی صورت میں اگر خالدؓ کسی نادانی کا ثبوت دیتے ہوئے خدانخواستہ لشکر اسلام سے الگ ہو جاتے تو جنگ یرموک کا نتیجہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

۳۔ اختلاف کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت خالدؓ حضرت ابوبکرؓ کو جزیہ، لگان اور دیگر محصولات کا جو لوگوں سے وصول ہوتے تھے، کوئی حساب نہ بھیجتے تھے۔

یہ وجہ بھی نمبر ۲ کی طرح بے بنیاد ہے۔ اس کا جواب بھی تاریخوں ہی میں موجود ہے۔

حضرت عمرؓ نے خالدؓ بن ولید کو موقعہ ہی کب دیا تھا کہ وہ اپنی دیانتداری ثابت کرتے۔ انہوں نے اپنا پہلا فرمان ہی خالدؓ بن ولید کی معزولی کا جاری کیا تھا۔

۴۔ عوام کا حضرت خالدؓ پر بھروسہ کرنا بھی ان کی معزولی کا سبب بنا۔

یہ سبب بھی عقل سے بالاتر ہے۔ اس لیے کہ عوام یا لشکر کا کسی ایک کمانڈر پر اعتماد اور بھروسہ تو اس کی کمالِ اہلیت کی نشانی ہے۔ یہ کہنا کہ "فتح و نصرت صرف امدادِ خداوندی پر مبنی ہے، خالدؓ کی شجاعت اور بہادری پر نہیں"

اس بات میں بھی کوئی صداقت نہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ اپنی نصرت لشکرِ اسلام اور اس کے مجاہدین کی ذہانت اور شجاعت ہی کے ذریعہ نازل فرماتا ہے۔ حضرت خالدؓ نے کبھی نہیں کہا کہ وہ فتح اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ جنگ سے پہلے "نصرتِ خداوندی" کے لیے دعا کرتے تھے۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے یہ سب تاریخی واقعات اور ٹھوس شہادتیں ہیں۔ ان شہادتوں کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

۱۔ ابنِ اثیر کہتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کا قاصد جنگ یرموک کے دوران حضرت ابوبکرؓ کی وفات اور خالدؓ بن ولید کی معزولی اور ابوعبیدہؓ کی امارت کی خبر لایا تھا۔

۲۔ یعقوبی نے لکھا ہے:

"حضرت عمرؓ نے اپنے غلام یرفا کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کی خبر اور شداد بن اوس کے ہاتھ خالدؓ بن ولید کی جگہ ابوعبیدہؓ کو شام کا امیر اور سپہ سالار بنانے کا حکم بھیجا تھا۔

۳۔ معجم البلدان میں جہاں جنگ یرموک کا ذکر ہے، وہاں لکھا ہے:

"اس روز قاصد حضرت ابوبکرؓ کی وفات، حضرت عمرؓ کی خلافت کی خبر، تمام شام کے لیے ابوعبیدہؓ کی امارت اور خالدؓ کی معزولی کا حکم لایا۔"

۴۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو کم از کم دو مرتبہ ان کے عہدوں سے معزول کیا۔

پہلی مرتبہ جنگ یرموک کے موقع پر خالدؓ کو اس عراقی لشکر کی قیادت سے معزول کیا جو آپ کے ساتھ عراق سے آیا تھا اور حضرت ابوعبیدہؓ کو ان تمام افواج کا جو مختلف امراء کی سرکردگی میں شام سے عراق میں موجود تھیں، سپہ سالار مقرر کر کے خالدؓ کو ان کے ماتحت کر دیا۔

بعد میں جب قنسرین فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے خالدؓ کو وہاں متعین کیا مگر ابوعبیدہ کے ماتحت۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہاں سے بھی معزول کر دیا گیا۔

یہ واقعہ کچھ اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لائے تو حضرت خالدؓ قنسرین سے ان سے ملنے کے لیے جابیہ پہنچے۔ حضرت عمرؓ کی مدینہ واپسی کے بعد خالدؓ وہاں سے بہت سا سامان لے کر قنسرین لوٹے۔

جب شہر میں شہرت ہوئی کہ خالدؓ بہت سا مال لے کر آئے ہیں تو ایک شاعر اشعث بن قیس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے حضرت خالدؓ کی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر انہیں سنایا۔ آپ نے اسے دس ہزار درہم عطا کیے۔

اس بخشش کی خبر حضرت عمرؓ کو پہنچی تو انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ایک خط لکھا جس میں انہیں حکم دیا کہ خط پہنچنے پر خالدؓ کی ٹوپی ان کے سر سے اتار لیں اور عمامہ ان کے گلے میں ڈال کر دریافت کریں کہ اشعث کو رقم انہوں نے کہاں سے دی ہے۔ اگر مسلمانوں کے مال سے دی ہے تو خیانت کی ہے اور اگر اپنے پاس سے دی ہے تو اسراف کیا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے سزاوار ہیں۔ انہیں معزول کر کے ان کا کام خود سنبھال لو۔

ابوعبیدہؓ نے اور باتوں میں تو خلیفہ دوم کے حکم کی تعمیل کر دی مگر خالدؓ کو یہ نہ بتایا کہ انہیں معزول کر دیا گیا ہے۔ خالدؓ بھی اسی کشمکش میں تھے کہ نہ معلوم انہیں معزول کیا جا چکا ہے یا نہیں؟

حضرت عمرؓ کو فوراً گمان ہوا کہ ابوعبیدہؓ نے خالدؓ کو معزول نہیں کیا۔ اس پر انہوں نے خط بھیج کر خالدؓ کو مدینہ طلب کیا۔

حضرت خالدؓ وہ خط لے کر ابوعبیدہؓ کے پاس گئے۔ اسی وقت انہوں نے خالدؓ کو بتایا کہ ان کے پاس معزولی کا حکم آیا تھا مگر انہوں نے خالدؓ کو رنج نہ پہنچانا چاہا۔ اور انہیں نہیں بتایا۔

خالدؓ وہاں سے رخصت ہو کے قنسرین آئے۔ اپنے رفقاء کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ وہاں سے حمص پہنچے۔ وہاں بھی ایک خطبہ دیا پھر مدینہ کا رخ کیا۔

خالدؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور کہا:

"آپ نے میرے معاملہ میں زیادتی سے کام لیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا:

"تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟"

حضرت خالدؓ نے جواب دیا:

"یہ رقم میں نے مالِ غنیمت کے حصوں سے جمع کی ہے۔"

حضرت خالدؓ نے یہ بھی کہا:

"اگر میرے پاس ساٹھ ہزار درہم سے زیادہ رقم نکلی تو میں وہ فالتو رقم آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

چنانچہ رقم گنوائی گئی۔ اس میں بیس ہزار درہم زائد نکلے۔ حضرت عمرؓ نے وہ رقم بیت المال میں جمع کرا دی۔

مدینہ سے حضرت خالدؓ حمص چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خالدؓ بن ولید کو مدینۃ النبیؐ کے بجائے حمص میں

مستقل سکونت کیوں اختیار کرنا پڑی؟

○

اپنی معزولی کے بعد جناب خالدؓ بن ولید کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا گیا:
تعریف اس خدا کے لیے زیبا ہے جس نے ابوبکرؓ کو وفات دی۔ وہ مجھے عمرؓ سے زیادہ محبوب تھے۔ اور تعریف اسی خدا کے لیے زیبا ہے جس نے عمرؓ کو حاکم بنایا۔ وہ مجھے ابوبکرؓ کے مقابلہ میں ناپسند تھے مگر پھر مجھ سے جبراً ان کی محبت کرائی۔

(خالدؓ سیف اللہ : ابوزید شبلی)

تاریخ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول درج ہے کہ حضرت خالدؓ کے مدینہ تشریف لانے پر حضرت عمرؓ نے برملا فرمایا تھا:

"تم نے بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اور کوئی شخص بھی تمہارے جیسے کارنامے سرانجام نہیں دے سکا لیکن اصل بات یہی ہے کہ تو میں کچھ نہیں کرتیں۔ جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔"

(خالدؓ سیف اللہ: ابوزید شبلی)

حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ نے ۲۱ ہجری میں ملک شام کے شہر حمص میں وفات پائی جہاں آپ مستقلاً آباد ہوگئے تھے۔ حمص میں آپ، آپ کی بیوی اور بیٹے عبدالرحمٰن کی قبریں بھی ہیں۔ خالدؓ کی قبر کے قریب ہی عیاض بن غنم کی قبر بھی ہے[1]۔

حضرت خالدؓ بن ولید کے کئی بیویاں تھیں جن سے کثیر اولاد پیدا ہوئی۔ آپ کے ایک بیٹے سلیمان تھے، انہی کی وجہ سے حضرت خالدؓ کی کینت ابوسلیمان تھی۔ ایک بیٹے عبداللہ تھے جو عراق میں شہید ہوئے۔ دو بیٹے عبدالرحمٰن اور مہاجر تھے، جنہوں نے خاص شہرت حاصل کی۔ یہ دونوں حیاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بہت کمسن تھے۔

۱۔ ابنِ عساکر

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امیر معاویہؓ میں اختلاف ہوا تو عبدالرحمٰن، معاویہؓ سے مل گئے اور مہاجر حضرت علیؓ کے ساتھ ہوگئے۔ مہاجر جنگِ صفین میں شہید ہوئے۔ عبدالرحمٰن بہت بہادر تھے اور بہت نام پایا۔

جب امیر معاویہؓ نے اپنے خطبہ میں لوگوں سے پوچھا:
"مجھے بتاؤ میں اپنے بعد تمہارا حاکم کس شخص کو مقرر کروں؟"
لوگوں نے متفقہ طور پر کہا:
"عبدالرحمٰن بن خالدؓ کو مقرر کر دیجئے"۔

اس جواب پر امیر معاویہؓ کو غصہ آگیا اور انہوں نے عبدالرحمٰن بن خالدؓ کو یہودی طبیب ابنِ اثال کے ذریعے شربت میں زہر پلوا دیا جس سے وہ جاں بحق ہوگئے۔ اس یہودی سے عبدالرحمٰن کے بیٹے خالد نے انتقام لیا اور اسے قتل کر دیا۔

کہتے ہیں کہ طاعون کی وبا میں خالدؓ بن ولید کی باقی اولادوں کا خاتمہ ہوگیا اور ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔

الماس ایم اے
۹۳ء

○